18-35

نظامِ اسلامی

مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

- محمد رضا شبیبی عراق
- عبداللہ کنون مراکش
- ڈاکٹر معروف دوالیبی شام
- امام ابنِ قیمؒ
- شیخ محمد ابو زہرہ مصر
- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پاکستان
- شیخ محمد محمود شلتوت مصر
- ڈاکٹر عبدالغنی حسن مصر
- پروفیسر مصطفےٰ احمد زرقا شام
- ڈاکٹر محمد ناصر انڈونیشیا
- ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی شام

مرتبہ خلیل احمد حامدی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لا

Marfat.com

نظامِ اسلامی

مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

ترجمہ و ترتیب

خلیل احمد حامدی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

Marfat.com

84669

طابع: اخلاق حسین جنرل منیجر
ناشر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکٹ، لاہور
مطبع: نوائے وقت پرنٹرز لمیٹڈ۔ لاہور
بار اوّل: ——— ۲۱۰۰ ——— ستمبر ۱۹۶۳ء
قیمت: ——— ۶/۵۰ روپے

Marfat.com

لکھنے والے

محمد رضا شبیبی	عراق
عبداللہ کنون	مراکش
محمد عبدالرحیم غنیمہ	مراکش
شیخ محمد الخضری بک	مصر
ڈاکٹر معروف دوالیبی	شام
امام ابنِ قیمؒ	
شیخ محمد ابوزہرہ	مصر
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	پاکستان
پروفیسر لبیب السعید	مصر
شیخ محمد محمود شلتوت	مصر
ڈاکٹر عبدالغنی حسن	مصر
پروفیسر مصطفیٰ احمد زرقا	شام
ڈاکٹر محمد ناصر	انڈونیشیا
ڈاکٹر محمد محمد حسین	مصر
پروفیسر احمد راتب النفاخ	شام
عبدالوہاب حمودہ	مصر
ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی	شام

Marfat.com

Marfat.com

اِنتساب

دنیا کی اُن تمام اسلامی تحریکوں کے نام

جو

اِسلام کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے لیے

کوشاں ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

دار العلوم
تعلیم المسلمین
فتح گڑھ

فہرست مضامین

پیشِ لفظ — از مرتب
عرضِ ناشر

نشیدِ آغاز : ۱

• مدحِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ۵
محمد رضا شیبی، سابق وزیر تعلیم، عراق

• عصرِ حاضر میں اسلام کی زبوں حالی ۱۱
عبداللہ کنون، سابق وزیر قانون، مراکش

باب اول : فقہ و قانون ۳۳

• فقہ اسلامی کے ابتدائی ادوار ۳۷
محمد عبدالرحیم غنیمہ، مراکش

• اصولِ فقہ کی تاریخ ۶۹
شیخ محمد الخضری بک، سابق ڈائرکٹر تعلیمات، مصر

Marfat.com

- ملتِ اسلامیہ کا فقہی سرمایہ ۹۳
  ڈاکٹر معروف دوالیبی، سابق وزیر اعظم جمہوریہ، شام
- شریعت میں ضرورت و مصلحت کا لحاظ ۱۱۳
  امام ابن قیم رحمہ اللہ، تلمیذ جلیل امام ابن تیمیہؒ
- مصلحت کے پردے میں الحاد ۱۳۹
  شیخ محمد ابوزہرہ، پروفیسر قانون اسلامی قاہرہ یونیورسٹی، مصر

باب دوم : ریاست و حکومت ۱۶۱

- اسلام میں بنیادی انسانی حقوق ۱۶۵
  مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی، پاکستان
- اسلامی حکومت میں ملازموں کے حقوق و فرائض ۱۹۵
  پروفیسر لبیب السعید، مصر
- اسلام کا بلدیاتی نظام ۲۲۷
  پروفیسر لبیب السعید، مصر
- اسلام کے اصولِ معاہدات ۲۵۳
  شیخ محمد محمود شلتوت، ریکٹر ازہر یونیورسٹی، مصر
- اسلام کا بین الاقوامی قانون ۲۷۱
  ڈاکٹر عبدالغنی حسن، رکن ادارہ ماہنامہ "المجلہ"، مصر

Marfat.com

- اسلام کا نظامِ تعزیر ۲۹۵
  پروفیسر مصطفیٰ احمد زرقا، سابق وزیر قانون، شام
- دین یا لادینیت ۳۱۷
  ڈاکٹر محمد ناصر، سابق وزیر اعظم، انڈونیشیا
- اسلام اور تھیاکریسی ۳۸۵
  ڈاکٹر محمد ناصر، انڈونیشیا

باب سوم : اسلام اور مغرب ۳۸۹

- دام ہمرنگِ زمین ۳۹۳
  ڈاکٹر محمد محمد حسین،
  پروفیسر ادبیات عربیہ، اسکندریہ یونیورسٹی، مصر
- مستشرقین کی بے خبری ۴۳۱
  پروفیسر احمد راتب النفاخ
  پروفیسر ادبیات عربیہ، آرٹس کالج، (شام یونیورسٹی)، شام
- مستشرقین اور احادیثِ رسولؐ ۴۶۳
  عبدالوھاب حمودہ
  رکن ادارہ تحریر مجلہ لواء الاسلام، مصر
- نسلی امتیاز ۴۸۳
  ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، صدر شعبہ قانون اسلامی، شام یونیورسٹی، شام

Marfat.com

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری نقشبندی مجددی • لاہور پاکستان
ذخیرہ

پیشِ لفظ

اَز مُرَتِّب

پیشِ نظر کتاب "نظام اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں" اٹھارہ مقالوں کا مجموعہ ہے ۔۔۔ جو "نشیدِ آغاز" کے علاوہ، تین ابواب میں منقسم ہے : باب اول : فقہ و قانون، باب دوم : ریاست و حکومت اور باب سوم : اسلام اور مغرب۔ ان مقالوں میں سے ہر مقالہ بظاہر اپنا الگ عنوان اور الگ موضوع بحث رکھتا ہے، لیکن ان کے مابین ایک ایسی قدرِ مشترک پائی جاتی ہے، جو ان مختلف العنوان مقالوں کو یکجا شائع کرنے کا موجب ہوئی ہے ۔ وہ قدرِ مشترک ہے: "اسلامی نظام!" ——— یعنی وہ زبردست تڑپ، وہ گہری آرزو، اور وہ ہمہ گیر مطالبہ جو انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک ملّتِ اسلامی کو بے تاب کیے ہوئے ہے ۔ اور اس کا ہر فرد زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

"اسلامی نظام" کو قدرِ مشترک قرار دینے کا ثبوت یہ ہے کہ قاری ان مقالوں کو اسلامی نظام کے محور پر گردش کرتا ہوا دیکھے گا ۔ چنانچہ اُسے معلوم ہو گا کہ اسلام

Marfat.com

کے مآخذ اصلیہ کیا ہیں۔ اسلام میں ان کی اہمیت کیا ہے۔ اربابِ اجتہاد اور علمائے قانون نے اس میدان میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں۔ وجوہ اتفاق اور اسبابِ اختلاف کیا ہیں۔ قانون سازی کے حدود و اصول کیا ہیں اور وہ تاریخ میں کن کن مراحل سے گزری ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اُسے اسلامی نظام کے مختلف شعبوں کی تفصیل ملے گی۔ اور اُسے اندازہ ہوگا کہ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اسلام اپنی کیا دستوری اور قانونی اسکیمیں رکھتا ہے۔ اس ضمن میں اُسے اسلامی نظام پر معترضین کے جواب بھی ملیں گے۔ اور اسلام کے فروغ و غلبہ اور اسلامی نظام کے احیاء و اقامت کی راہ میں مغربی مفکرین جو روڑے اٹکا رہے ہیں اور جن جن طریقوں اور تدبیروں سے اُس کے صاف و شفاف چشموں کو مکدر کر رہے ہیں، قاری ان سے بھی اجمالی طور پر متعارف ہوگا۔

ان مقالات کے مصنفین دنیائے اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس محفل میں قاری کو جہاں مشرق کے اسلامی ملک: انڈونیشیا کے اہلِ علم شریکِ بزم نظر آئیں گے، وہاں مغرب کے اسلامی ملک: مراکش کے مفکر بھی رونق افروز ملیں گے۔ اور پھر وہ محض "مُلّا" ہی نہیں بلکہ اپنے ملک کی نامور علمی اور سیاسی شخصیتیں ہیں۔ ان میں سے بعض تعلیم اور قانون کی وزارتوں کے سربراہ رہ چکے ہیں، بعض اعلیٰ علمی اداروں کے انچارج ہیں، کچھ ادب و صحافت کی مسند پر متمکن ہیں، اکثریت قانون و سیاست کے ماہرین اور اساتذہ پر مشتمل ہے۔ اور دو بزرگ ایسے بھی ہیں جو اپنے ملک میں وزارتِ عظمیٰ کے

Marfat.com

منصب پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ لوگ محض نظریاتی دنیا کے مکین ہی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے مسائل کو عملی زاویہ سے سمجھتے ہیں اور ان کے خوب و زشت کا عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ یہ چیز ان کی رائے اور مشورے کو غیر معمولی اہمیت عطا کر دیتی ہے۔ اور کسی ذی شعور شخص کے لیے اُس کا رد کر دینا یا اُسے نظر انداز کر دینا آسان نہیں ہے۔ اور ان سب کا مشترک فیصلہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے سب سے موزوں تر اگر کوئی نظام ہو سکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔

اس مجموعہ سے قاری کو ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ اسلاف کے کارناموں سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ، عہدِ حاضر میں اسلام کے فروغ و احیاء کی کوششوں سے متعارف ہوگا۔ اور جہاں قانون و سیاست کے طلبہ کو اس میں تحقیقی مواد ملیگا اور مزید کام کے لیے ان کے سامنے راہیں کھلیں گی، وہاں اسلام پسند عنصر کو بھی اپنے قافلے کی عظمت و وسعت اور اپنی تحریک کے زور و اثر کا اندازہ ہوگا۔ اور درحقیقت یہی چیز مدعائے کاوش ہے۔

آخر میں ہم اپنے قارئین سے یہ بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ تمام تر مقالات عربی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ان میں اندازِ زبان و بیان کے سقم رہ گئے ہوں گے۔ اس لیے انہیں جہاں کہیں ایسی کوئی لغزش نظر آئے مطلع فرما دیں تاکہ ہم اسے آئندہ ایڈیشن میں دور کر سکیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

کتبہ العاجز

خلیل احمد حامدی

۳۰ جون ۱۹۶۳ء ——— اچھرہ۔ لاہور

Marfat.com

ق

تنظیم المسلمین
فتح گڑھ

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



عرضِ ناشر

نظامِ اسلامی کے احیاء کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ صرف پاکستان ہی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ اس کرۂ زمین پر جہاں جہاں بھی مسلمان پائے جاتے ہیں وہ اس کے لیے برابر کوشاں ہیں۔ خصوصاً ان خطّوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور معاملات کی زمامِ کار ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت اسلام کے جمالِ جہانتاب کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہے اور اس کے دامنِ رحمت میں تسکین پانے کے لیے بیقرار۔

ایک عرصہ سے ایک ایسے مجموعہ کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس میں مسلمانانِ عام کے حقیقی جذبات کی عکاسی ہو اور دل کی دھڑکنیں سُنی جا سکتی ہوں۔ اور نظامِ اسلامی کے جمال دل افروز کی جو دلکش تصویریں کھینچی گئی ہوں ان کو پیش کیا گیا ہو۔

ہم اپنے محترم اور عزیز رفیق جناب خلیل احمد صاحب حامدی کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے کمال محنت سے ایک ایسا مجموعہ مرتب و ترجمہ کر کے اس

Marfat.com

دیرینہ آرزو اور اہم ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ آپ نے اس مجموعہ میں مشاہیر عالم اسلام کے وہ معرکۃ الآرا مقالات و مضامین یکجا کر دیے ہیں جن سے نظامِ اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اور جو اپنے اندر ایمان کی حرارت، یقین کی دولت، عمل کی دعوت کا اتھاہ خزانہ سمیٹے ہوئے ہیں۔

اس مجموعہ میں آپ کو استاذ ابوزہرہ، ڈاکٹر معروف دوالیبی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر محمد ناصر، مصطفیٰ زرقاء، شیخ الازہر محمد محمود شلتوت وغیرہ جیسے اعاظم رجال کی نگارشات دعوتِ مطالعہ دیں گی۔

ہمارا دعویٰ تو نہیں البتہ خیال ضرور ہے کہ اردو میں یہ کتاب اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ ایسے جید علماء اور ممتاز رہنماؤں کے رشحاتِ فکر کسی دوسری کتاب میں یکجا ملنا مشکل ہے۔

ہمیں امید ہے کہ جو حضرات بلند پایہ علمی ذوق رکھتے ہیں اور عالمِ اسلامی کی ممتاز ہستیوں کے نتائجِ افکار کے متلاشی ہیں وہ اس مجموعہ میں اپنے ذوق کی تسکین کا وافر سامان پائیں گے۔ وبید اللہ التوفیق

۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ
مطابق ۳ اگست ۱۹۶۳ء

نیازمند
اخلاق حسین
جنرل منیجر
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور

Marfat.com

نشیدِ آغاز

محمد رضا شبیبی — سابق وزیرِ تعلیم عراق

عبداللہ کنون — سابق وزیرِ قانون مراکش

Marfat.com

محمد رضا شبیبی :

دنیائے عرب کے ممتاز شاعر اور ادیب ہیں۔ بغداد (عراق) کے رہنے والے ہیں۔ مسلکِ شیعی کے پیرو ہیں مگر تعصب نام کو نہیں۔ ۷۰ برس کے لگ بھگ ہیں۔ عمر کا تمام تر حصہ عربی ادب، اور وطن کی خدمت میں گزرا۔ برطانوی استعمار کے خلاف عراق کی جنگِ آزادی میں اپنے والد جواد شبیبی مرحوم کی قیادت اور اپنے بھائی باقر شبیبی کی رفاقت میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اپنے حرارت آمیز قصائد اور جذبہ انگیز نظموں کے ذریعہ جہاد کی روح پھونکتے رہے۔

موصوف متعدد بار عراق کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ عراقی سینٹ کے صدر بھی رہے، آج کل عراق کی علمی اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں۔ اور مصر اور شام کی علمی و عربی اکیڈیمیوں کے اعزازی رکن ہیں۔

ان کے اشعار کی نمایاں خوبی سلاست اور سوز ہے۔ الفاظ کا حسن اور تراکیب کی نفاست عباسی دور کے شعراء کی یاد تازہ کرتی ہے۔ موصوف اپنے ہم عصر عراقی شاعروں : معروف رصافی

Marfat.com

(۱۸۷۵ء — ۱۹۴۵ء) اور جمیل صدقی زھاوی (۱۸۶۳ء — ۱۹۳۶ء) کی طرح تجدد و اباحیت کے داعی نہیں بلکہ اسلامی قدروں کے علمبردار ہیں۔ اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "شاعر کا فرض یہ ہے کہ وہ مرض کی تشخیص کر کے دوا تجویز کرے۔ معاشرے کے مدوجزر اور حوادثِ تاریخ کی گہرائیوں سے عبرت آموز حقائق اخذ کرے اور یہ نہ بھولے کہ اس کا مشن مکارم اخلاق اور اعلےٰ انسانی قدروں کا فروغ ہے ....." زیرِ نظر نظم: "روحِ پیغمبرؐ" ان کے دیوان مطبوعہ ۱۹۴۰ء سے لی گئی ہے جو انھوں نے ۳۵ء میں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلّم کے یومِ ولادت کے موقع پر کہی تھی۔

Marfat.com

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رُوحِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

۱- اَلَا لَیْتَ شِعْرِیْ مَا نَوٰی رُوْحُ اَحْمَدٍ
اِذَا طَالَعَتْنَا مِنْ عِلٍ، اَوْ اَطَلَّتْ ــــ!

۲- وَاَکْبَرُ ظَنِّیْ لَوْ اَتَانَا مُحَمَّدٌ
لَلَاقَی الَّذِیْ لَاقَاہُ مِنْ اَھْلِ مَکَّۃَ

۳- عَدَلْنَا عَنِ النُّوْرِ الَّذِیْ جَاءَنَا بِہٖ
کَمَا عَدَلَتْ عَنْہُ قُرَیْشٌ فَضَلَّتِ

۴- اِذَنْ لَقَضٰی، لَا مَنْھَجُ النَّاسِ مَنْھَجِیْ
وَلَا مِلَّۃُ الْقَوْمِ الْاَوَاخِرِ مِلَّتِیْ

۵- دَعَوْتُ اِلَی التَّوْحِیْدِ یَجْمَعُ شَمْلَکُمْ
وَلَمْ اَدْعُ لِلشَّمْلِ الْبَدِیْدِ الْمُشَتَّتِ

۶- وَجِئْتُ رَسُوْلًا لِلْحَیَاۃِ، وَلَا اَرٰی
بِکُمْ غَیْرَ حَیٍّ فِیْ مَدَارِجِ مَیِّتِ

۷- وَیَسَّرْتُ شَرْعًا مَا تَعَنَّتَ ــ یَافِعًا

Marfat.com

وَسُرْعَانَ مَا مِلْتُمْ بِهِ لِلتَّعَنُّتِ

٨- وَحَرَّمْتُ فِي الْإِسْلَامِ مِنْ بَعْدِ حِلِّهَا
مَسَاوِئَ عَادَتْ بَعْدَ حِينٍ فَحَلَّتِ

٩- وَأَوْصَيْتُ بَعْدَ الْحَقِّ بِالصَّبْرِ أُمَّةً
عَلَى مُبْطِلِيهَا حُجَّةُ اللهِ حَقَّقَتِ

١٠- وَمَكَّنْتُ مِنْ سُلْطَانِ كِسْرَى وَقَيْصَرَ
أُنَابِسَهَا أَرَى أَبْنَاءَهَا الْيَوْمَ ذَلَّتِ

١١- وَعَظْتُ وَلَمْ أَتْرُكْ مِنَ النُّصْحِ غَايَةً
وَجَادَلْتُ قَوْمِي بِاللِّتَيَّا وَبِالَّتِي

١٢- وَعَالَجْتُ أَدْوَاءَ الصُّدُورِ دَقِيقَةً
إِلَى أَنْ تَخَلَّى الدَّاءُ عَنْهَا فَصَحَّتِ

١٣- وَكَمْ قَائِلٍ: "نَفْسِي" إِذَا النَّفْسُ بُوِّقَتْ
وَمَا قَالَ - مِثْلِي فِي الْمُلِمَّاتِ: "أُمَّتِي"

١٤- تَلَفَّتَّ يَا رُوحِي وَأَنْتِ غَرِيبَةٌ
مِنَ الْحَيِّ فَاجْتَازِي، وَلَا تَتَلَفَّتِي

ترجمہ:

١- اگر احمد مجتبیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک عالمِ بالا سے ہمارے پاس تشریف لے آئے یا ہمیں جھانک کر دیکھ لے تو معلوم نہیں کہ ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرے !!

Marfat.com

۲۔ میرا گمان غالب ہے کہ اگر محمد صلے اللہ علیہ وسلّم آج ہمارے پاس تشریف لے آئیں تو آپ کو آج ہماری قوم کے ہاتھوں اسی قسم کے مصائب، اور اعراض و انکارِ حق سے دوچار ہونا پڑے گا جس طرح آپ اہلِ مکہ کے ہاتھوں دوچار ہوئے۔

۳۔ (کیونکہ) ہم نورِ حق سے، جس کو لے کر آپؐ مبعوث ہوئے تھے، اور جس نے انسانی زندگی کے ہر گوشے کو تابناک کر دیا تھا، اسی طرح روگردانی کر چکے ہیں جس طرح قریش نے اس سے منہ پھیرا تھا اور گمراہی کے گڑھے میں جا پڑے تھے۔

۴۔ اور پھر آپؐ یقیناً یہ فیصلہ کریں گے کہ لوگ جس ڈگر پر چل رہے ہیں، یہ میرا بتایا ہوا راستہ نہیں ہے اور آخری زمانے کے لوگوں نے جس مذہب کا طوق اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے وہ میرا مذہب ہرگز نہیں ہو سکتا۔

۵۔ میں نے تو تم کو توحید کی دعوت دی تھی جو تمھارے اتحاد و اتفاق اور تمہاری شیرازہ بندی کا موجب تھی۔ تفرق و تشتت اور گروہ بندی سے میری دعوت کو کوئی سروکار نہیں تھا۔

۶۔ میری رسالت کا مقصد یہ تھا کہ تمھارے اندر زندگی اور حرارت پیدا کروں۔ اس کے برعکس میں تمھیں دیکھ رہا ہوں کہ تم تو چلتی پھرتی لاشیں ہو اور زندگی و حرارت کی کوئی رمق تمھارے اندر نظر نہیں آتی۔)

۷۔ میں نے نہایت آسان اور خامیوں سے پاک شریعت پیش کی تھی جس میں غیر فطری سختیوں اور ہمت سے بڑھ کر تکلیفوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن تم نے تو اُسے بڑی جلدی مشکل اور ناقابلِ عمل بنا کر رکھ دیا ہے۔

۸۔ اسلام سے قبل منکرات و فواحش کو حلال سمجھا جاتا تھا، لیکن میں نے اسلام

Marfat.com

میں انھیں حرام قرار دے دیا، اب اُنہی منکرات کا پھر دور دورہ ہو گیا ہے اور انھیں حلال ٹھیرا لیا گیا ہے۔

۹- اُمّت کو میری یہ وصیت تھی کہ وہ حق اختیار کرنے کے بعد اس پر ڈٹ جائے اور اب اس وصیّت پر عمل درآمد نہ کرنے والے پر اللہ کی حجّت قائم ہو چکی ہے۔

۱۰- میں نے (دین حق کی برکت سے) انسانوں کی ایک جماعت کو کسریٰ اور قیصر پر غالب کر دیا تھا۔ اور آج میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کی اولاد ذلیل و خوار ہے۔

۱۱- میں نے قوم کو سمجھانے بجھانے اور پند و موعظت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور ہر طرح کے دلائل و براہین کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔

۱۲- اور میں نے انسانی دلوں کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے روگوں کا علاج کیا۔ حتیٰ کہ وہ ہر قسم کی بیماریوں سے نجات پا کر صحت مند ہو گئے

۱۳- (اب اس اُمّت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ) جب جہان پر آبنتی ہے تو نفسی نفسی کہنے والے تو بہت ہیں (یعنی صرف اپنی ہی نجات ڈھونڈنے والے) مگر میری طرح مصیبتوں کی یورش میں بھی "اُمتی۔ اُمتی" کسی کی زبان سے نہیں نکلتا۔ (یعنی امتِ مسلمہ کی بھلائی اور خیر خواہی کی کوئی فکر نہیں کرتا۔)

۱۴- اے میری رُوح! یہ تیری بستی نہیں ہے اور نہ یہ تیرا قبیلہ۔ ہے، تو غریب الدیار ہے، یہاں سے گزر جا اور ادھر مُڑ کر نہ دیکھ۔

"الیشیا" سیرت نمبر ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

Marfat.com



عبداللہ کنون :

مراکش کی نامور شخصیت ہیں۔ عربی زبان وادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اسلامی فقہ وقانون اور اسلامی تاریخ پر کامل دستگاہ حاصل ہے۔ مراکش کی جنگ آزادی میں صفِ اوّل کے مجاھدین میں رہے ہیں۔ استقلالِ مراکش سے قبل طنجہ میں ایک اسلامی درسگاہ کے مدیر تھے۔ اس درس گاہ کی داغ بیل موصوف نے خود ہی ڈالی تھی جو علم وعرفان کا مرکز بھی تھی اور جہادِ آزادی کا کیمپ بھی۔ علاوہ ازیں طنجہ کی مجلس علمی کے صدر بھی رہے۔

جہادِ آزادی کے دوران فرانسیسی مظالم کا نشانہ بنے رہے۔ اور آخرکار طنجہ سے بے سروسامانی کے عالم میں تطوان (مراکش کا وہ خطہ جو اسپین کے تحت تھا) ہجرت کر گئے اور وہاں وزیر قانون کے منصب پر فائز ہوئے۔ موصوف عرصہ دراز تک تطوان کے علمی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (معہد مولائے حسن) کے ڈائرکٹر بھی رہے، جس کا مقصد شمالی افریقہ کے تاریخی اور اسلامی ورثہ کا احیاء تھا۔ یہ کام موصوف کے علمی ذوق اور اسلامی مزاج سے مطابقت رکھتا تھا۔

Marfat.com

چنانچہ چند سال کے اندر موصوف نے شمالی افریقہ کی علمی و ادبی تاریخ اور دینی سرگزشت پر تحقیقات کے انبار لگا دیے۔ ان تمام مشاغل کے ساتھ ساتھ ماہنامہ "لسان الدین" کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ یہ رسالہ عربی کے مشہور زبان دان ڈاکٹر تقی الدین ھلالی نے جاری کیا تھا اور مراکش کا واحد دینی و ادبی صحیفہ اور دعوتِ اسلامی کا نقیب تھا۔

شمالی افریقہ میں پاکستان کی تحریک اسلامی کو اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات کو پہلی مرتبہ آپ نے ہی متعارف کرایا ہے۔ آپ کی عمر اس وقت ۵۰ سال سے زائد ہے۔ اور آجکل مراکش کی نوآزاد مملکت میں دین حق کے فروغ کے لیے وقف ہیں۔ اور غیروں سے نپٹ کر اپنوں سے دوچار ہیں۔

Marfat.com

عہدِ حاضر میں اسلام کی زبوں حالی

عصرِ حاضر میں دعوتِ اسلامی پر جو زبوں حالی و بے کسی طاری ہے۔ تاریخ کے کسی دَور میں وہ ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوئی اور عصرِ حاضر کے مدّعیانِ اصلاح کے ہاتھوں اس کی اقدار و خصائص کو جس طرح مسخ کیا گیا ہے۔ عہدِ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ امام بوصیری رحمہ اللہ کا قول: "ومن شدۃ الظہور الخفاء" (کسی چیز کا زیادہ نمایاں ہونا بھی اس کی پوشیدگی کا سبب بن جاتا ہے) موجودہ بدتر حالات پر ـــــ جن میں اسلام سراسیمہ ہو کر ٹامک ٹوئیے مار رہا ہے، مگر اس کے ماننے والے اُسے نشأۃ ثانیہ اور ترقی کی جانب گامزن سمجھ رہے ہیں ـــــ جس صحت کے ساتھ صادق آرہا ہے پہلے کبھی نہ آیا ہوگا۔

دعوتِ اسلامی کے روشن ایام اس میں کوئی شک نہیں کہ دعوتِ اسلامی کا کاروان آغازِ سفر ہی میں سنگین مزاحمتوں سے دوچار ہوتا رہا ہے، اور روزِ اوّل ہی سے چند در چند مخالفتوں کے طوفان اس کی اقدار و خصائص سے متصادم ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ ہجرت نبویؐ کا دور، بعد ہجرت کا مرانیوں کا دور، خلفائے

Marfat.com

راشدین کا زمانہ، اموی عہد اور پھر عنصر عبّاسی، جب کہ اسلامی تہذیب و تمدن پوری طرح اپنی جڑیں جما چکا تھا، اور مسلمانوں کو علوم و فنون میں یدِ طولیٰ حاصل ہو چکا تھا، ان تمام ادوار میں دعوتِ اسلامی پر کبھی یہود کی چیرہ دستیاں، کبھی منافقین کی ریشہ دوانیاں، کبھی خوارج و معتزلہ کی طوفان خیزیاں اور کبھی باطنیہ، زنادقہ، اور ملاحدہ کی کینہ توزیاں حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ مگر ان سب کے علی الرغم دعوتِ اسلامی نے کبھی اپنی ڈگیں نہیں ڈالیں اور کسی موقع پر سرنگوں نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر محاذ پر اس نے پہاڑ کی سی ثابت قدمی کے ساتھ ہر مزاحم قوت کو پسپا کیا، ہر مخاصمت کو حرفِ غلط کی طرح مٹایا۔ اعدا سے ہمیشہ غلبہ حاصل رہا۔ اور اس کی صفوں کو ہدفِ انتشار بنانے کی ہر کوشش اس کی شیرازہ بندی کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کا موجب ہوئی۔ اس میں تغیّر و تبدّل کو کبھی راہ نہ مل سکی۔ جو کچھ تغیّر ہوا وہ صرف اس کے ذرائع و وسائل میں ہوا۔ حالات کے تقاضوں اور ارتقاء کے عوامل کے تحت ہوا۔ رہا اصولوں کا تعلق تو ان میں کسی تبدیلی یا تحوّل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ حالات و حوادث کے سخت حملوں کے باوجود اس کی اساسات قائم و دائم رہیں۔ جس نے بھی انھیں منہدم کرنے یا متزلزل کرنے کی جسارت کی اُسے دعوتِ اسلامی کی طرف سے سخت چیلنج دیا گیا۔ اور اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد پوری شان کے ساتھ حالات پر حسپاں ہوتا رہا کہ: يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔

جہاں تک عہدِ نبوّت کا تعلق ہے، اس مبارک عہد میں دعوتِ اسلامی پر جو بحرانی کیفیات طاری ہوئیں اور رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلّم نے توفیقِ وحیٔ الٰہی ....

Marfat.com

کلمۃ اللہ کو بالاتر کرنے اور دوسرے تمام کاموں کو نگونسار کرنے کے لیے جو مثالی جہاد کیا ـــــ حتیٰ کہ حق کامیاب ہوگیا اور باطل نامراد ہوگیا اور جزیرۂ عرب میں کوئی ایسا متنفّس باقی نہ رہا جو کفر و نفاق کے ساتھ بالاسر ہو کر چل سکتا ہو ـــــ اس کی مثالیں پیش کرنے کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ صاحبِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جو کچھ کیا وہ آپ کے فرائض میں داخل تھا اور آپ کی مہمِ عظیم کا تقاضا تھا۔ قرآنِ کریم میں دعوتِ اسلامی کے ان مراحل و ایّام کی اور دینِ حق کے غلبہ و تفوق اور ہر گوشۂ ملک تک اُسے پہنچانے کے لیے آنحضرتؐ صلے اللہ علیہ وسلّم کے تمام کارناموں اور قربانیوں کی طویل روداد موجود ہے۔ جو شخص اس معجز طراز اور حیرت افزا روداد کو معلوم کرنا چاہے وہ قرآن کے متعلّقہ حصّوں کی طرف رجوع کر کے معلوم کر سکتا ہے۔

فتنۂ ارتداد یا دعوتِ اسلامی کی پہلی آزمائش دورِ خلافتِ راشدہ کی سب سے پہلی آزمائش جس کی بھٹی سے دعوتِ اسلامی کو گزرنا پڑا، فتنۂ ارتداد کا ظہور ہے جس میں بعض عرب قبیلوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور زکوٰۃ کو ایک ایسا ٹیکس سمجھ بیٹھے تھے جو ان کی قید و بند سے آزاد اور بے لگام بسر ہونے والی زندگی کے منافی تھا۔ لیکن خلیفۂ اوّل کے مدبّرانہ موقف کے طفیل یہ دعوت اس امتحان سے انتہائی استقامت کے ساتھ اور عظیم کامرانی اور سرخروئی کے ساتھ نکلی۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو صحابہ کی تمام جماعت نے مخالفت کی۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے شخص نے بھی جو سخت گیری، اور غیرت مندی میں مشہور تھے، اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا: اتقاتلھم

Marfat.com

علی الشاۃ والبعیر؟ (کیا آپ بھیڑ بکریوں کی خاطر اُن کے خلاف تلوار اٹھانے لگے ہیں) مگر ابوبکر صدیقؓ نے جواب دیا: "خدا کی قسم اگر یہ لوگ زکوٰۃ کی اس رسّی کو بھی دینے سے انکار کریں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیا کرتے تھے تو میں اس کی خاطر بھی ان سے لڑوں گا۔" فی الواقع اگر حضرت ابوبکرؓ یہ مضبوط موقف اختیار نہ فرماتے تو زکوٰۃ کا حکم نسیاً منسیاً ہو جاتا، اور اس کے بعد اسلام کے دوسرے اصول و ارکان بھی ایک ایک کر کے منہدم ہو جاتے اور آج ہمیں اسلام کا نام و نشان تک بھی نظر نہ آتا۔

انکارِ زکوٰۃ کا اجتماعی نقصان کیا تھا؟ انکارِ زکوٰۃ کا معاملہ صرف اتنا ہی نہ تھا کہ دین کا ایک شعار معطّل کیا جا رہا تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اللہ تعالےٰ نے مالداروں پر جو زکوٰۃ فرض کی ہے، اُس سے غریبوں اور حاجت مندوں کو محروم کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے صدیقِ اکبرؓ کی جنگ سیٹ دھرم سرمایہ داری کے خلاف تھی جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ دنیا کے اندر جینے اور لذائذ دنیا سے لطف اندوز ہونے کا حق تنہا اُسی کو حاصل ہے۔ اور یہ فراموش ہو گیا کہ یہاں انسانوں کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی تہی دست ہے اور لازم ہے کہ اس کی خبر گیری اور مواسات کی جائے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

حضرت ابوذرؓ کی دعوتِ اشتراکیت عجیب اتفاق ہے کہ عہدِ خلافتِ راشدہ کا دوسرا حادثہ یہود دعوتِ اسلامی کے لیے نئی آزمائش کا پیغام لے کر آیا، طبقۂ غرباء کے اندر برپا ہوا اور قریب تھا کہ ملّت کے اجتماعی و اقتصادی نظام میں اسلامی

Marfat.com

اصولوں کے خلاف بغاوت بھڑکا دیتا۔ اس فتنہ نے طبقۂ غرباء کے اندر اشتراکیت (سوشلزم) کے انتہا پسندانہ نظریہ ـــــ جو معقول انسانوں سے ان کی دولت، اور مالکانِ اراضی سے ان کی زمین سلب کرنے کی کشمکش برپا کر دیتا ہے اور ان تمام امتیازی خطوط کو پامال کر جاتا ہے جو انسانی سوسائٹی کے مختلف طبقات کے اندر عرف انسانی میں پشت ہا پشت سے مسلّم چلے آرہے ہوتے ہیں ـــــ کی تخم ریزی شروع کر دی۔ اور اسے بارآور ہونے کے لیے خاصا زرخیز میدان ہاتھ آگیا۔

اس نظریہ کے علمبردار جلیل القدر صحابی حضرت ابوذرؓ غفاری تھے۔ حضرت ابوذرؓ دمشق کی شاہراہوں اور چوکوں میں کھڑے ہو جاتے اور راہ گیروں سے پکار پکار کر کہتے: "بشر الکافرین بنار یحمٰی علیها ما کنزوا فتکوٰی جباههم وجنوبهم وظهورهم" (کافروں کو اس آگ کی خوشخبری سنا دو جس سے ان کے خزانے تپائے جائیں گے اور انہی کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔) اس مہم میں حضرت ابوذرؓ کے ساتھ ان کا ایک غلام بھی تھا۔ دونوں کے بدن پر یکساں لباس ہوتا تھا اور دونوں ایک ہی قسم کا کھانا ایک ہی جگہ مل کر کھاتے تھے۔ ان کی باتوں کو سننے کے لیے غریبوں اور فقیروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ ان کے افکار و خیالات سے ان شہروں کے مسلمان خاص طور پر دلچسپی لینے لگے تھے جہاں دعوت اسلامی نے ابھی اچھی طرح پاؤں نہیں جمائے تھے۔ چنانچہ ان کے اقوال بڑھا چڑھا کر پیش کیے جانے لگے اور ان کی جانب ایسی آراء منسوب کی جانے لگیں جن کے وہ خود بھی قائل نہ تھے۔ حضرت معاویہؓ جو اس وقت شام کے گورنر تھے، حضرت ابوذرؓ کی مہم سے بڑے تنگ

Marfat.com

آ گئے اور انھیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر یہ دعوت یونہی برقرار رہی تو ایک
سفید پوش طبقہ ایسی طالع آزما کشمکش پر منتج ہو گی جسے موالی، پسماندہ طبقہ کے لوگ اور
مفتوح علاقوں کے زخم خوردہ افراد برپا کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس یہ شکایت بھیجی۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت
ابوذرؓ کو مدینہ طلب کر لیا، اور ان کے خیالات معلوم کیے اور جب آپؓ پر یہ
واضح ہو گیا کہ ابوذرؓ کی دعوت میں بہت بڑا خطرہ مضمر ہے تو آپ نے حضرت
ابوذرؓ کو ربذہ نامی ایک الگ تھلگ بستی میں جلاوطن کر دیا۔ اور اس طرح یہ
خطرہ ٹل گیا۔

دعوت ابوذرؓ سے عام صحابہ کا اختلاف خلیفہ ثالث کی طرف سے یہ ایسا
کارگر اقدام تھا کہ اس کے بغیر کوئی صورت اسلام کے نظامِ حکومت کو اور
شریعتِ مطہرہ کو بچانے والی نہ تھی۔ شریعت کا یہ مسلّم و محکم اصول ہے کہ وہ
شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرتی ہے اور دولت کو ساجھے کی ہنڈیا بنانے کے
بجائے وہ انسانی جان کی طرح اس کی حفاظت لازم ٹھہراتی ہے۔ البتہ خزانۂ
ریاست وہ مشترکہ کھاتہ ہے جہاں سے ہر شخص اپنے مرتبہ و ضرورت کے مطابق
اپنا حق وصول کرنے کا مجاز ہے۔ یا مالِ زکوٰۃ ہے جو شریعت نے صرف فقراء
و مساکین کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں شریعت تمام لوگوں کو دعوت
دیتی ہے کہ وہ جائز طریقوں سے اپنی دولت و ثروت کی افزائش کریں۔ اور
اگر وہ اپنے اوپر عائد شدہ حقوق و فرائض کو ادا کرتے رہیں تو وہ کسبِ مال کے
لیے جس قدر چاہیں اپنے ذرائع و وسائل پھیلاتے جائیں۔ یہی بنیاد تھی جس

Marfat.com

کے پیش نظر تمام صحابہؓ نے حضرت ابوذرؓ کے مسلک سے براءت کا اظہار کیا۔ حضرت ابنِ عمرؓ فرمایا کرتے تھے: کل ما ادیت زکاتہ فلیس بکنز ولو کان تحت سبع ارضین (جس مال کی تو نے زکوٰۃ ادا کردی ہو وہ کنز نہیں ہے، خواہ اسے سات زمینوں کے نیچے دبا رکھا ہو)۔ ہاں، بذل و سخا اور احسان و عطاء کے میدان میں مسابقت کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی بلکہ مطلوب و مستحسن یہ ہے کہ مسلمان اس میدان میں بڑھ چڑھ کر ریکارڈ توڑیں۔ لیکن یہ مطالبہ بر سبیلِ ترغیب و تشویق ہے نہ کہ بذریعہ جبر و اکراہ۔

صاحب ثروت صحابہ کا جذبۂ انفاق کتاب و سنّت میں انفاق فی سبیل اللہ کے لیے اور کمزوروں اور ناداروں کی مواسات کے لیے جو کچھ ترغیبات مذکور ہیں یا بخل و تنگدلی سے جیسی کچھ نفرت دلائی گئی ہے اس سے کوئی شخص ناواقف نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے انہی ترغیبات کو عزیمت پر محمول کیا اور اصل حکم قرار دیا۔ لیکن دوسرے صحابہ — جن میں خلفائے راشدین بھی تھے اور عشرہ مبشرہ بھی — ان کی اس توجیہ کے خلاف تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ میں زبیر بن عوام اور عبدالرحمٰن بن عوف جیسے بڑے بڑے صاحب ثروت لوگ بھی تھے لیکن ان کا حال یہ تھا کہ جب انھیں صدقہ و خیرات کی دعوت دی جاتی تو وہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اپیل پر یکبارگی اپنا تمام سرمایہ حاضر کر دیتے ہیں اور جب حضورؐ ان سے دریافت فرماتے ہیں کہ ما ترکت لاولادك؟ (بال بچوں کے لیے کیا چھوڑا

Marfat.com

ہے) تو وہ جواب دیتے ہیں: ترکت لھم اللہ ورسولہ (اللہ اور رسول ان کے پاس چھوڑ آیا ہوں)۔ عمرؓ بن الخطاب اپنی تمام پونجی کا نصف پیش کر دیتے ہیں۔ اور حضرت عثمانؓ ــــ جنھوں نے حضرت ابوذرؓ کے مقابلے میں سرمایہ داروں کی حمایت کی تھی ــــ دعوتِ اسلامی کی کامیابی کے لیے اتنا مال بارگاہِ رسالت میں نچھاور کر دیتے ہیں کہ اسے احاطۂ شمار میں لانا دشوار ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ جیش پورے کا پورا لشکر (جیش العسرۃ) صرف اپنے مال سے تیار کر دیتے ہیں اور بارگاہِ نبوت سے ان کو یہ اعزاز عطا کیا جاتا ہے کہ ما ضر عثمان ما فعل بعد الیوم (آج کے بعد عثمان جو کچھ بھی کرے گا اسے نقصان نہیں پہنچے گا)۔

دونوں خلیفوں کے بروقت اقدام کی اہمیت میرا مدعا یہ ہے کہ اسلام، جو ہر صاحب حق کو اس کا پورا حق عطا کرتا ہے اور بے لچک سرمایہ داری اور انتہا پسند سوشلزم کے بین بین اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے، اسے اپنی دونوں آزمائشوں کے موقع پر دونوں خلیفوں کی ذات میں اپنی اقدار و ممیزات کے دو بہترین پاسبان میسر آ گئے۔ جونہی مالدار طبقہ نے فقراء و مساکین کو ان کے حقوق سے محروم کر دینے کی دھمکی دی خلیفۂ اوّل یکایک اُٹھے اور ان کی حمایت میں مالداروں کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا۔ دوسری طرف جب اغنیاء کے خلاف طبقۂ فقراء کے غلط تصورات نے خطرے کا الارم بجایا تو خلیفۂ ثالث اغنیاء کا پاسبان ہو کر فقراء کے انقلابی عزائم سے ان کی حفاظت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے انتہا پسند مسلک کی بروقت سرکوبی کر دی، جو اگر کامیاب ہو جاتا تو معاشرۂ اسلامی کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتا۔ انتشار و پراگندگی کا طوفان برپا ہو جاتا اور زمامِ حکومت

Marfat.com

پر فتنہ پردازوں کا قبضہ ہو جاتا۔

خوارج کا فتنہ اور اس کا استیصال آگے چل کر اسلام پھر خلیفۂ مظلوم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایامِ خلافت میں ایک خطرے سے متصادم ہو جاتا ہے جس کی شدت اور ہلاکت خیزی نے سابقہ تمام خطرات کو مات کر دیا۔ یہ خوارج کا فتنہ تھا، جو صرف اسلامی ریاست کے مالیاتی نظام کے تار و پود بکھیرنے تک اکتفا کرنے والا نہ تھا بلکہ جس کے بطن میں ملّتِ اسلامی کے سیاسی، معاشرتی اور فکری ڈھانچے کا مکمل تیا پانچہ کر دینے کا سامان موجود تھا۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے پورے دورِ خلافت میں خوارج کی سرکوبی میں کبھی تردد سے کام نہیں لیا۔ بلکہ ہمیشہ ان کے خلاف معرکۂ قتال گرم رکھا۔ حتیٰ کہ آپ دین کی پاسبانی اور ملّت کی شیرازہ بندی کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ اب حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کو تو صحیح سمجھتے ہیں لیکن ملّتِ اسلامی کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والوں کے خلاف تلوار اٹھانے سے انھیں اتفاق نہیں ہوتا، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الثانی منھما (جب دو خلیفوں کی بیعت تک نوبت پہنچ جائے تو دوسرے کی گردن اڑا دو) اور نہ ہی دینِ حق کے اندر ایسے افکار و نظریات تراشنے والوں کے خلاف ان کی رگِ حمیت حرکت میں آتی ہے، جن کی کتاب و سنت میں کوئی سند نہیں ہے، جب کہ شارع علیہ السلام کا فیصلہ ہے کہ من احدث من امرنا ھذا ما لیس منہ فھو ردّ (جس نے دین میں ایسا طریقہ جاری کر دیا جو اس میں نہیں ہے تو اُسے ردّ کر دیا جائے گا۔)

Marfat.com

حضرت علی خواہ عین حیات فتنہ خوارج کے مہلک جراثیم کا عملی طور پر قلع قمع نہ کر سکے، لیکن بحیثیت نظریہ آپ نے ان کی جڑ کاٹ دی۔ چنانچہ یہ ان کے طرز عمل ہی کے اثرات ہیں کہ ان کے بعد ہر دور کے مسلمان ہمیشہ خوارج کے خلاف شمشیر بدست رہے ہیں۔ اور اسلامی پلیٹ فارم پر انھیں جگہ دینے کے کبھی روادار نہیں ہوئے ہیں۔ تاریخ کی شہادتیں موجود ہیں کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے جھنڈے تلے خوارج کو کبھی پناہ نہیں مل سکی اور نہ اسلامی خلافت کے کسی دور میں ان کی دال گل سکی۔

معتزلہ کا ظہور اور علماء کا ابتلاء خوارج کا اختلاف متعدد گمراہ فرقوں اور مسلکوں کو جنم دینے کا موجب ہوا، جیسے قدریہ، جبریہ اور مرجئہ وغیرہ۔ پھر انہی مذاہب کی تراش خراش سے ایک آخری گروہ برآمد ہوا جسے معتزلہ کہا جاتا ہے۔ ان فرقوں نے اپنے افکار کی تشہیر کے لیے تلوار کا استعمال نہیں کیا بلکہ ایک نظریاتی جنگ چھیڑ دی۔ چنانچہ علمائے اسلام اور ائمہ سنت اٹھے۔ اور ان کے افکار فاسدہ کے مسموم تیروں سے قلعۂ اسلام کی حفاظت میں لگ گئے۔ اور ان کے تیروں کو انہی کے سینہ و جگر میں پیوست کرنے لگے۔ چنانچہ یہ علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ان مذاہب پر ہمیشہ مُردنی چھائی رہی ہے۔ پوری تاریخ میں صرف چند ایسے مواقع ملتے ہیں جن میں ان کو بعض حکمرانوں کی حمایت حاصل ہو جاتی رہی ہے، جو ان میں کچھ دیر کے لیے چہل پہل پیدا کر دیتی تھی لیکن آخر کو خزاں زدہ ہو جاتے رہے ہیں۔ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ انجام کار علمائے اسلام نے ان پر ایسی ضرب کاری لگائی کہ سوائے تاریخ کے

Marfat.com

دفتروں کے اور ملل ونحل کی کتابوں کے ان کا کہیں ذکر تک نہیں چھوڑا اور صدیاں گزر گئی ہیں لیکن ان کے پیروکاروں کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ حالانکہ وسیع پیمانے پر ان کی اشاعت کی گئی اور امراء و حکام کا ایک گروہ بھی ان کے دام فریب میں آکر ان کی پشت پناہی کرتا رہا ——— دراصل اس وقت اسلامی حمیت زندہ تھی اور یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ اسلام کے جلیل القدر ائمۂ فکر ان مذاہب کے خلاف معرکہ آزما رہے اور انھوں نے فلسفہ و کلام کی فیصلہ کن جنگ لڑی، جس کی وجہ سے ان حضرات کو گہرے زخم بھی آئے اور ناقابل برداشت اذیتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے بڑے دل گردے کے ساتھ سب کچھ برداشت کیا ——— یہ غیرتِ دین ہی کی تپش تھی کہ انھوں نے ان بےخدا پسندانہ افکار اور گمراہ کن نظریات کی جڑ کاٹ کر قیامت تک کے لیے انھیں پیوندِ خاک کر دیا۔ اور بالآخر دعوتِ اسلامی کا پرچم اپنی اصل اقدار و خصوصیات کو لیے ہوئے دنیائے اسلام پر لہراتا رہا۔

مزید آزمائشیں ان کلامی معرکوں میں کیسے کیسے تلخ مجادلے و مناظرے ہوئے ہیں یا یہ اعتزالی افکار رسول ؐ کی تعلیم سے کس حد تک منحرف تھے اور عقیدۂ اسلام کے لیے کیا کیا خطرات اپنی آستینوں میں رکھتے تھے یا سلف صالحین کے دینی اور فکری طریقوں سے کہاں کہاں متصادم ہوتے تھے؟ ان تفصیلات میں اگر ہم جائیں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ جیسے تفصیلات درکار ہوں وہ خود ان متقابلین کی کتابوں سے رجوع کر کے معلوم کر سکتا ہے۔ ہمارے لیے اس مقام پر صرف اتنا بتانا کافی ہے کہ ہم نے حاصلِ بحث کے طور پر علماء کا

Marfat.com

وہ زبردست موقف بیان کر دیا ہے جو انھوں نے ائمۂ ضلالت کے مقابلے میں اختیار کیا تھا۔ ہم یہاں قرامطہ کی فتنہ انگیزیوں، صلیبی معرکوں اور تاتاری یورشوں کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ یہ حوادث دینی و مذہبی سے زیادہ سیاسی و عسکری رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اگرچہ انھوں نے بھی عالم اسلامی میں تہلکہ مچائے رکھا تھا۔ اور اسلامی تہذیب کے ان گنت نقوش کو برباد کر رکھ دیئے تھے۔ اور اسلام کا کاروان مدت تک جمود کی وادی میں پڑا رہا۔ یہ حوادث اپنے رنگ ڈھنگ کے لحاظ سے یورپ کی فکری و تہذیبی یلغار سے کافی مشابہت رکھتے ہیں جو گزشتہ صدی کے اواخر اور قرن حاضر کے اوائل میں بلادِ اسلام پر وارد ہوئی۔ ان دونوں میں صرف ایک فرق ہے جو بجائے خود بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہی دراصل اس مقالے کا موضوع ہے۔

دنیائے اسلام کا استعمار سے امجازی جہاد صدیوں کی نیند کے بعد جب مسلمانوں نے آنکھیں کھولیں تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ غیر ملکی حملہ آوروں کے لشکر ہیں جو ان کے شہروں اور بستیوں میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ دشمن کے جھنڈے ہیں جو ان کے ارض و سما پر لہرا رہے ہیں۔ استعمار کا کلمہ ہے جو ان کی سرزمین میں پڑھا جا رہا ہے۔ اس استعمار نے بظاہر حمایت اور سرپرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے مگر اس کا اصل سہارا سنگین ہے۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کو اپنی اس ابتر حالت پر صبر نہ رہا اور انھوں نے نئے حملہ آور کے آگے جبہ سائی سے انکار کر دیا۔ ان کے اندر استعماری اقتدار کے خلاف وہ جس نام سے بھی موسوم تھا اور جس امپریلیسٹ ملک سے بھی تعلق رکھتا تھا،

84664

Marfat.com

بغاوت کا آتش فشاں پھوٹ پڑا جس نے استعمار کی ستمگر قوتوں کو خاکستر کر ڈالا۔ اس کے تظلم و تسلط کو تلپٹ کر دیا اور اس کے ہیبت ناک ساز و سامان کو پھونک ڈالا۔ انھیں پھر سنبھلنے کا چین نہ آیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے نئے حملہ آوروں کو سمندر کی لہروں تک پہنچا کر دم لیا۔ اور اپنے نام نہاد حامیوں اور اوپر سے ٹھونسے ہوئے سرپرستوں اور تمام سامراجی فرمانرواؤں پر عظیم الشان کامیابی حاصل کر لی۔ یہ کامیابی مسلمانوں کی ایمانی قوت اور یقینِ صادق کا کھلا ثبوت تھی، کیونکہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف دشمن نوع بنوع جنگی ساز و سامان، اور آتشیں اسلحہ سے لدا ہوا تھا اور دوسری طرف مسلمان مادی افلاس میں گھرے ہوئے تھے، اسلحہ جنگ اور سامانِ حرب سے بالکل خالی تھے تو ان دونوں کے مقابلے کی کوئی توجیہ ہی نہیں کی جا سکتی۔ معلوم ہوا کہ کامیابی کا اصل سہرا دینی غیرت و حمیت اور اسلامی روح کے سر پر ہے جس سے ملت اسلامی سرشار تھی۔ وہی روح جو ذلت و رسوائی کی زندگی پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتی۔ اور مقامِ عزت کے سوا کسی مقام سے شناسا نہیں۔ وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین۔

سامراج کا فکری استیلاء لیکن عہدِ استعمار کا تصفیہ اور اجنبی تسلط کا اخلاء مکمل طور پر عمل میں نہیں آیا۔ اسلامی معاشرے پر سامراجی لشکروں کے جلو میں مختلف فکری و نظری بیماریاں بھی حملہ آور ہوئیں۔ ان بیماریوں نے قوم کے نوجوان دل و دماغ میں گھر کر لیا اور تعلیم یافتہ عنصر کے فکر و نگاہ میں ڈیرہ ڈال کر انڈے بچے دینے شروع کر دیے۔ اور اب اسلامی ممالک اجنبی تسلط و

Marfat.com

استبداد سے گلو خلاصی کرنے کے باوجود بھی ان بیماریوں سے نجات نہیں پا رہے ہیں۔ یہ بیماریاں وہ باقیات السیئات ہیں جو کوکھ پھیلی ہوئی ہیں۔ نظامِ حکومت میں ان کا غلبہ ہے۔ تعلیم پر یہ چھائی ہوئی ہیں۔ اقتصادیات کی گردن ان کے ہاتھ میں ہے۔ گھریلو زندگی سے لے کر اجتماعی اور بین الاقوامی نظام پر ان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ فرد کی حرکت ہو یا جماعت اور ریاست کی سرگرمی سب پر انہی کی عملداری ہے۔ حاصل یہ کہ ان کی جڑیں گہرائیوں تک اتری ہوئی ہیں اور شاخیں انتہائی بلند و بالا۔ اب خواہ سعی و جہد کا کتنا ہی سرمایہ ان کے ازالہ پر جھونکا جائے ان کا استیصال دشوار نظر آتا ہے الا یہ کہ نژادِ حاضر — جو مغرب و تہذیبِ مغرب کی پکی مومن اور اس کے ماسوا کی پکی کافر ہو چکی ہے — بساطِ عالم سے رخصت ہو جائے۔

شیوۂ مغلوب مغربی تہذیب و ثقافت کی محبت نے موجودہ نسل پر غور و فکر کے تمام دروازے مسدود کر دیے ہیں۔ اور وہ آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر مغربی مظاہرِ حیات کی نقالی کیے جا رہی ہے۔ لیکن اس ناپیدا کنار گرویدگی اور اندھی تقلید کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ "استاذ" کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے جائیں اور تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کر لیا جائے۔ ہمارے ماہرِ اجتماعیات فیلسوفِ اسلام ابنِ خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس امر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ مغلوب غالب کی تقلید کا رسیا کیوں ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں موصوف نے اندلسی مسلمانوں کی اس حالت کی مثالیں بھی بیان کی ہیں جو مغلوبیت اور ذلت کے بعد ان پر طاری ہو گئی تھی۔ موصوف رحمہ اللہ زوالِ اندلس کے

Marfat.com

وقت موجود نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے اسباب و عوامل کی نشاندہی کر کے اس کے زوال کی پیش گوئی کر دی تھی۔ کیا اب اگر یہ کہا جائے تو بے جا ہوگا کہ دنیائے اسلام آج بھی اسی تجربہ سے گزر رہی ہے جس سے اندلس گزر چکا ہے اور یہ بھی انجام کے اسی گڑھے کی نذر ہوگی جس کی نذر اندلس ہو چکا ہے؟

مسلمانوں پر کیا بیتنے والی ہے؟

بے شک آج اسلام کی حالت اندلس سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ لیکن مسلمان اس وقت جس طرح وطن سے نکال پھینکے گئے تھے آج اس طرح اپنے ممالک سے نہیں نکالے جائیں گے ——— اگرچہ المیۂ فلسطین کو دیکھ کر یہ بات بھی زیادہ اطمینان سے نہیں کہی جا سکتی ——— لیکن ان پر جو بیتنے والی ہے، بلکہ بالفعل جو بیت رہی ہے وہ یہ ہے کہ ان کو پناہ گاہ و مذہب سے نکال دیا جائے گا اور جن شعائر و مظاہر کی بدولت وہ دوسروں پر امتیاز رکھتے ہیں وہ ان سے چھین لیے جائیں گے، اور اسلام کا حلقہ ان کے گلے سے آہستہ آہستہ سرکا لیا جائے گا۔ ان کے ہاتھ کوئی چیز نہیں رہ جائے گی بجز ان تنگ نظر قومیتوں کے جن کے خمیر میں اتحاد سے زیادہ افتراق کا عنصر ملا ہوا ہے۔ انہی قومیتوں کی شیرازہ اندازیوں سے وہ ایک دوسرے کے ——— غیروں کی مدد سے یا اپنے ہی بل بوتے پر ——— گلے کاٹنے لگیں گے۔ لیکن اس کے بعد وہ کسی شمار و قطار میں نہیں رہیں گے۔ اور اگرچہ ان کی سرزمین سے سامراج کی بساط لپیٹ چکی ہے لیکن ہائیں ہمہ اس کا جوا ان کی گردنوں پر باقی رہے گا۔

مغربی نظریاتِ حکومت کا جادو

سامراجی بیماریوں میں سے سب سے

Marfat.com

پہلے جس بیماری نے مسلمانوں کے فکر و نگاہ پر یلغار کی ہے وہ نیشنلزم ہے۔ اس بیماری کے اثرات اس وقت نمایاں ہوئے جب اسلامی ممالک نے استعمار کی سیاسی گرفت سے نجات حاصل کر لی۔ اور یہ نجات دینی جذبات و احساسات کی بدولت حاصل ہوئی نہ کہ نیشنلزم کی کرامت سے۔ اس حقیقت سے خود ترکی کا انقلاب بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اور ان کے سامنے نظامِ حکومت کا مسئلہ درپیش ہوا تو مغربی نظامہائے حکومت کا طلسم ہوشربا آگے بڑھا اور نیشنلزم کے ڈسے ہوئے مسلمانوں کے فکر و نگاہ کو مسحور کر گیا۔ چنانچہ کوئی ڈیموکریسی کا دلدادہ بن گیا۔ کسی کو سوشلزم خیرہ کر گئی، کسی کو کمیونزم کی پری نے اپنے شیشے میں اتار لیا اور کوئی ابھی مرحلۂ انتخاب میں ہے۔ رہا اسلامی نظامِ حکومت تو اسے کسی رہنما اور کسی لیڈر کے حاشیۂ خیال تک میں بھی شرفِ باریابی نہ مل سکا۔ اور اب نام نہاد مسلمان خود نظریۂ اسلام اور دستورِ قرآن کے چہرے کو بھی داغدار کر رہے ہیں اور اسے بھی درآمد شدہ اصطلاحات کا جامہ پہنانا شروع کر دیا ہے۔ ایک صاحب "اسلامی ڈیموکریسی" کا ذکر کر رہے ہیں، دوسرے "اسلامی سوشلزم" کا انکشاف کر رہے ہیں۔ اور وہ دن بھی آیا چاہتا ہے کہ ہمارے کان "اسلامی کمیونزم" کا چرچا بھی سننے لگیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر خود مغربی ڈیموکریسی اور اس کے مختلف اسکولز آف تھاٹ کو اسلام سے مشابہت دی جاتی تو یہ بھی اسلام پر بہت بڑی بہتان تراشی ہوتی۔ کجا کہ وہ نظامِ حکومت جو اعلیٰ اقدار و برتر خصوصیات میں یکتائے عالم ہے اسے ڈیموکریسی اور سوشلزم وغیرہ سے تشبیہ دی جائے۔ قیاس کیجیے جس نظامِ حکومت "رشوت" کے سوا کوئی ضمیر نہ ہو اور مصنوعی انسانی امتیازات کے سوا

Marfat.com

کوئی قانون نہ ہو کتنا بڑا جرم ہوگا کہ اُس کا ایسے نظام سے موازنہ کیا جائے جو صہیبؓ، بلالؓ اور سلمانؓ کو ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کے برابر کھڑا کرتا ہو۔

یورپ کی عاجزانہ نقالی ایک قدم آگے بڑھیے، پورے عالم اسلامی میں جب اسلامی نظامِ حکومت کے لیے دروازے بند کر دیے گئے، تو اب ہمارے بھائیوں کو ملک کے لیے فوجداری و دیوانی قوانین کی احتیاج لاحق ہوئی۔ چنانچہ انھیں اس میں کوئی تردد نہ ہوا، فوراً لپکے اور مغرب کے قوانین سے اور مغرب کے مجلّہ ہائے احکام سے اخذ و اقتباس شروع کر دیا۔ بلکہ لفظ بلفظ نقل مارنے لگے — کیونکہ جیسا کہ میں پہلے گزارش کر آیا ہوں، کم کوشی اور بے بسی نے ان کے اندر اخذ و اقتباس کی اہلیت بھی باقی نہیں رہنے دی۔ انھیں صرف مکھی پر مکھی مارنا آتا تھا۔ اور نوبت تقلید بایں جا رسید کہ وہی حاکم جو پہلے، اللہ کے نام سے فرمان صادر کرتا تھا، اب غیر اللہ کے نام سے صادر کرنے لگا — کیوں؟ اس لیے کہ استاذ مغرب نے اپنے قوانین سے دین و عقیدہ اور سماوی شریعت کو فارغ خطی دے دی ہے۔ نقال ..... کیوں نہ ایسا کرتا! — صرف ایک "الجھن" اس دستبرد سے محفوظ رہ گئی۔ یہ پرسنل لاء کی الجھن ہے۔ غیر ملکی حکمران نے پرسنل لاء کو (اپنے مصالح کے پیشِ نظر) درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس لیے اس کی تدوین و ترتیب میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ بیچارے مسلمانوں کو یہ کوہ کنی خود ہی کرنی پڑی، اور پرسنل لاء کی ترتیب و تبویب کا فرض خود ہی انجام دینا پڑا۔ اور یہی وہ خدمت ہے جس پر مسلمان جماعتیں باہر ہو گئے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں "ہم نے اسلامی قانون کے اندر عظیم ترین اصلاحات

Marfat.com

کی ہیں ..... اور یہ بیچاری مسلمان عورت، جس کے حقوق چھن چکے تھے اور جس کی آبرو کو بٹہ لگ چکا تھا، ہم نے اسے عدل و انصاف سے بہرہ مند کیا ہے۔"

ترقیٔ نسواں کا دعویٰ اور اس کی حقیقت تسلیم کہ مسلمان عورت کے حقوق چھین لیے گئے تھے اور اس کی آبرو کو بٹہ لگ چکا تھا لیکن کب؟ جب آپ کی عدل گستری اور انصاف پروری کا سایہ اس پر پڑا! - وہ وقت بھی تھا کہ بلادِ اسلامیہ میں کوئی مظلوم بیوہ نہ ملتی تھی اور کوئی دوشیزہ حرماں نصیبی کی زندگی نہ گذار رہی تھی اور (آپ کی "اصلاحات" کے بعد) یہ وقت بھی ہے کہ ممالکِ اسلامیہ نظرِ فریبِ تہذیب کے علم بردار ممالک کے اسوہ میں ایسی عورتوں سے بھرے پڑے ہیں جو خاوندوں کی سرپرستی سے محروم ہیں۔ پہلے دوشیزہ کی جستجو ہوتی تھی اور آج دوشیزہ خود خاوند کی جستجو میں ماری ماری پھرتی ہے۔ پہلے پاکیزگی اور طہارت اسلامی معاشرے کا شعار تھے، آج فسق و فجور اور ازدواجی خیانت اس کی طبیعتِ ثانیہ بن چکے ہیں۔ مسلمان خاتون ——— جو کبھی تازہ اچھوتے تنگوفے کی مانند تھی۔ جس کی طرف مجرمانہ ہاتھ تو کجا، نگاہِ بد تک اٹھائی نہیں جا سکتی تھی ——— اب مجالسِ فسق اور رقص پارٹیوں کی روحِ رونق بنی ہوئی ہے۔ جب باہر نکلتی ہے تو ساق و سینہ کی عریانی دعوتِ نظارہ دے رہی ہوتی ہے۔ جسم کے فتنہ انگیز حصے بھڑک رہے ہوتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم اور اسلام کے راستے سے کھلم کھلا انحراف ہوتا ہے اور آڑے لی جاتی ہے شخصی آزادی کی، ترقی و بیداری کی اور ترکِ حجاب کی، درآنحالیکہ حجاب شہری عورتوں کی

Marfat.com

عام عادت میں داخل تھا جسے انھوں نے شر و فتنہ سے بچاؤ کے لیے بطور سپر اختیار کیا ہوا تھا اور ایک غیر شناسا لباس ہوتا تھا جسے شریف خواتین قضائے حاجت کے وقت شر پسندوں اور چھچھوروں کے تعرض سے محفوظ رہنے کے لیے پہننے پر مجبور ہوتی تھیں۔ لیکن یہ عریانی و نمائش، یہ بدکاریاں اور یہ مرد اور عورت کا باہوں میں باہیں ڈال کر چلنا، یہ رقص و سرود کی روادار نہ شریعتِ اسلام ہے اور نہ قانونِ اخلاق۔

دینی تعلیم کی زبوں حالی تعلیم کے میدان میں کیا ہو رہا ہے؟ — لادینیت تعلیم کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں گھس چکی ہے۔ اور ہم دینی تعلیم کو دنیوی تعلیم کے اندر تحلیل کرنے کے لیے سب انسانوں سے زیادہ بیتاب ہیں۔ اور دنیوی تعلیم کا یہ حال ہے کہ دین کے نظری اور عملی اصول تربیت سے بالکل لے حظ ہو چکی ہے۔ دینی تعلیم کے ادارے جن دنوں سامراجی بغض کا ہدف بنے ہوئے تھے، انھیں روحِ آزادی پھونکنے والے خیالات کے قلعے اور زبان و ادب کے آشیانے سمجھا جاتا تھا، وہی آج ان مکم کوشوں اور کوتاہ ہمتوں کی نگاہ میں غداری کے گڑھ اور قدامت پرستی کی پناہ گاہیں قرار پا چکے ہیں۔ ان کے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا تمسخر اڑاتے ہیں اور ان کے وابستگان کی ہر موقع و مناسبت سے پگڑی اچھالی جاتی ہے۔

سود اور دیگر محرمات کا عام چلن اقتصادی اور مالیاتی نظام کے بارے میں تو دنیائے اسلام نے مغربی نظریات کی پیروی کی قسم اٹھا رکھی ہے۔ اور خاص طور پر ان سرمایہ دار آبادیوں کی تقلید کی جا رہی ہے جن کی بیخ در بیخ احتکار، استحصالِ ند

Marfat.com

اور شرمناک معاشی لوٹ کھسوٹ پر قائم ہے اور تمام تر بوجھ پسماندہ طبقات اور صارفین کی گردنوں پر ہے اور سودی کاروبار کے ذریعے، قمار خانوں کے لیے لائسنس جاری کر کے اور "پاکیزہ" و "غیر پاکیزہ" تفریح گاہیں قائم کر کے دولت جمع کی جاتی ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود یورپ کے مشرقی ممالک میں سود کاری ممنوع ہے۔ بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں قمار بازی ناجائز ہے، اور امریکہ میں تو ہوور کے عہدِ صدارت میں شراب بھی ممنوع قرار دے دی گئی تھی اور اس کے بعد اس ممانعت کو جن اسباب کی بنا پر ختم کیا گیا ہے ان کا تعلق نظریۂ تحریم سے نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں اگر کوئی قانون ساز جرأت کر کے مے نوشی کی ممانعت کے لیے بعض شرعی احکام طے بھی کر دے تو مسلمانوں کو مے فروشی سے روک دینا اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ حالانکہ شارع علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ان اللہ اذا حرم شیئاً حرم ثمنہ (جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو حرام ٹھیرا دیتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام ٹھیرا دیتا ہے)۔ بات اتنی ہی نہیں، بلکہ ملک کے اندر یا باہر جب کبھی کسی پارٹی کا اہتمام کیا جاتا ہے تو اس کا سب سے بڑا عنصر شراب ہوتی ہے۔ اسلام خواہ اپنی کتنی ہی ناک رگڑتا رہے مگر یہ لوگ (مقلدینِ مغرب) اہلِ کفر کی خوشنودی کے لیے ـــ استغفر اللہ! ـــ بلکہ اپنی بدترین نفسانی خواہش کی تسکین اور آتش بلانوشی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے شاملِ تفریح کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرے ایک دوست م۔ کو بی۔ نے، جو ہالینڈ کے مسلمان ہیں، مجھے بتایا کہ ہالینڈ کے دارالحکومت میں ایک بار وہاں کے مسلمانوں نے ایک مسلمان سفارت خانے میں شراب .....

Marfat.com

کا دَور چلتے دیکھا تو اس پر اعتراض کیا۔ سفارت خانے کی طرف سے انھیں یہ جواب دیا گیا کہ شراب کا اہتمام غیر مسلم شرکاء محفل کی خاطر داری کے لیے کرنا پڑتا ہے"۔ مسلمانوں نے کہا "آخر اسرائیلی سفارت خانہ اپنی پارٹیوں میں خنزیر کا گوشت کیوں نہیں پیش کرتا، کیا وہ دوسروں کی خاطر داری سے نابلد ہے؟ بلکہ خود غیر مسلموں کو جس قدر ان کا پاسِ خاطر ہے تمھارا ان سے زیادہ نہیں ہے"۔

اصلاح کے راستہ کے پتھر یہ ہے وہ روگ جو دورِ حاضر نے اسلام کو دیا ہے۔ اور اس روگ سے اسلام کے افاقہ کی اس وقت تک کوئی امید نہیں کی جا سکتی جب تک دنیائے اسلام میں بست و کشاد کی کنجیاں۔ اسلام اور مسلمانوں سے "اجنبی" نسل کے ہاتھ میں رہیں گی اور یہ بدطینت دم چھلے چھائے رہیں گے جنھیں خود اعدائے اسلام نے پال پوس کر رکھا ہوا تھا تاکہ خطرات کے موقع پر ان کو ڈھال بنا کر اپنی مدافعت کر سکیں۔ اور آج اسلام کا مسخ یہی ہے کہ اس کے اصولوں کا غلط تصوّر قائم کر لیا گیا ہے اور اس کے چند احکام کا ادھورا نفاذ کر کے بعض نام نہاد مسلمان اہلِ ایمان کے گروہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اسلام پسند مصلحین اور مجدّدین کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

موجودہ بگاڑ کی اہمیّت اور دعوتِ جہاد ماضی میں تو مسلمان پیش آمدہ خطرات کو فوراً بھانپ جاتے تھے اور یکمشت ہو کر اُن کا سدِّباب کر دیتے تھے۔ لیکن اب شیطان نے تلبیس کی ایسی چال چلی ہوئی ہے کہ وہ چیزوں کو غلط لیبل لگا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور شیطان کا ایجنٹ۔ انارکسٹ گروہ مسلمانوں کے اندر اپنے مکر و فن کے جال پھیلائے ہوئے ہے۔ ان کے اخلاق

Marfat.com

کو لگاڑ رہا ہے اور ان کی ہمتوں کو پست کر رہا ہے۔ چنانچہ اب مسلمانوں کی اکثریت بندگیٔ نفس میں مبتلا ہو چکی ہے اور وہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جو اس کی ہوس کی تائید نہ کرتی ہو۔ اسی کمزور پہلو نے انھیں گرفتارِ معصیت کر رکھا ہے۔ ورنہ اگر یہ حوصلوں کے مضبوط ہوتے تو شیطان کے جال اور ملحدین کے پروپگنڈے کا شکار نہ ہو جاتے۔ حالات اب نزاکت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کو سنبھالنے کے لیے مؤثر اقدام کرنا چاہیے۔ دینی رہنماؤں اور داعیوں کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو سر پر منڈلانے والے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے اپنی فوج کو منظم کریں اور لاگ لپیٹ رکھے بغیر لوگوں پر واضح کر دیں کہ جس روش پر اب وہ چل رہے ہیں وہ اسلام سے ہٹی ہوئی ہے۔ اور اگر وہ فی الواقع دین کی رسی کو تھامنے کا پختہ عزم رکھتے ہیں تو اپنے سلف صالحین کی جانب رجوع کریں، اور اپنی خواہشاتِ نفس کو تج کر از سرِ نو امانتِ اسلام کا بار اٹھانے کی تیاری کریں، اس راہ میں ان تمام چیزوں سے دستبردار ہونا پڑے گا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اور اسلام کی شوکتِ رفتہ کو زندہ کرنے اور اللہ کا بول بالا کرنے کی نیت سے انھیں مال و جان کی بازی لگا دینا ہو گی ـــــ اور اُس دن انھیں یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے وطن کی آزادی اور اپنی قوم کی نجات پر فخر کر سکیں۔

ویومئذ یفرح المؤمنون بنصر اللہ۔

(ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۶۰ء)

Marfat.com

باب اوّل:

فقہ و قانون

ــــــ محمد عبدالرحیم غنیمہ،
مراکش

ــــــ شیخ محمد الخضری بک،
سابق ڈائرکٹر تعلیمات، مصر

ــــــ ڈاکٹر معروف دوالیبی،
وزیرِ اعظم جمہوریہ، شام

ــــــ امام ابنِ قیم رحمہ اللہ،
تلمیذِ جلیل امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ

ــــــ پروفیسر شیخ محمد ابوزہرہ،
پروفیسر قانونِ اسلامی۔ قاہرہ یونیورسٹی، مصر

Marfat.com

عبدالرحیم غنیمہ :

مغربِ عربی (مراکش) کے صاحبِ تحقیق عالم ہیں۔ مصری یونیورسٹیوں میں علوم و فنون کی تکمیل کی ہے۔ قدیم اسلامی علوم اور جدید سائنسی علوم کا مجمع ہیں۔ یہ خصوصیت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بایں ہمہ موصوف نہایت معتدل فکر اور متوازن مزاج رکھتے ہیں۔ جدید کی اہمیت اور قدیم کی ضرورت کے قائل ہیں۔ مالکی مسلک رکھتے ہیں۔ مگر تحقیق و مطالعہ نے "ھمہ از وست" کے نظریہ کا حامی بنا دیا ہے۔

عبداللہ کنون کے دینی ماہنامہ "لسان الدین" (تطوان) میں ان کی اکثر تحقیقی کاوشیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس رسالہ کے صفحات پر وہی اہلِ قلم جگہ پا سکے ہیں جو جدید فکری رو کے غلط اثرات کے انسداد کی صلاحیت اور فرانسیسی استعمار سے کشمکش کا دم داعیہ رکھتے تھے۔ اسلامی فقہ اور تاریخ پر ان کی متعدد تحقیقات مصر اور مغرب عربی میں شائع ہو چکی ہے۔ ان کی سب سے عمدہ اور پُر شکوہ تصنیف ..... "تاریخ الجامعات الاسلامیہ الکبریٰ" (بڑی بڑی اسلامی یونیورسٹیاں) ہے۔ اس میں انھوں نے اسلام کے دورِ اوّل سے لے کر عہدِ حاضر تک

Marfat.com

ملّتِ اسلامی کی تعلیمی خدمات کا مفصّل جائزہ لیا ہے ۔ یہ کتاب تعاون
کے سرکاری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (معہد مولائے حسن) سے سنہ ۱۹۵۲ء
کا انعام حاصل کر چکی ہے۔ ثالثی کمیٹی نے جتنے کم عرصے میں اور جس اتفاق
کے ساتھ اس کتاب کو منظور کیا ہے انسٹی ٹیوٹ کی تاریخ کی واحد مثال
ہے۔"

Marfat.com

Marfat.com

فقہ اسلامی کے ابتدائی ادوار

فقہ صدرِ اوّل میں جب تک رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما رہے مسلمانوں کے لیے پیش آمدہ مسائل و مشکلات کے سلسلے میں آپ ہی کی ذات قدسی صفات مرجع و ماویٰ رہی۔ زندگی کے مختلف معاملات و مواقع پر مسلمانوں کو جو اُلجھن لاحق ہوتی اور ان میں شریعت کی رائے دریافت کرنا مطلوب ہوتی، تو وہ فوراً بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے اور استفسارات کی صورت میں آپ سے رہنمائی اور حلت و حرمت کی حدود سے آگاہی حاصل کرتے اور دین کے احکام و مقاصد کو سیکھتے۔ آپؐ کے وصال کے بعد جب خلفائے راشدین کا دَور.... (۱۱ھ ـــ ۴۰ھ) آیا تو نئے نئے مسائل کے بارے میں شرعی حکم لگانے، فتاویٰ جاری کرنے اور کتاب و سنّت کی تعلیم دینے کا منصب قدرتی طور پر کبار صحابہ کی طرف منتقل ہو گیا اور بالخصوص اس مسند کے مستحق وہ لوگ قرار پائے جو کتاب اللہ کے حافظ تھے۔ ابن خلدون کے الفاظ میں:

"صحابہ کی پوری جماعت اہلِ فتویٰ نہ تھی، اور نہ شرعی و دینی امور میں سب کو مرجعیت حاصل تھی، بلکہ افتاء کا منصب صرف حفّاظ

Marfat.com

(حاملینِ قرآن) کے لیے مخصوص تھا۔ اس گروہ کو قرآن کے ناسخ و منسوخ محکم و متشابہ اور جملہ دلالات و علل پر گہری نظر حاصل تھی۔ کیونکہ اس نے براہِ راست چشمۂ رسالت سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ یا اجلّۂ صحابہ سے قرآن کی روشنی اخذ کی تھی۔ اس گروہ کو قرّاء کے لقب سے پکارا جاتا تھا یعنی قرآن پڑھنے والے۔ عرب چونکہ ان پڑھ قوم تھی، پڑھے لکھے افراد انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، اس لیے قرآن کو پڑھنے والے نادر الوجود ہونے کی وجہ سے ناخواندہ قوم میں قرّاء کہلاتے تھے۔ دورِ اوّل تک تو اس گروہ کے لیے قرّاء کا لقب متداول رہا۔ البتہ جب اسلامی سلطنت کی حدود دور دور تک پھیل گئیں۔ کتب و سنّت کے چرچے نے عرب سے ناخواندگی اور جہالت کی تاریکی کافور کر دی، قریہ قریہ اجتہاد و استنباط کی مجلسوں سے نغمہ ریز ہو گیا، فقہ نہ صرف پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی، بلکہ اُسے ایک "فن" کی حیثیت حاصل ہو گئی تو قرّاء کے بجائے ایسے لوگوں کو علماء اور فقہاء کے نام سے پکارا جانے لگا۔[1]

فتویٰ دینے میں بھی صحابہؓ کے تین طبقے کیے جا سکتے ہیں۔ ایک طبقہ مکثرین کا ہے جس سے بکثرت فتاویٰ منقول ہیں، اور دوسرا مقلّین کا ہے، جس سے بہت کم تعداد میں فتاویٰ مروی ہیں، اور تیسرا طبقہ متوسطین کا ہے، اس طبقے سے فتاویٰ کثرت سے منقول نہیں ہیں البتہ ایک معتدبہ تعداد اس طبقے سے ہم

---

[1] مقدمہ ابنِ خلدون: ص ۴۴۵ و ۴۴۶۔ مطبع مصطفےٰ محمد، قاہرہ

Marfat.com

تک پہنچی ہے۔ مجموعی طور پر اہلِ فتویٰ صحابہ کی تعداد ایک سو تیس (۱۳۰) سے کچھ اوپر ہے۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ مکثرین کی کل تعداد سات ہے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) عمر بن خطابؓ (۲) علی بن ابی طالبؓ (۳) عبداللہ بن مسعودؓ (۴) ام المومنین عائشہؓ (۵) زید بن ثابتؓ (۶) عبداللہ بن عباسؓ (۷) عبداللہ بن عمرؓ۔

طبقۂ متوسطین میں جن کو شمار کیا جاتا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) ابوبکر صدیقؓ (۲) ام سلمہؓ (۳) انس بن مالکؓ (۴) ابوسعید الخدریؓ (۵) ابوہریرہؓ (۶) عثمان بن عفانؓ (۷) سعد بن ابی وقاصؓ (۸) سلمان فارسیؓ (۹) جابر بن عبداللہؓ (۱۰) معاذ بن جبلؓ (۱۱) طلحہؓ (۱۲) زبیرؓ (۱۳) عبدالرحمٰن ابن عوفؓ (۱۴) عمران بن حصینؓ (۱۵) ابوبکرہؓ (۱۶) عبادہ بن الصامتؓ (۱۷) معاویہ بن ابی سفیانؓ۔

مذکورۂ بالا حضرات (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے علاوہ صحابہ کی جتنی تعداد ہے وہ طبقۂ ثالثہ (مقلین) میں شامل ہے۔ ان سے بہت کم مسائل میں فتاویٰ ماثور ہیں۔ حتیٰ کہ کسی سے صرف ایک اور کسی سے دو یا دو سے کچھ اوپر فتاوے روایت کیے گئے ہیں[1]۔

---

[1] اعلام الموقعین، ابن القیمؒ: ج اول ص ۵۸

Marfat.com

فقہ دورِ اموی میں سنہ ۴۰ھ سے لے کر سنہ ۱۳۲ھ تک بنی امیہ کا زمانہ ہے۔ اس عہد میں رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جانشینی تابعین کو حاصل ہو رہی تھی جو امورِ دین اور فقہ میں اپنے شیوخ صحابہ کے رہینِ منت تھے۔ تابعین کے مختلف گروہ مختلف صحابہ کے حلقۂ تلمذ میں داخل تھے۔ ان میں سے ہر گروہ نے اپنی اپنی جگہ کسی ایک صحابی کی فقہی و شرعی آراء کی اتباع کو مخصوص کر لیا۔ مثلاً اہلِ مدینہ تمام تر عبداللہ بن عمرؓ سے استفادہ کرتے تھے، اہلِ کوفہ نے اپنے آپ کو عبداللہ بن مسعودؓ کے فتووں کا مدارِ علیہ بنا لیا تھا، عبداللہ بن عباسؓ اہلِ مکہ کے پیشوا تھے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اہلِ مصر کے لیے ہر قول و عمل میں مرجع تھے[1]۔

اصحابِ رسولؐ کا، جنھوں نے بلاواسطہ شمعِ نبوت سے نورِ دین اور فیضِ بصیرت اخذ کیا تھا، دنیا سے اٹھ جانا ملتِ اسلامی کے لیے ایک بہت بڑا نقصان اور علم و فقہ کی دنیا میں ناقابلِ تلافی خسارہ تھا۔ مگر حکمتِ الٰہی نے اپنے دین کو تا قیامِ قیامت زندہ و برقرار رکھنے کے لیے اس کا ایسا عمدہ انتظام فرمایا کہ صحابہ جب ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے تو علمی و فقہی مسندوں پر تابعین میں سے نوابغِ فقہاء و علماء ان پر متمکن ہوتے گئے اور صحابہ کے پیدا کردہ خلاء کو پوری توجہ اور کوشش کے ساتھ پُر کرتے گئے ــــ جلیل القدر تابعین کی فہرست میں جو لوگ داخل ہیں، ان میں سے ایک

---

[1] نظرۃ تاریخیۃ فی حدوث المذاہب الاربعۃ، از احمد تیمور پاشا مصری ص ۶۔

Marfat.com

ابو محمد سعید بن مسیبؓ (وفات ۹۱ - اور ۹۴ھ کے درمیان ہوئی ہے) ہیں، جو اہلِ مدینہ کے لیے مشعلِ راہ قرار پائے۔ اور دوسرے ابو محمد عطاء بن ابی رباحؓ ہیں جو اہلِ مکہ کے مفتی تھے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ تابعین و تبع تابعین اور بعد کے فقہاء کی اکثریت اہلِ عجم اور موالی پر مشتمل تھی۔ خالص عرب ان میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ ابنِ قیم عبدالرحمٰن بن ابی زید سے یہ روایت نقل کرتے ہیں:

"عبادلہ ثلاثہ (عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاص) کی رحلت کے بعد تمام شہروں میں فقہ و اجتہاد کی مسندوں پر موالی اور اعاجم متمکن ہو گئے، چنانچہ مکہ کی درسگاہِ فقہ پر عطاء بن ابی رباح فائز ہوئے، اہلِ یمن کے لیے طاؤس امامِ فقہ قرار پائے۔ یمامہ والوں نے یحییٰ بن ابی کثیر کو اپنا پیشوا تسلیم کر لیا، کوفہ میں ابراہیم نخعیؒ اور بصرہ میں حسن بصریؒ عوام کے مرجع و امام ملنے گئے۔ اسی طرح شام میں مکحول اور خراسان میں عطاء خراسانی پیشوائے دین اور ترجمانِ شرع تسلیم کیے گئے، صرف ہادیٔ اعظمؐ کا شہر — مدینہ — ایک ایسا مقام تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک قریشی عرب کے لیے مخصوص کر لیا۔ اور وہ تھے حضرت سعید بن مسیب جو بلا اختلاف مدینہ والوں کے لیے امام الفقہ تھے۔"[1]

---

[1] اعلام الموقعین جلد اول ص ۸۔

Marfat.com

ان جلیل القدر فقہاء کا وجود دراصل ائمۂ مذاہب کے ظہور کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کیونکہ ان فقہائے تابعین نے استنباط و استخراج کی جو طرح ڈالی اور مختلف حلقہ ہائے فقہ قائم کیے۔ آگے چل کر ائمۂ مذاہب نے اسی چیز کو مزید ارتقاء بخشا اور فقہ و اجتہاد کی مختلف امامتیں روبکار آگئیں۔ ہر علاقے میں ایک امام پیدا ہو گیا۔ ان تمام ائمۂ مذاہب میں سے اکثریت عہد بنی امیہ کے اواخر اور عہدِ عباسیہ کے اوائل تک بزم فقاہت و بصیرت کی چشم و چراغ رہی۔ دولتِ عباسیہ کا قیام اتفاق سے ایسے زمانے میں ہوا جب کہ علمی و فقہی تحریک شباب پر آگئی اور فنون و آداب کو اقتدار حاصل ہو گیا۔ چنانچہ دورِ بنی امیہ کی نسبت اس دور میں فقہاء کے اثرات زیادہ گہرے اور نتیجہ خیز رہے ہیں۔

فقہ عصرِ عباسی میں عصرِ عباسی نے جن فقہی مذاہب کا عروج دیکھا ہے وہ یہ ہیں:

عراق میں امام ابو حنیفہ اور امام ثوری رحمہما اللہ کا مذہب جاری ہو گیا، شام اور اندلس کی سرزمین پر امام اوزاعی کے مسلک کی حکمرانی رہی، مدینۂ مبارکہ امام مالک کی فقہ کے زیرِ نگیں تھا۔ مصر میں لیث بن سعد اور امام شافعی کے مسلک کا غلغلہ تھا، بعد کے زمانے میں محمد بن جریر طبری، داؤد ظاہری اور احمد بن حنبل کے مسلک کا بھی وہاں چرچا رہا۔ ان تمام مذہبی سرگرمیوں میں ثوری، اوزاعی، لیث، طبری اور داؤد ظاہری کے مذاہب زیادہ مدت قائم نہ رہ سکے، بلکہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد دنیا سے ناپید ہو گئے۔ اور مذاہبِ اربعہ: حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی پر زمانے نے نقشِ دوام ثبت

Marfat.com

کر دیا۔

معدوم مذاہب | ان مذاہبِ اربعہ کے ظہور و وسعت پذیری پر گفتگو کرنے سے قبل ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مختصر طور پر ناپید شدہ مذاہب پر بھی روشنی ڈالیں :

مذہب ثوری | مذہبِ ثوری کے بانی ابوعبداللہ سفیان ثوری ہیں، کوفہ میں رہتے تھے۔ اجتہاد و استنباط میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ امام مالک اور امام اوزاعی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر چکے ہیں۔ اپنے دادا ثور بن عبد مناف کی نسبت سے ثوری کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سرکاری مناصب اور عہدوں سے اپنے دامن کو تادمِ آخر ملوث نہیں ہونے دیا۔ ان کے بارے میں آتا ہے کہ ایک بار عباسی خلیفہ مہدی نے انھیں کوفہ کی قضا سنبھال لینے کا فرمان جاری کیا۔ امام ثوریؒ کو جب فرمان ملا تو وہ اٹھے اور دجلہ کے کنارے پہنچ کر اس کو غرقاب کر دیا۔ اس ایک مثال سے ان کی شانِ استغناء اور جرأت و حوصلہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی۔[1]

مذہب اوزاعی | اس مذہب کے علمبردار امام اوزاعی کا پورا نام ابوعمرو عبدالرحمٰن بن عمر بن محمد ہے۔ دمشق کے بابِ فرادیس کے باہر اوزاع نامی ایک بستی ہے۔ آپ وہیں کے رہنے والے ہیں[2]، اور اسی نسبت

---

[1] محاسن المساعی ص ۵۲ | [2] ایضاً ص ۴۶، ۴۷

Marfat.com

سے اوزاعی کہلاتے ہیں، حق پر ثابت قدمی اور صبر و تحمل میں ضرب المثل رہے ہیں۔ روزمرہ کے مسائل و احکام میں غیر معمولی درک و اہتمام تھا۔ یہاں تک کہ امام مالک رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: انہ یصلح للامامۃ (یہ پیشوائی کے مستحق ہیں)۔ امام اوزاعی ملکی سیاست میں باقاعدہ حصہ لیتے تھے۔ حکمرانوں اور خلفاء اور گورنروں پر متواتر نکتہ چینی کرتے رہتے اور انھیں راہ راست پر چلنے کی تلقین کرتے نہ رہتے۔ اگر مفادِ امت کے خلاف، یا عدل و انصاف کے منافی ان کی سرگرمیوں کو دیکھتے تو نہایت سختی سے ان کا نوٹس لیتے۔ ان کی ایسی حرکتوں کو عامۃ الناس کے علم میں لاتے۔[1] امام رحمہ اللہ کی وفات ۱۵۷ھ میں ہوئی اور صحیح روایت کے مطابق بیروت میں ان کا مدفن ہے۔[2] آغازِ کار میں تو ان کا مذہب شام میں پھیلا، مگر بعد میں جب اندلس کا علاقہ اسلامی فتوحات میں شامل ہوا تو اہلِ شام ہی کے ہاتھوں وہاں بھی اوزاعی مذہب کو فروغ حاصل ہو گیا اور کچھ مدت تک اسی کا دور دورہ رہا۔ مگر جب تیسرا اموی حکمران، حکم بن ہشام بن عبدالرحمن الداخل سریر آرائے سلطنت ہوا، تو امام اوزاعی کا مذہب ختم ہو گیا اور اس کے بجائے امام مالکؒ کے مذہب کو فروغ حاصل ہوا۔[3]

مذہب لیث بن سعد | مالکی اور شافعی مذہب کے داخلے سے پہلے اہلِ مصر کی مسندِ امامت پر امام لیث بن سعد بن عبدالرحمن فائز تھے۔ ان کے آباؤ اجداد اصفہان (فارس) کے رہنے والے تھے۔ یہ خود مصر کے ایک گاؤں قلقشندہ میں پیدا ہوئے۔

---

[1] محاسن المساعی ص ۱۱ [2] ایضاً ص ۱۲۴، ۱۶۰ [3] ایضاً ص ۱۱

Marfat.com

امام سیوطی کے قول کے مطابق ان کی ولادت ۹۴ھ میں ہوئی ہے۔ لیث بن سعد کے متعلق امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ "لیث کا درجہ فقاہت میں امام مالکؒ سے بھی بلند ہے، مگر لیث کے متبعین نے ان کے مذہب کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔" یعنی انھوں نے اس کی تدوین و ترویج پر کوئی اعتناء نہیں کیا۔ اُسے بے سہارا چھوڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا سے یکسر ملیامیٹ ہو گیا۔[1]

مذہب ظاہری مذہب ظاہری کے پیشوا ابوسلیمان داؤد بن علی بن خلف... اصفہانی ہیں۔ کوفہ میں ۲۰۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ پہلے یہ متعصب شافعی تھے مگر بعد میں انھوں نے اپنے لیے ایک مخصوص مسلک وضع کیا۔ اس مسلک کی بنیاد یہ تھی کہ کتاب و سنت کے ظاہر پر عمل کیا جائے، جب تک خود کتاب و سنت سے یا اجماع سے کوئی ایسی دلیل مہیا نہ ہو۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ یہاں ظاہری حکم مراد نہیں ہے، ظاہری حکم پر عمل کو ترک نہ کیا جائے۔ جہاں عملی نص نہ ملے وہاں اجماع کو اختیار کیا جائے۔ قیاس و استنباط کو امامِ ظاہریہ درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کا قول ہے کہ کتاب و سنت کی نصوص کی عمومات میں ہر مسئلہ کا جواب موجود ہے۔ داؤد الظاہری نے اپنے اس مذہب کو برحق ثابت کرنے کے لیے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ جن میں ابطال التقلید، ابطال القیاس، الخصوص والعموم، المفسر والمجمل زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بکثرت کتابیں

---

[1] ابن خلکان جلد اوّل ص ۲۸۴۔

Marfat.com

ہیں[1]۔

ظاہری مذہب کو سلطنتِ عباسیہ کے مشرقی علاقوں میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ بالخصوص فارس کے علاقہ میں اس کے ماننے والوں کی کثیر تعداد رہتی تھی، اور وہاں مذہبِ شافعی سے اس کا خاصہ مقابلہ ٹھنا رہتا تھا۔ اور اسے ہر مقام پر غلبہ حاصل رہتا تھا[2]۔ امام داؤد کا انتقال ۲۷۰ھ میں بغداد میں ہوا۔ اس مذہب کے جلیل القدر پیروؤں میں سے ایک ابنِ حزم اندلسی بھی ہیں۔ جو اپنے غیر معمولی علم و فضل کی وجہ سے مذہبِ ظاہری کو رونق و ترقی دینے کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ عہدِ موحدین میں مغرب (شمالی افریقہ) میں فرقۂ حزمیہ کے نام سے ان کے متبعین کی جماعت کافی نامور رہی ہے۔ ابنِ حزم کی فقہ ظاہری پر کتاب "المحلّٰی" فقہی لٹریچر میں بہت بلند مقام رکھتی ہے۔

مذہب طبری | محمد بن جریر طبری نہ صرف فقہ میں ایک مستقل مذہب کے مالک ہیں، بلکہ تاریخ و تفسیر کے میدان میں بھی ان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے، تاریخ طبری اور تفسیر ابنِ جریر انہی کے رشحاتِ علم و فکر کی یادگاریں ہیں۔ امام داؤد الظاہری کی طرح پہلے یہ بھی شافعی المسلک تھے۔ پھر انھوں نے ایک مستقل بالذات مسلک اختیار کر لیا۔ اور اس پر متعدد تصانیف بھی لکھیں جن میں "لطیف القول"، "الخفیف" اور "البسیط" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فقہ کے موضوع پر ان کی ایک نہایت اہم کتاب: "اختلاف الفقہاء" ہے۔ اس کتاب میں امام موصوف نے اپنے ہمعصر فقہاء کے آراء و اقوال کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ ان کے

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی از خضری بک ص ۲۷۔ [2] الشافعی از ابوزہرہ مصری، ص ۲۷۔

Marfat.com

تلامذہ میں سے ایک ابوالحسن احمد بن یحییٰ ہیں۔ انھوں نے اپنے امام کی حمایت میں دو کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ایک "المدخل الی مذہب الطبری و نصرۃ مذہبہ" اور دوسری "الرد علی المخالفین"۔ ابنِ جریر الطبری کی ولادت طبرستان میں عامل نامی مقام پر ۲۲۴ھ میں ہوئی اور ۳۱۰ھ میں انھوں نے بغداد میں انتقال فرمایا۔ اللھم اغفر لھم وارحمھم وادخلھم فی جنات النعیم۔

اب ہم اجمالی طور پر مذاہبِ اربعہ کے ظہور اور ان کے فروغ کے وجوہ و اسباب کا جائزہ لیتے ہیں:

مذہبِ حنفی مذاہبِ اربعہ میں سے سب سے پہلے مذہبِ حنفی کا نام آتا ہے، اس کے مؤسس امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد افغانستان کے رہنے والے تھے۔ آپ کی پیدائش ۸۰ھ میں کوفہ میں ہوئی۔ اور بروایتِ صحیح آپ کی وفات بغداد میں ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ امام اعظم کے متبعین فقہی حلقوں میں اہل الرائے کے لقب سے موسوم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عراق میں حدیث کا پھیلاؤ بہت کم ہوا ہے۔ اسی لیے عراق والوں نے مسائلِ شرعیہ میں قیاس و اجتہاد سے کثرت سے کام لیا ہے اور بلاشبہ اس میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ امامِ اعظم کا مسلک معلوم کرنے کیلئے ان کے یہ الفاظ جنھیں خطیبِ بغدادی نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے، کافی ہیں:

"میں سب سے پہلے اللہ کی کتاب کو اپنے عمل کی بنیاد بناتا

۱؎ تاریخ التشریع الاسلامی از خضری بک ص ۲۸۴ ۲؎ ابن خلکان ج اول ص ۵۷۸۔

Marfat.com

ہوں، اگر وہاں سے کوئی رہنمائی نہ ملے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع کرتا ہوں، اور اگر یہ دونوں ماخذِ دین... خاموش ہوں تو پھر میں اصحابِ رسول کے اقوال کو اختیار کرتا ہوں۔ ان کے متعدد اقوال میں سے قولِ مختار کو لے لیتا ہوں۔ بہر حال میں انہی کے اقوال کے اندر رہتا ہوں۔ ان کے ہوتے ہوئے غیر کے قول کی جانب رُخ نہیں کرتا۔ اور اگر معاملہ صحابہ سے چل کر ابراہیم، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطاء اور سعید بن مسیب وغیرہم تک پہنچ جاتا ہے تو ان کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ یہ لوگ مجتہد تھے اور میں بھی ان کی طرح اجتہاد و قیاس سے کام لینے کا حق رکھتا ہوں[1]۔"

مذہب حنفی کو اصل شہرت و وسعت ہارون رشید کے زمانے (۱۷۰ھ) میں ہوئی ہے۔ ہارون رشید نے مذہب حنفی کے علمبردار اور امام اعظم کے شاگرد رشید ابو یوسف کو عباسی قلمرو میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدے پر متعین کر دیا۔ اور اس کے بعد عراق، خراسان، شام، مصر اور افریقیہ کے آخری کناروں تک جہاں بھی قضاۃ کے تقرر کا معاملہ پیش آیا ہارون رشید نے ابو یوسف رحمہ اللہ کے مشورے پر عملدرآمد کیا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے تمام علاقوں میں مذہب حنفی کے متبعین اور منتسبین کو مناصبِ قضا و ولایت پر نامزد کر دیا۔ چنانچہ اُسی روز[2] سے اس مذہب کو سلطنتِ عباسیہ میں سرکاری مذہب

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۱۲ ص ۲۶۸ [2] نظرۃ تاریخیۃ ص ۹۔

Marfat.com

کی حیثیت حاصل ہو گئی۔[1]

شروع میں افریقیہ اور مغرب[2] کے ممالک میں کسی مخصوص فقہی مذہب کا تفوق قائم نہیں تھا بلکہ وہاں زیادہ تر احادیث و آثار پر عمل جاری تھا۔ جب عبید اللہ بن فروخ ابو محمد فارسی نے ان علاقوں کا سفر کیا تو وہ اپنے ساتھ مذہب حنفی کو بھی لیتے گئے اور اس کی تخم ریزی کی۔ بعد میں جب ان ممالک کی مسندِ قضا پر اسد بن فرات ابن سنان متمکن ہوئے تو انھوں نے مذہب حنفی کا چرچا عام کر دیا۔ اہلِ صقلیہ بھی بالعموم حنفی المسلک تھے۔[3]

بصریوں میں مذہبِ حنفی بالکل غیر معروف تھا۔ مہدی عباسی نے ۱۶۴ھ میں قضائے مصر پر اسماعیل بن الیسع کوفی کو مقرر کیا۔ یہ مصر کے پہلے حنفی قاضی

---

[1] شیخ غنیمہ کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک حنفی فقہ کے فروغ و تفوق کا واحد سبب یہ ہے کہ یہ فقہ زندگی کے عملی مسائل میں دوسرے مذاہب کی بہ نسبت زیادہ ممد ثابت ہوئی ہے۔ اور اس کی وسعت و اشاعت کسی فردِ واحد کی مساعی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر دور میں مختلف افراد اور جماعتیں اس کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔ شیخ غنیمہ نے آگے چل کر امام مالک کے مذہب کے فروغ کی جو توجیہ کی ہے، اچھا ہوتا کہ حنفی مذہب کی اشاعت کے باب میں بھی اس نقطۂ نظر سے کام لیتے۔ (رخ - ح)

[2] یعنی شمالی افریقہ کے ممالک الجزائر اور مراکش وغیرہ۔

[3] نظرۃ تاریخیۃ ص ۱۳۔

Marfat.com

تھے اور سب سے پہلے اِن کے ہاتھوں مذہبِ حنفی کے لیے مصر کے دروازے کھُلے۔ اسماعیل الکوفی کے بعد مصر میں حنفی، شافعی اور مالکی تینوں مذہبوں کے پیروؤں میں سے قاضی مقرر ہوتے رہے ہیں۔ جب فاطمیوں نے مصر پر اپنا استیلاء قائم کر لیا تو انھوں نے مذکورہ مذاہب کو مٹا کر اسماعیلی مذہب کو غالب کر دیا۔ اور قضاء اور گورنری کے تمام مناصب پر شیعہ اور اسماعیلی مسلک کے حامیوں کو بٹھا دیا۔[1]

نورالدین محمود بن زنگی مشہور حنفی حکمران تھا۔ جب شام میں اس نے حکومت سنبھالی تو وہاں حنفیت کو بھی بڑی کوشش اور اہتمام سے فروغ دیا۔[2] مصر و شام پر عثمانی حکومت کے دور میں قضاء کے تمام مناصب احناف کے اندر محصور ہو گئے۔ بلکہ حنفیت عثمانی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار پا گئی۔ علماء اور اہلِ فقہ کی بہت بڑی تعداد سرکاری عہدوں اور قضاء کے مناصب کے حصول کی خاطر مذہبِ حنفی کی طرف راغب ہو گئی اور اس کی ترقی و عروج کا موجب ہوئی۔

حنفی لٹریچر کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ امامِ اعظم رحمہ اللہ کی طرف سے فقہ پر اپنی لکھی ہوئی کوئی کتاب نہیں ملتی۔ بلکہ ان کے آراء و اقوال ملتے ہیں جنھیں ان کے تلامذہ نے مختلف مجموعوں میں مدوّن کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے امام صاحب کے مذہب کی ترویج و ترتیب کی خدمات سرانجام دی ہیں ان کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے سرِفہرست ابویوسف، زفر، محمد بن حسن شیبانی ہیں۔ ان میں مؤخرالذکر محمد بن حسن شیبانی فقہ حنفی کی تدوین میں سب سے پیش پیش ہیں۔

---

[1] ابوحنیفہ از ابوزہرہ ۱۸۷ [2] ایضاً ص ۱۱۶

Marfat.com

فقہ حنفی کی کتابوں کو اور اس کے اصل ماخذوں کو ہم تین حصّوں پر تقسیم کرتے ہیں :-

۱- کتبِ اصول : اس قسم کی کتابوں کو ظاہر الروایۃ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ کتابیں امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے اقوال پر مشتمل ہیں۔ ان اقوال کو امام محمد رحمہ اللہ نے چھ کتابوں کے اندر مدوّن کیا ہے جن کے نام یہ ہیں : المبسوط، الزیادات، الجامع الصغیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر، الجامع الکبیر۔

۲- کتب النوادر : ان سے مراد امام محمد بن حسن کی کیسانیات، ہارونیات، جرجانیات، رقیات اور ابو یوسفؒ کی امالی ہیں۔

۳- الفتاویٰ والواقعات : یہ ان مسائل و احکام کے مجموعے ہیں جنھیں متأخرین نے مستنبط کیا ہے۔ ان میں سے سب سے پہلا مجموعہ ابو اللیث سمرقندی کی کتاب النوازل ہے۔ قاضی خاں اور رضی الدین سرخسی کی محیط بھی انھیں میں شامل ہیں[1]

حنفیہ عقائد میں امام ابو منصور محمد ماتریدی کے متبع ہیں۔ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مابین دس مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حنفی زیادہ تر ماتریدی ہیں، کسی حنفی کا عقائد میں اشعری ہونا شاذ و نادر ہی ہے[2]۔

مذہب مالکی صاحبِ مذہب امام مالک بن انس اصبحی ۹۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ میں ان کی رحلت ہوئی۔ اس مذہب کے ماننے والے

---

[1] ابو حنیفہ از ابو زہرہ ص ۱۱۶۱ [2] ایضاً ص ۱۰

Marfat.com

اہل الحدیث کہلاتے ہیں۔ احکام و مسائل میں مالکیہ تے دوسرے مذاہب کی نسبت ایک اور ماخذ کا اضافہ کیلے ہے اور وہ ہے عمل اہلِ مدینہ۔ اس بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ شریعت میں اہلِ مدینہ اور ان کے اعمال و اقوالِ خاص وضعیت واہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اہلِ مدینہ نسلاً بعد نسلٍ اپنے اسلاف صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نقشِ قدم پر چلتے آرہے ہیں اور یہ بات ان کے عمل کو ایک اہم اور مؤثر شرعی دلیل کا درجہ دے دیتی ہے[1]۔

امام مالکؒ کا مذہب حجاز، بصرہ، مصر اور بلادِ مغرب اور اندلس و سوڈان میں غالب رہا ہے۔ چوتھی صدی ہجری تک ۔۔۔ بغداد میں بھی اسے تفوق حاصل رہا ہے۔ بصرہ میں اسے پانچویں صدی کے بعد زوال ہونا شروع ہو گیا تھا[2]۔

سرزمینِ مصر پر سب سے پہلے مذہب مالکی کو داخل کرنے والے دو طالب علم ہیں: ایک عثمان بن حکم الجذامی (متوفی ۱۶۳ھ) اور دوسرے عبدالرحیم بن خالد بن یزید[3]۔ افریقیہ کے بارے میں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، پہلے وہاں احادیث و آثار کا چرچا تھا۔ پھر حنفیت کو فروغ ہوا، اور جب ۱۸۴ھ میں وہاں معز بن بادیس صنہاجی والی مقرر ہوا تو اس نے افریقیہ اور اس کے ماتحت علاقوں کے باشندوں کو مذہب مالکی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اور وہاں پہلے سے قائم شدہ مذہبی اختلافات کا خاتمہ کر دیا۔ اس وقت

---

[1] مقدمہ ابنِ خلدون ص ۴۴۷ مطبع مذکورہ [2] ایضاً ص ۴۲۵
[3] نظرۃ تاریخیۃ ص ۶۰۔

Marfat.com

سے لے کر آج تک تمام مغرب پر مذہب مالکی غالب رہا ہے اور اس مذہب کے ماننے والوں کو مغرب میں اکثریت حاصل ہے۔ ابنِ خلدون کی نظر میں مذہب مالکی کی شہرت و وسعت کے اسباب یہ ہیں :

"رہے امام مالکؒ، تو اہلِ مغرب و اندلس کے لیے ان کا مذہب مخصوص ہو چکا ہے۔ اگرچہ دوسرے علاقوں میں بھی اس کے ماننے والے ملتے ہیں لیکن بہت کم۔ مغرب و اندلس کے لوگ امام مالک کے علاوہ بہت کم مسائل میں دوسروں کی تقلید کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شروع شروع میں ان لوگوں کا زیادہ تر سفر حجاز کی جانب ہوتا تھا اور وہی ان کی منزلِ مقصود ہوتا تھا۔ ان دنوں مدینہ مرکزِ علم تھا۔ یا پھر عراق میں علوم کا چرچا تھا۔ لیکن عراق اہلِ مغرب کے راستے میں نہیں تھا۔ اسی لیے انھوں نے علمائے مدینہ سے اکتسابِ علم پر اکتفا کیا۔ اس زمانے میں مدینہ کی مسندِ امامت و پیشوائی امام مالک رحمہ اللہ کو حاصل تھی اور آپ سے پہلے آپ کے اساتذہ اور آپ کے بعد آپ کے تلامذہ اس مسند پر متمکن رہے۔ چنانچہ امام مالک مغرب اور اندلس کے استاذ اور مرجع قرار پا گئے اور ان علاقوں کے لوگوں نے، دوسرے ائمہ کے بجائے جن کے مذاہب ان تک نہیں پہنچ سکے، امام دارالہجرت کی تقلید کو اختیار کر لیا۔ نیز اہلِ مغرب و اندلس پر بدویت کا غلبہ تھا اور عراق میں اس وقت جو تہذیب و تمدن مروج ہو چکا تھا اُس کے حامل نہ تھے اس لیے اپنے بدوی مزاج کی مناسبت سے

Marfat.com

اہلِ حجاز کی جانب زیادہ مائل تھے۔ ان اسباب کی بنا پر مذہب مالکی ان کے اندر ہمیشہ تر و تازہ رہا ہے اور دوسرے مذاہب کے اندر جو تہذیبی اصلاحات و تنقیحات ہوئی ہیں اس میں نہیں ہوئی ہیں[1]۔"

اندلس میں پہلے امام اوزاعی کے مذہب کو شہرت و مقبولیت تھی۔ دوسری صدی ہجری کے بعد اس مذہب کی بساط لپٹنا شروع ہو گئی۔ کیونکہ امام مالکؒ کے تلامذہ کی ایک جماعت جب اندلس میں داخل ہوئی جس میں زیاد بن عبدالرحمٰن، غازی بن قیس اور قرعوس کے نام بھی آتے ہیں، تو انھوں نے مالکی مذہب کی تبلیغ عام شروع کر دی۔ وہاں کے امیر ہشام بن عبدالرحمٰن نے بھی ان سے تعاون کیا اور لوگوں کو مالکیت کا حلقہ بگوش ہونے کے لیے راغب کیا۔ مؤرخین میں اس امر میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اندلس میں مذہب مالکی کو کس کس نے فروغ دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یحییٰ بن یحییٰ کثیر اللیثی پہلے شخص ہیں جنھوں نے وہاں مالکیت کی تخم ریزی کی۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ زیاد بن عبدالرحمٰن قرطبی الملقب بہ شبطون کے ہاتھوں یہ کام سرانجام پایا[2]۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کام صرف ایک ہی شخص نے نہیں کیا بلکہ مختلف زمانوں میں مختلف اکابر علم کرتے رہے ہیں اس طرح سے مؤرخین کا اختلاف بھی رفع ہو جاتا ہے۔

جس طرح عقائد میں حنفیہ ابو منصور ماتریدی کے پیرو ہیں، اسی طرح مالکیہ عقائد میں ابوالحسن اشعری کے پیرو ہیں۔ اور اس میں یہاں تک شدت برتتے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۹ مطبع مذکورہ [2] نظرۃ تاریخیۃ ص ۲۲

Marfat.com

ہیں کہ کوئی ایسا مالکی دنیا میں نہیں ملے گا جو اشعری نہ ہو[1]

اس مذہب کی امہاتِ کتب یہ ہیں :

۱۔ مؤطا : یہ امام مالک رحمہ اللہ کی اپنی تالیف ہے۔

۲۔ رسالۃ مالک الی الرشید (امام مالک کا خط ہارون رشید کے نام)۔

۳۔ المدونہ : اسے ایک افریقی عالم سحنون نے مرتب کیا ہے اور ابن زید نے المختصر کے نام سے اس کی تلخیص لکھی ہے۔

۴۔ العتبیہ : اس کے جامع العتبی ہیں۔

۵۔ الواضحہ : جسے عبدالملک بن حبیب اندلسی نے تالیف کیا ہے۔

مؤخرالذکر دونوں کتابیں (العتبیہ اور الواضحہ) اہلِ اندلس میں نہایت معتبر اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ العتبیہ پر اندلس کے علماء نے لاتعداد شروح اور تخریجات لکھی ہیں۔ ابنِ رشید سے بھی اس کی ایک شرح منقول ہے۔ ابن ابی زید نے مذہب مالکی کی بنیادی کتب میں جتنے مسائل و اقوال اور اختلافات وارد ہیں، ان سب کو یکجا جمع کیا ہے جو کتاب النوادر کے نام سے معروف ہے اور آخر میں ابوعمرو بن حاجب کی کتاب جب مالکی لٹریچر میں نمودار ہوئی تو اُس کو اس قدر مقبولیت ہوئی کہ اسے مذہب مالکی کے اندر دستور العمل کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کتاب میں ابوعمرو ابنِ حاجب نے ہر مسئلے کے بارے میں مالکی فقہاء اور علماء کے آراء و اقوال کا ملخص بیان کیا ہے[2]۔

---

[1] نظرۃ تاریخیہ ص ۲۷۔

[2] مقدمہ ابنِ خلدون ص ۵۰۴

Marfat.com

مذہب شافعی یہ مذہب امام محمد بن ادریس شافعی قرشی کی طرف نسبت رکھتا ہے۔ امام شافعی کی پیدائش غزہ میں ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ اور وفات ۲۰۴ھ میں مصر میں ہوئی۔ ان کا مذہب مذاہبِ اربعہ کی نسبت قدامت میں تیسرے درجہ پر ہے۔ شافعیہ کو بھی مالکیہ کی طرح اہل الحدیث کہا جاتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی زندگی میں جو اصل کارنامہ سرانجام دیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے فقہی استنباط کے اصول و قواعد مرتب کرنے، انھیں ایک عظیم علم کی صورت میں پیش کرنے اور فقہ کو قواعد و کلیات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے فوق العادہ جدوجہد کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب شافعی اہلِ عراق اور اہلِ حجاز کے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ارسطو کو علمِ منطق کا واضع اور خلیل بن احمد کو علم عروض کا موجد ہونے کا مرتبہ حاصل ہے اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ کو علم اصولِ فقہ کا بانی ہونے کا شرف حاصل ہے[1]۔

اس مذہب کی نشوونما مصر میں ہوئی، اور وہاں بہت بڑی تعداد اس کی حلقہ بگوش ہوئی۔ پھر عراق میں اس کو فروغ حاصل ہوا۔ بغداد اور خراسان، شام اور یمن کے اکثر علاقوں میں اس کا سکہ جمتا چلا گیا۔ ماوراء النہر، فارس، حجاز اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں بھی اس کے اثرات پہنچے۔ افریقیہ اور اندلس میں ۳۰۰ھ کے بعد اس کے بعض اقوال و آراء سے وہاں کے لوگ واقف ہوئے[2]۔

مصر میں شافعیت سے پہلے حنفیت اور مالکیت کا سکہ رواں تھا۔ جب

---

[1] الشافعی، از مصطفیٰ عبدالرزاق ص ۶۳ [2] نظرۃ تاریخیۃ ص ۲۸-۲۹

Marfat.com

امام شافعی رحمہ اللہ مصر تشریف لے گئے اور وہاں قیام اختیار کر لیا تو ان کا مذہب فقہی حلقوں میں داخل ہونا شروع ہو گیا۔ ابنِ خلدون نے لکھا ہے :

" امام شافعی رحمہ اللہ کے مقلّدین اور متبعین کی زیادہ تر تعداد مصر میں ہے۔ عراق، خراسان اور ماوراء النہر کے ممالک میں بھی شافعیت کو کافی شہرت نصیب ہوئی ہے۔ ان علاقوں میں پہلے حنفیت کا چرچا تھا۔ جب شافعیّت وہاں پہنچی تو شوافع نے اِفتاء اور درس و تدریس کے اندر ہر شہر میں احناف کے ساتھ مسابقت شروع کر دی۔ جگہ جگہ حنفیوں اور شافعیوں کے مابین مناظرات و مباحثات کی محفلیں برپا ہونا شروع ہو گئیں۔ اس کے نتیجے میں خلافیات کے موضوع پر کتابوں کا عجیب و غریب ذخیرہ وجود میں آ گیا جن کے صفحات گوناگوں براہین اور بوقلموں استدلالات سے بھرے ہوئے تھے۔ جب مشرق پر انحطاط و زوال اور شکست و ریخت کی آندھی چلی تو اس کے تند و تیز تھپیڑوں میں یہ ذخیرہ بھی نیست و نابود ہو گیا۔ امام شافعی جب مصر میں خاندان بنی عبد الحکم کے پاس جا کر اترے تو اس خاندان میں سے ایک جماعت نے امامِ موصوف کا مسلک اختیار کر لیا۔ ان کے ساتھ اشہب، ابن القاسم، ابن الموّاز اور حرمیث بن مسکین اور اس کی اولاد نے بھی اسی مسلک کو مشعلِ راہ بنا لیا۔ اور اس کو فروغ دینے میں لگ گئے۔ جب مصر پر دولتِ روافضہ کو غلبہ ہو گیا تو مصر کی سرزمین سے اہلِ سنّت کی فقہ ختم ہو گئی اور اس کی جگہ اہلِ بیت کی فقہ

Marfat.com

متداول ہوگئی۔ خاندان عبیدیہ کے سقوط تک یہی صورتِ حال رہی۔
جب صلاح الدین یوسف بن ایوب کے ہاتھوں خاندان عبیدیہ کا چراغ گل ہوا تو یہ صورتِ حال بھی یکلخت بدل گئی۔ عراق و شام کی طرف سے شافعی علماء کی بہت بڑی تعداد مصر میں آنا شروع ہوگئی اور فقہ شافعی کو دوبارہ مصر میں عروج حاصل ہوگیا جو پہلے سے کہیں زیادہ دیرپا اور اثرات کے لحاظ سے گہرا ثابت ہوا۔[1]"

مذہب شافعی کی شہرت و ترقی میں فقہی مدارس کی تحریک نے بھی مدد بہم پہنچائی ہے۔ ان مدارس میں صرف شافعی مسلک کی تعلیم دی جاتی تھی۔ خاص طور پر عراق و فارس میں نظام الملک کے مدارس اور مصر و شام میں ایوبی حکمرانوں کے مدارس نے اس سلسلے میں اہم حصہ لیا ہے۔ خاندانِ ایوبی کے تمام حکمران حلقہ بگوشِ شافعیت تھے۔ ان میں صرف ملک معظم عیسیٰ بن عادل والیٔ شام ایسا تھا جو مسلکِ حنفی کا پیرو تھا۔ ورنہ یہ پورے کا پورا خاندان شافعی تھا اور ان کی اولاد بھی آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چلتی رہی۔[2]

شافعیہ کی غالب اکثریت اصول و عقائد میں ابوالحسن اشعری کی پیرو اور اس معاملے میں مالکیہ کی ہم مشرب ہے۔[3]

مسلک شافعی کی اہم کتابیں درج ذیل ہیں :-

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۸ و ۴۴۹ - [2] ابنِ خلکان ج ۱ ص ۵ -
[3] نظرۂ تاریخیۃ از احمد تیمور ص ۳۷ -

Marfat.com

۱۔ الرسالۃ : یہ کتاب فقہ کے اصولی مباحث پر مشتمل ہے۔ اُس کے مؤلف خود امام موصوف ہیں۔

۲۔ کتاب الام : یہ کتاب بھی امام شافعی کی اپنی تصنیف ہے۔ اگرچہ حال ہی میں مصر کے ڈاکٹرز کی مبارک نے ایک مضمون میں یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ کتاب امام شافعی کے شاگرد بویطی کی تالیف ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق محلِ نظر ہے۔

۳۔ کتاب اختلاف الحدیث : یہ کتاب امام صاحب نے سنّت کی حمایت میں رقم فرمائی تھی۔

۴۔ المسند : اس کتاب میں کتاب الام کی احادیث کی تخریج ہے۔

امام صاحب کے شاگرد بویطی نے بھی المختصر الکبیر، المختصر الصغیر اور کتاب الفرائض کے نام سے کتابیں لکھی ہیں۔

مذہب حنبلی | امام احمد بن حنبل شیبانی رحمہ اللہ بغداد میں ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اور بغداد ہی میں راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ آپ کی پیدائش مرو نامی مقام میں ہوئی ہے۔ اور آپ ابھی شیر خوار تھے کہ آپ کو بغداد لایا گیا۔ آپ خالص عربی ہیں اور والد اور والدہ دونوں کی جانب سے شیبانی ہیں۔ آپ کے والد عہدِ عباسی میں سالارِ لشکر تھے۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی تعلیم کا آغاز امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام ابو یوسف سے کیا۔ بعد میں حلقۂ محدثین سے وابستہ ہو گئے۔ آپ درس و تدریس کی مسند پر چالیس برس کے بعد متمکن ہوئے۔ استنباطِ احکام و استخراجِ مسائل میں آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے،

Marfat.com

اُسے ابن القیم نے اعلام الموقعین میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"امام احمد بن حنبل کے فتاویٰ پانچ اصلوں پر مبنی ہوتے تھے:

۱۔ نصوص : کسی مسئلے کے بارے میں اگر آپ کو کتاب وسنّت سے نص دستیاب ہو جاتی تو آپ اُسی کو اپنے فتویٰ کا مدار بنا لیتے، اور اس کے بعد آپ یہ پروا نہ کرتے کہ کوئی دوسرا قول اس کے برعکس واقع ہو رہا ہے یا کسی دوسرے شخص کی طرف سے، خواہ کوئی بھی ہو، اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔

۲۔ فتویٰ صحابی : اگر آپ کو کسی صحابی کا ایسا فتویٰ مل جاتا جس میں کوئی دوسرا صحابی اس کی مخالفت نہ کر رہا ہو، تو آپ اُسے اختیار فرما لیتے۔ اور آپ شدّت ورع وحزم کی وجہ سے یہ نہ فرماتے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے، بلکہ اتنا کہتے کہ "اس کی مخالفت میں کوئی رائے میرے علم میں نہیں آئی۔"

۳۔ اختلافِ صحابہ کی صورت میں آپ وہ قول اختیار فرماتے جسے آپ کتاب وسنّت سے زیادہ قریب پاتے۔ یعنی آپ صحابہ کے اقوال سے کسی حالت میں بھی باہر نہ نکلتے بلکہ انہی میں سے کسی ایک کو اقرب الی الکتاب والسنۃ سمجھ کر قبول کر لیتے۔ اگر آپ کو مختلف اقوال میں سے کسی ایک پر بھی اطمینان نہ ہوتا تو آپ اپنی طرف سے کسی قول کو قطعی طور پر اختیار کر لینے کا فیصلہ دینے کے بجائے صرف اتنا کہہ دیتے کہ "اس معاملہ میں صحابہ کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے۔"

Marfat.com

۴۔ آپ مرسل اور ضعیف حدیث کو بھی اس شرط کے ساتھ درجۂ قبولیت میں رکھ لیتے کہ کوئی دوسری حدیث اس کے خلاف واقع نہ ہو۔ امام احمد بن حنبل وہ واحد فقیہ ہیں جنھوں نے مرسل اور ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح دی ہے۔ ضعیف حدیث سے مراد ان کے نزدیک باطل اور منکر احادیث نہیں ہیں، اور نہ وہ روایات ہیں جنھیں اختیار کرنے اور معمول بہا بنانے کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث، صحیح حدیث کے مدِ مقابل ہے، اور حسن کی اقسام میں شامل ہے۔ امام احمد احادیث کی تقسیم صحیح، حسن اور ضعیف کے درجوں میں نہیں کرتے، بلکہ ان کے ہاں صرف دو قسمیں تھیں۔ ایک صحیح اور دوسرے ضعیف۔ اور ضعیف کے بھی انھوں نے کئی مدارج متعین کیے تھے۔ اس لحاظ سے جو حدیث ان کے نزدیک صحیح نہ ہوتی تھی وہ ضعیف ہوتی تھی۔ اور ان کا خیال تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ غیر صحیح حدیث واجب الاسترداد ہو۔

۵۔ قیاس: اس ماخذ کو بھی انھوں نے حسبِ ضرورت اختیار کیا ہے، لیکن ان کے مسلک[1] میں اس کی بہت کم نوبت آئی ہے۔

مذہبِ حنبلی کے نخل کی تخم ریزی سب سے پہلے عراق میں ہوئی، اور پوری صدی تک عراق کی حدود کے اندر برگ و بار لایا۔ کیونکہ امام احمد بن

---

[1] اعلام الموقعین جلد اول ص ۱۰-۱۱

Marfat.com

حنبل کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے اور عراق سے باہر مذہب حنبلی کے اثرات چوتھی صدی ہجری میں پہنچے ہیں۔ مصر و شام میں اس کا داخلہ اس وقت ہوا جب وہاں سے فاطمی اقتدار رخصت ہوا۔ چوتھی صدی ہجری میں اس کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا اصل مرکز بغداد تھا جہاں شیعیت کے ساتھ اس کی مسابقت تھی۔ یہ بات مجموعی طور پر اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہے کہ مذہب حنبلی کے ماننے والوں کی تعداد ہر دور میں بہت کم رہی ہے۔ ایک حنبلی عالم نے ذیل کے اشعار میں اسی دلدوز حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے[1]:

یقولون لی قد قل مذھب احمد ؒ وکل قلیل فی الانام ضئیل

(مجھ سے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں امام احمد کا مذہب بہت کم پایا جاتا ہے،
اور جو چیز بھی قلت میں ہو اس کی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔)

فقلت لھم مھلا غلطتم بزعمکم الم تعلموا ان الکرام قلیل

(ایسے معترضین کو میرا جواب یہ ہے کہ تمھارا یہ خیال سراسر باطل ہے۔ کیا
تمھیں معلوم نہیں کہ دنیا میں شرفاء کی تعداد ہمیشہ سے کم رہی ہے۔)

اس مذہب کو دورِ حاضر میں اگر کہیں غلبہ و تفوق حاصل ہے، تو وہ نجد میں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نجد میں وہابی تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب خود حنبلی المسلک تھے اور جب انھوں نے تجدید و اصلاح کی تحریک اٹھائی اور نجد کے علاقے پر غلبہ حاصل کیا تو مذہب حنبلی کو بھی اس سے فروغ اور اقتدار

---

[1] نظرۃ تاریخیۃ ص ۳۸-۴۰

Marfat.com

نصیب ہوا۔

ابنِ عقیل مسلکِ حنبلی کے معروف عالم گزرے ہیں، بروایت ابنِ جوزی انھوں نے اس مذہب کو قبولِ عام حاصل نہ ہو سکنے کی وجوہ میں لکھا ہے کہ اس مذہب کے پیروؤں میں ورع وزہد کی شدّت کا یہ عالم رہا ہے کہ وہ سرکاری... عُہدوں سے ہمیشہ دُور بھاگتے رہے ہیں اور انھوں نے اپنے امام کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کسی موقع پر بھی قضاء یا ولایت کے مناصب قبول نہیں کیے ابن عقیل کے الفاظ یہ ہیں:

"اس مذہب پر سب سے بڑا ظلم خود اس کے ماننے والوں نے کیا ہے۔ ابو حنیفہ اور شافعی کے متبعین میں سے جب بھی کوئی علم وفن میں دستگاہ حاصل کر لیتا قضاء یا ولایت یا کسی بڑے عہدے پر لگ جاتا اور یہ اقتدار اس کے مسلک کی درس وتدریس اور توسیع کے معاملے میں مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا۔ اس کے برعکس امام احمد کے اصحاب کا یہ حال رہا ہے کہ ان میں سے جس نے بھی علم سے وابستگی پیدا کی، یہ علم اُسے دنیا سے بیزاری، زہد وورع اور تعبّد وتحنّث کی طرف لے گیا۔ ان لوگوں پر جذبات لطیفہ کا بالعموم غلبہ رہتا تھا اور اسی بنا پر تعلیم وتدریس کے مشاغل سے بھی بسا اوقات دامن کش رہتے تھے۔"[1]

ابنِ عقیل نے جن عوامل کی نشاندہی کی ہے ہم اس پر مزید دو عوامل کا اضافہ

---

[1] مناقب امام احمد از ابن جوزی ص ۲۴۰۔

Marfat.com

کرتے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک مذہب حنبلی کی عدمِ اشاعت اور نامقبولیت میں ان دو عوامل کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان میں پہلا عامل یہ ہے کہ یہ مذہب حنفیت مالکیت اور شافعیت کے بعد ظہور پذیر ہوا۔ اس وقت ملّت کی اکثریت مذکورہ تینوں مذہبوں میں سے کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ ہو چکی تھی اور بہت قلیل تعداد ایسے لوگوں کی باقی رہ گئی تھی جو ان تینوں فقہی مذاہب سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔

دوسرا اہم عامل یہ ہے کہ حنابلہ نے جس دَور میں اسلامی معاشرے کے اندر مذہبی و اخلاقی اصلاح کا بیڑا اٹھایا وہ عباسی اقتدار کا دَورِ ثانی تھا۔ اس دَور میں اسلامی معاشرہ پراگندگی اور انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔ مصلحینِ حنابلہ عوام کو تعلیم و تربیت اور نصیحت و ارشاد کے ذریعے راہِ راست پر لانے کے بجائے سخت گیری سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ ان کی اس روش سے عام طور پر لوگوں میں اُن سے بُعد پیدا ہوتا گیا۔ کامل ابن اثیر میں سنہ ۲۶۲ھ کے وقائع کے تحت یہ بیان ملتا ہے کہ اس سن میں حنابلہ کا نفوذ بڑھ گیا اور ان کا رعب و دبدبہ قائم ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے فوجی سالاروں، بڑے بڑے لوگوں اور عامۃ الناس کے گھروں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ جہاں کہیں نبیذ و شراب کی ایک قسم پاتے اُسے گرا دیتے۔ کسی رقّاصہ یا مغنّیہ کو دیکھتے تو اُسے زدوکوب کرتے اور آلاتِ موسیقی کو توڑ پھوڑ دیتے۔ منڈیوں اور بازاروں میں گھُس کر لوگوں پر نکتہ چینیاں کرتے۔ راستے میں مردوں کو عورتوں اور بچّوں کے اختلاط سے روکتے۔ ان کی سخت گیریوں اور تشدّد آمیز کاروائیوں سے لوگوں میں اضطراب پیدا ہو گیا، اور ہر طرف شکوہ و شکایت کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ خلیفہ کو جب اس

Marfat.com

صورتِ حال کا علم ہوا تو اُس نے ایک نہایت سخت فرمان جاری کیا جس میں حنابلہ کو یہ روش اختیار کرنے پر عبرت ناک سزاؤں کی دھمکی دی۔ اس فرمان کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

"امیر المؤمنین بر ملا خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے ۔۔۔ اور اس قسم کو وہ پورا کر کے چھوڑے گا۔ کہ اگر تم اپنے اس مذموم مذہب اور غلط طریقے سے باز نہ آئے تو وہ تمھارا زن بچہ کو لہو میں پلوا دے گا۔ تمھاری گردنوں کو تلوار سے نلپے گا اور تمھارے گھروں کو اور ٹھکانوں کو نذرِ آتش کر دے گا۔"

فقہ حنبلی کے مآخذ میں سب سے زیادہ اہمیت ذیل کی کتابوں کو حاصل ہے:

المسند: یہ حدیث پر نہایت وسیع اور جامع کتاب ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسے جمع کیا ہے۔ ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم کی تصنیفات کو بھی حنبلی لٹریچر میں شمار کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ابنِ قیم کی "اعلام الموقعین" اور "القیاس فی الشرع الاسلامی" کو اس مذہب کے مصادر اصلیہ میں محسوب کیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن: اگست ۱۹۵۸ء)

Marfat.com

Marfat.com

شیخ محمد خُضَری :

مرحوم شیخ محمد بن عفیفی خُضَری (۱۸۷۲ء ـــ ۱۹۲۷ء) عالمِ اسلام میں غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں۔ زبان آور خطیب، باکمال انشا پرداز، باریک نظر مؤرخ، بلند پایہ محقق اور ماہر فقہ و شریعت ہیں۔ ان کی متنوّع تصنیفات، ہر علمی حلقے سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔

مرحوم مضافاتِ قاہرہ میں قصبۂ زیتون کے رہنے والے تھے۔ دارالعلوم قاہرہ میں علم کی تکمیل کی۔ پہلے کچھ عرصہ تک خرطوم (سوڈان) میں قاضیٔ شرع کی مسند پر فروکش رہے۔ بعد میں قاہرہ کے مدرسۂ قضاءِ شرعی میں اسلامی قانون کے مدرّس اور جامعہ مصریہ (قاہرہ یونیورسٹی) میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر مقرّر ہوئے اور ۱۲ سال تک فقہ و تاریخ کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ اور علم و ادب کے مراکز سے داد پاتے رہے۔ بالآخر اپنی غیر معمولی علمی صلاحیت کی بدولت پہلے مدرسۂ قضاءِ شرعی کے پرنسپل بنائے گئے اور پھر مصر کی وزارتِ تعلیم میں انھیں ڈائرکٹر تعلیمات (مفتش) کے منصب پر فائز کیا گیا۔ قاہرہ میں

Marfat.com

ان کی وفات ہوئی۔

مرحوم نے ٹھوس علمی تصنیفات کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے۔

نمایاں تصنیفات یہ ہیں:

اصول الفقہ (زیر نظر مقالہ اسی کتاب کا مقدمہ ہے)، تاریخ التشریع الاسلامی، اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء، محاضرات فی تاریخ الامم الاسلامیہ دو حصے، نورالیقین فی سیرۃ سید المرسلین، تہذیب الاغانی (ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کی تلخیص و ترتیب)، محاضرات فی نقد کتاب الشعر الجاھلی (طٰہٰ حسین کی کتاب: "الشعر الجاھلی" پر تنقید)، الغزالی، دروس تاریخیۃ۔

Marfat.com

اصولِ فقہ کی تاریخ

شریعت کے ماخذ خاتم الرسل سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے جو شریعت سماوی ہم تک پہنچی ہے اُس کا اصل منبع اللہ کی کتاب — قرآن کریم — ہے، اس کتاب کے مطالب کی تشریح اور تبیین صاحبِ وحی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنے قول و عمل — یعنی سنّت — سے فرمائی ہے۔ اس بنا پر کتاب اللہ اور سنّتِ رسول دونوں دین میں احکامِ شریعت کا اصل ماخذ اور اساسی ذریعۂ ثبوت قرار پائے۔ اربابِ اجتہاد و تفقہ استنباطِ احکام اور استخراجِ مسائل میں انہی سرچشموں کی طرف رجوع کرتے رہے۔ ائمۂ شریعت کی بصیرتِ دینی پر جب یہ حقیقت کھلی کہ صاحبِ شریعت نے جو احکام و فرامین امت کو صادر فرمائے ہیں وہ تمام ایسی حکمتوں سے پُر اور ایسی علتوں سے معلول ہیں جن کی بنیاد امت کے مصالح پر قائم ہے، تو ائمۂ شریعت کے اس نظریے کے نتیجے میں کتاب و سنت ہی کے اندر سے ایک تیسرا ماخذ شریعت یعنی قیاس معرضِ وجود میں آ گیا۔ حکم شریعت کی علت یا تو خود صاحبِ شریعت کی طرف سے متعین اور واضح کر دی گئی تھی یا بصورتِ دیگر ائمہ اجتہاد نے قیاس کے ذریعہ اُسے دریافت کیا اور

Marfat.com

اُس کو حکمِ شرعی کا مدار و محور قرار دے دیا۔ اور پھر ایسے مسائل و معاملات میں، جو کتاب اللہ اور سنّتِ رسول میں موجود نہ تھے لیکن اُن کے بارے میں شرعی حکم دریافت کرنا مطلوب تھا، جہاں جہاں اس علّت کو موجود پایا اُسے منصوص حکم کے دائرے میں شامل کر دیا۔ پھر جب یہ امر بھی ان ائمۂ کرام کے نزدیک پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ جب مجتہدین کی جماعت کتاب اللہ کے کسی حکم پر یا رسولؐ کے کسی فیصلے پر یا قیاس سے ثابت شدہ کسی مسئلے پر کُلّی اتفاق کر لیتی ہے تو من حیث المجموع ان کے اتفاق میں غلطی اور خطا کا احتمال نہیں رہتا۔ چنانچہ اس رائے کے تحت ایک اور ماخذِ شرعی یعنی اجماع وجود میں آگیا۔ اس طرح سے شرعی احکام کے ماخذ — یا فقہاء کی اصطلاح میں ادلّۂ احکام — کی تعداد چار تک پہنچ گئی: کتاب اللہ، سنّتِ رسول، قیاس اور اجماع — لیکن اگر دیکھا جائے تو اصل ماخذ صرف دو ہی ہیں: کتاب اور سنّت، اور باقی دونوں اصل ماخذ کی شاخیں ہیں۔

صحابۂ کرام کا طریقۂ اجتہاد قرآن جس زبان میں نازل ہوا وہ عربی تھی۔ سنّتِ رسول نے اس کی توضیح و تبیین عربی زبان میں کی۔ اصحابِ رسول فطری طور پر اس زبان سے واقف تھے۔ وہ اس زبان کے معانی و مطالب کا مکمل درک رکھتے تھے، اس کے اسلوبِ بیان اور اندازِ کلام کے اقتضاء سے کما حقّہٗ آگاہ تھے۔ ایک طرف، وہ خود قلب و نظر کی صفائی میں اور ذہن و فکر کی جِلا میں یگانۂ روزگار تھے اور دوسری طرف، انھیں صاحبِ رسالت صلے اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت حاصل تھی اور وہ احکامِ شریعت کے وجوہ و اسباب سے باخبر رہتے تھے۔ اس شرف نے انھیں حکمتِ تشریع کا عارف و رازداں بنا دیا تھا۔ چنانچہ انھیں کتاب و

Marfat.com

سنّت سے احکام کے استنباط میں کسی خارجی ذریعہ کی حاجت نہ تھی اور نہ وہ اعراب و اشتقاق کے قواعد، صرف و نحو کے ضوابط اور اسی قسم کے دوسرے علوم و فنون بعد کی پیداوار ہیں، کے محتاج تھے۔ جب کوئی نیا واقعہ اور نیا مسئلہ انھیں پیش آتا اور اس کے متعلق حکم شریعت دریافت کرنا مقصود ہوتا تو وہ پہلا تامل کتاب اللہ کی جانب رُخ کرتے۔ اگر کتاب اللہ سے انھیں اپنا مقصد حاصل نہ ہوتا تو سنّتِ صحیحہ سے رہنمائی طلب کرتے۔ اگر سنّت سے بھی تحریری ہوتی تو پھر وہ اجتہاد و قیاس پر اعتماد کرتے۔ ان کا طریقۂ اجتہاد یہ ہوتا تھا کہ وہ کتاب و سنّت میں سے ان احکام کی جستجو کرتے تھے جو پیش آمدہ مسائل و واقعات سے مماثلت و مشابہت رکھتے تھے۔ اور پھر ان نئے مسائل کو مشابہت رکھنے والے منصوص احکام کے دائرہ میں داخل کر دیتے۔ اور اس بارے میں ان تمام مصالح و مراعات کو ملحوظ رکھتے جن پر شریعت کے احکام و قوانین مبنی ہیں۔ فقہ کی زبان میں اس طریقۂ اجتہاد کو "حمل النظیر علی النظیر" یا "الحاق الاشباہ بالاشباہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

صحابۂ کرام کے اس طریقے کی شہادت ہمیں معاذ بن جبل والی حدیث ملتی ہے، جس میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کی گورنری پر روانہ کیا تو معاذ سے دریافت فرمایا کہ معاذ! تم فیصلے کس طرح کرو گے؟ حضرت معاذ نے سب سے پہلے کتاب اللہ کا نام لیا، کتاب اللہ میں نہ ملنے پر سنّتِ رسول کی طرف رجوع کرنے کا ذکر کیا، اور ان دونوں سرچشموں سے رہنمائی نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد و قیاس اختیار کرنے کا اظہار کیا۔ جس پر صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کی اس ترتیب اور راست فکری کی تصویب

Marfat.com

فرمادی۔ عہدِ عمر میں بھی اسی قسم کی مثال ملتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری کو جب قضائے کوفہ کا منصب سونپا تو انھیں منصبِ قضا کی نزاکت و اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور پھر فرمایا: الفہم الفہم فیما تلجلج فی صدرك مما لیس فی کتابٍ ولا سُنّۃٍ فاعرف الاشباہ و الامثال وقس الامور عند ذالك، واعمد الی اقربھا الی اللہ واشبھھا بالحق (جو چیز تم کو قرآن اور حدیث میں نہ ملے اور تمھیں اس کی نسبت شبہ ہو تو اس میں خوب غور و فکر کرو۔ اس کے مماثل احکام دریافت کرو، اور ان پر قیاس کر لو اور اس امر کا خیال رکھو کہ جو بات منشائے الٰہی سے زیادہ قریب اور امرِ حق سے زیادہ مشابہت رکھتی ہو اسی اختیار کرو۔)

صحابہ کے بعد تابعین کی جماعت بھی اس معاملے میں اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتی رہی۔

قواعدِ لغت کی تدوین کا پس منظر دورِ صحابہ اور تابعین کے بعد اسلامی فتوحات کی طفیل عرب قوم میں دوسری غیر عرب اقوام کی آمیزش ہو گئی۔ اور عرب و عجم کی ایک مخلوط سوسائٹی وجود میں آ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان جو عربوں کی فطری زبان تھی، اب ایک فن بن میں تبدیل ہو گئی جسے باقاعدہ پڑھا اور پڑھایا جانے لگا۔ زبان دانی کے لیے قواعد و ضوابط وضع کیے گئے۔ مختلف کتابوں کی تدوین عمل میں آئی اور پوری سعی کی گئی کہ غیر عرب اقوام کے اختلاط سے عربی زبان ضائع نہ ہو جائے یا اس پر عجمیت کا اس قدر غلبہ نہ ہو جائے کہ وہ اپنی شکل و صورت کو کھو بیٹھے۔ تاہم اہلِ علم مقدور بھر کوششوں کے باوجود روزمرہ کی سلاست پسند

Marfat.com

زبان کو تو اس سیلاب سے نہ بچا سکے۔ کیونکہ اس میں اعراب و حرکات کے ترک کر دینے، بعض الفاظ اور صیغوں کو بدل ڈالنے اور ثقیل کلمات کے بجائے ہلکے پھلکے کلمات اختیار کر لینے کی وجہ سے ایک گونہ تغیر رونما ہو گیا۔ مگر اہلِ لغت کی یہ کامیابی بھی کچھ معمولی نہ تھی کہ کم از کم انھوں نے لکھنے پڑھنے اور درس و تدریس کی حد تک زبان کو بالکلیہ محفوظ رکھا۔ حفاظتِ زبان کے سلسلے میں اس قدر سعی و اہتمام کا بنیادی جذبہ صرف یہ تھا کہ دین کے ستون اور عربی کے معتمد علیہ خزانے (کتاب و سنت) زمان و مکان کے اثرات سے محفوظ رہیں۔

اصولِ فقہ کی تدوین کا آغاز اس سلسلے میں ائمہ مجتہدین نے بھی ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا، جس نے اہلِ لغت کے مذکورہ بالا کام کی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ وہ کارنامہ یہ تھا کہ ائمہ لغت نے عرب آبادی میں گھل مل کر عربوں سے تعبیرِ کلام کے گوناگوں اسالیب کا فہم حاصل کیا اور اس کی مدد سے لغت کے جو قواعد مرتب کیے، ائمہ مجتہدین نے ان قواعد کی مدد سے اور اپنے اس علم کی مدد سے جو قدرت نے اُن کو اسلامی قانون کی رُوح اور حکمت کے متعلق ارزانی فرمایا تھا، فقہ و تشریع کے قواعد و کلیات مرتب کر دیے اور بعد میں یہی قواعد شریعت کے مآخذ سے احکام کو استنباط کرنے والوں اور اجتہاد کے منصب پر متمکن ہونے والوں کے لیے رہنما قرار پائے۔

"الرسالۃ" کے مضامین اور اصولِ فقہ میں اس کی حیثیت ہماری تحقیق کی رُو سے فقہی اصول کی طرف سب سے پہلے جنھوں نے توجہ مرکوز کی ہے وہ امام محمد بن ادریس شافعی مطلبی (متوفی ۲۰۴ھ) ہیں۔ فقہ میں ان کی مشہور کتاب

Marfat.com

"الام" کا مقدمہ جو الرسالہ کے نام سے معروف ہے، انہی قواعد پر مشتمل ہے الرسالہ میں امام موصوف نے سب سے پہلے "بیان" کی حقیقت و ماہیت پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کے بیان، قرآن کے متعلق سنت کے بیان اور اجتہاد و قیاس کے بیان پر جدا جدا روشنی ڈالی ہے۔ پھر انھوں نے قرآن کے عام و خاص پر مفصل گفتگو کی ہے۔ ایک بحث میں انھوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سنتِ رسول کتاب اللہ ہی کے حکم کی بناء پر واجب الاتباع ہے۔ آخر میں ناسخ و منسوخ، علل احادیث، خبرِ واحد کی حجیت، اجماع، قیاس، استحسان اور اختلافِ علماء پر بحث کی ہے۔ الغرض ہماری معلومات کی حد تک اربابِ اجتہاد کی رہنمائی کے لیے سب سے پہلے یہی صحیفۂ قواعد فقہی دنیا میں معرضِ وجود میں آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ یہ بدیہی امر ہے کہ جب کسی علم اور فن کی تدوین کا آغاز ہوتا ہے تو ابتدا میں اس کے جو قواعد و ضوابط وضع ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر ناتمام ہوتے ہیں اور اپنی جزئیات پر پوری طرح حاوی نہیں ہوتے۔ مثلاً علم نحو کی جب اوّل اوّل ایجاد ہوئی تو یہ علم صرف ان چند جملوں سے عبارت تھا جنھیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابوالاسود الدؤلی کو املا کرایا تھا۔ لیکن بعد میں بحث و تنقیح کرنے والوں نے انہی جملوں کو اس قدر ترقی دی کہ انھیں مختلف ابواب و فصول میں مرتب کیا گیا۔ ان کی متعدد قسمیں بنائی گئیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس علم کی بڑی بڑی ضخیم اور مفصل کتابیں تیار ہو گئیں۔ بعینہٖ یہی صورت امام شافعی کے الرسالہ کی ہے۔ چونکہ یہ علم اصولِ فقہ کا سب سے پہلا مجموعہ ہے، اسی لیے اس مجموعے کو اس علم کی "خشتِ اوّل" کی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ اس "خشتِ اوّل" کے منصۂ ظہور

Marfat.com

پر آنے کے نتائج اس قدر دُور رس نکلے کہ اربابِ نظر کی معتدبہ تعداد اس کی مزید تنقیح اور ترتیب و تنظیم میں منہمک ہو گئی۔

علم اصولِ فقہ کے چار بنیادی مباحث اصولِ فقہ کی تالیف سے ان محققین کا مدعا یہ تھا کہ ایسا زینہ مہیّا ہو جائے جس کی مدد سے امّت کے اہلِ علم اور اربابِ قانون، شریعت کے ماخذ سے احکامِ شریعت تک رسائی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ وہ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی حکم شرعی کو معلوم کرنے کیلئے چار چیزوں کا زیرِ بحث آنا لازم ہے۔ ایک نفسِ حکم، دوسرا ماخذ حکم، تیسرے عمل استنباط، اور چوتھے صاحبِ استنباط۔ چنانچہ انھوں نے ان ہی چاروں پہلوؤں پر اپنی بحثوں کو منحصر کر لیا اور اپنی تمام تر مساعی کا مرکز قرار دے لیا۔ حکم کی بحث میں انھوں نے حکم کے مختلف مراتب مثلاً وجوب، امتناع، استحباب، کراہت، اباحت، حسن، قبح اور ادا و قضا اور صحت و فساد وغیرہ پر بحث کی۔ ماخذِ حکم کے باب میں انھوں نے اپنی بحث کے دائرے میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کو شامل کیا۔ عملِ استنباط کے زیرِ عنوان ان کی مساعی کا مقصد استنباط کے طریقے اور احکام کی دلالتوں اور تقاضوں کی نوعیت کا جانچنا اور دریافت کرنا ٹھہرا۔ صاحبِ استنباط کے موضوع میں مجتہد کی ذات، اور اجتہاد کی شرائط و اوصاف زیرِ بحث لائی گئیں۔

علم اصولِ فقہ کے دو بڑے اسکول علم اصولِ فقہ کے میدان میں جن حضرات نے دادِ تحقیق دی ہے، یہ کسی ایک اکیڈیمی کی شکل میں نہ تھے بلکہ مختلف بلاد و امصار میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور ان میں سے ہر شخص اپنے ہی حلقہ میں بیٹھا

Marfat.com

اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے مطابق اس کام میں منہمک تھا۔ اختلافِ بلاد اور اختلافِ نقطۂ منظر کی وجہ سے محققین اپنے تحقیقی کام میں نہ تو اس فن کے مطالب و حقائق کو ادا کرنے والی اصطلاحات (Terms) میں متفق ہو سکے اور نہ نوعیتِ کار میں ان کے راستے باہم متحد ہو سکے۔ اور آخر کار علم اصولِ فقہ دو قسم کی اصطلاحات میں بٹ گیا۔ یا صحیح لفظوں میں اس میں دو مدرسہ ہائے فکر (Schools of Thought) وجود میں آ گئے۔ ایک متکلمین کا مدرسۂ فکر اور دوسرا حنفیہ کا۔

متکلمین کا اسکول اور اس کی خصوصیات

متکلمین نے جو نظریہ اور اسلوب اختیار کیا وہ علمِ کلام کے زیرِ اثر تھا۔ یعنی یہ لوگ بحث و تحقیق میں علمِ کلام کے اصول کی پابندی کرتے تھے۔ اور اصول و قواعد کا انضباط کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے تھے کہ فروع میں ان قواعد کی مخالفت ہوتی ہے یا موافقت۔ بس عقل اور برہان کی کسوٹی جس اصول کو درست اور معقول قرار دے دیتی تھی، اُس پر مہرِ توثیق ثبت کر دیتے تھے۔ اور عقل اور برہان جس کی نفی کر دیتے اُسے یہ بھی مسترد کر دیتے۔ بہت کم مواقع ایسے آئے ہیں جہاں یہ لوگ اپنے مذہب کی فروع و جزئیات کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ گویا اس طریقے کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے عقل و حجت کی روشنی میں قواعد مرتب کیے جاتے تھے۔ اور بعد میں فروع پر ان کا اطلاق و انطباق کیا جاتا تھا۔ اس اسکول سے مختلف مذاہب منسوب تھے۔ معتزلہ کا اسکول یہی تھا۔ اہلسنت میں سے شافعیہ اور مالکیہ بھی اسی زمرے میں شامل تھے۔

حنفی اسکول اور اس کی خصوصیات

اس کے برعکس حنفی اربابِ اصول کے طریقۂ تدوین میں اس امر کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ جو قاعدہ اور اصول وضع کیا جائے

Marfat.com

وہ جامع اور ہمہ گیر ہو۔ اور اپنی فروع اور جزئیات پر پوری طرح حاوی ہو۔ چنانچہ فقہائے احناف اُسی قاعدہ کی توثیق اور اُسی ضابطہ کی تالیف کرتے تھے جو اُن کے ائمہ سے منقول ہونے والے جزئی مسائل کی تائید کرتا تھا اور اُن کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ بلکہ اگر کوئی قاعدہ کسی فقہی مسئلے کے خلاف ہوتا تو اس کی ایسی تراش خراش کر دیتے کہ اس سے فقہی مسئلے کی مخالفت رفع ہو جاتی۔ گویا انھوں نے اسی رجحان یا نظریے کو اصول وضوابط کا لباس پہنا دیا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کے ائمۂ مذاہب نے بھی تفریع مسائل اور تخریج احکام میں اس کا التزام کیا ہے۔ اس طرزِ فکر کی پابندی نے بعض اوقات ان حضرات سے بڑے بڑے عجیب وغریب اور مضحکہ خیز قاعدے بھی تالیف کرائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں حنفی اصولِ فقہ کے تحت فروع وجزئیات کی کثیر تعداد ملتی ہے۔ اس لیے کہ قاعدے فروع پر اثر انداز نہیں ہوئے بلکہ فروع قاعدوں پر اثر انداز ہوئی ہیں۔

کلامی اسکول کی اہم کتابیں ائمہ متقدمین کی کثیر تعداد نے متکلمین کے طریقہ پر کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان تالیفات میں سے سب سے اہم کتابیں جو ہمارے علم میں آئی ہیں وہ تین ہیں:

۱۔ ابوالحسین محمد بن علی بصری معتزلی شافعی (متوفی ۴۳۶ھ) کی کتاب المعتمد۔

۲۔ ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ جوینی نیشاپوری شافعی ـــــ جو امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہیں ـــــ (متوفی ۴۷۸ھ) کی کتاب

Marfat.com

البرہان۔

۳۔ ابوحامد محمد بن محمد الغزالی (متوفی ۵۰۵ھ) کی کتاب المستصفیٰ۔
مجھے ان کتابوں میں سے المستصفیٰ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ البرہان کے بعض اقتباسات بھی، جو اسنوی[1] نے المنہاج کی شرح میں نقل کیے ہیں، میری نظروں سے گزرے ہیں۔ عربی اسلوب اور زبان کے لحاظ سے المستصفیٰ کی زبان نہایت شستہ اور بلند پایہ ہے۔ غزالی کے بارے میں یہ تو مشہور ہے کہ موصوف کاغذ کے استعمال میں تنگ دل نہیں ہیں۔ المستصفیٰ میں بھی وہ عنانِ قلم کو پوری چھوٹ دے دیتے ہیں تاکہ وہ جہاں پہنچنا چاہے پہنچ جائے۔ امام صاحب کا زمانہ تلخیص و مختصر گوئی کے دور سے پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں مؤلفین کے پیشِ نظر اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ قاری کے ذہن میں اپنا مطلب و مفہوم پوری طرح اتار دیں۔ اس سے بحث نہ ہوتی تھی کہ یہ مقصد مختصر کلام سے حاصل ہوتا ہے یا طویل کلام سے۔

دو جامع کتابیں: المحصول اور الاحکام | ان مؤلفین کے دور کے بعد کلامی اسکول کی مذکورہ کتب کی طرف دو بڑے جلیل القدر اور وسیع النظر عالم متوجہ ہوئے۔

---

[1] پورا نام ابو محمد عبدالرحیم ہے۔ بالائی مصر کے شہر اسنا میں ۱۳۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ میں ابن حیان سے تعلیم حاصل کی۔ شافعی المسلک ہیں۔ ان کی تالیفات میں سے ایک المنہاج کی شرح ہے اور ایک "رسالۃ فی عدم استحذام اہل الذمہ و عدم تبلیتہم عموم المسلمین" ہے جو مخطوطے کی شکل میں تونس میں موجود ہے۔ ۷۷۲ھ میں وفات ہوئی۔

Marfat.com

اوران دونوں نے کتبِ ثلاثہ کو ایک جامع ملخص کی صورت میں پیش کیا۔ ان میں سے پہلے فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی (متوفی ۶۰۶ھ) ہیں۔ انھوں نے المحصول کے نام سے ان تینوں کتابوں کی تلخیص کی ہے۔ دوسرے ابوالحسن علی بن ابو علی شافعی (ف ۶۳۱ھ) جو سیف الدین آمدی کے نام سے مشہور ہیں، انھوں نے الاحکام فی... اصول الاحکام کے نام سے ان کا خلاصہ مرتب کیا ہے۔ یہ دونوں جامع کتابیں عبارت کے لحاظ سے بڑی مبسوط اور واضح ہیں۔ مطالعہ کرنے والا صرف انہی پر اکتفاء کر سکتا ہے۔ اُسے مطلب سمجھنے کے لیے کسی طویل شرح کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ المحصول کی زبان نسبتہً زیادہ واضح اور سلیس ہے۔ مصر کی خدیویہ لائبریری میں المحصول مکمل موجود ہے۔ الاحکام کے بھی اکثر حصے موجود ہیں۔

المحصول کے مختصرات بعد میں ان دونوں کتابوں کی متعدد تلخیصات اور مختصرات لکھی گئی ہیں۔ (۱) چنانچہ المحصول کا ایک اختصار تاج الدین محمد بن حسن ارموی[1] (متوفی ۶۵۶ھ) نے کیا ہے جو الحاصل کے نام سے معروف ہے۔ ارموی نے یہ اختصار ابو حفص عمر بن الصدر الشہید کے مشورے سے لکھا تھا۔

(۲) دوسرا اختصار محمود بن ابوبکر ارموی (متوفی ۶۷۲ھ) نے اپنی کتاب "التحصیل" میں کیا ہے۔ موصوف کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"آج کل لوگوں کی ہمتیں اس علم کے اونچے مطالب تک رسائی حاصل کرنے

---

[1] ارموی آذربائیجان کے شہر ارمیہ کی طرف منسوب ہیں۔

Marfat.com

سے قاصر ہیں، حتیٰ کہ المحصول اپنے نظم و ترتیب کی شستگی، اور حجم کے اعتدال اور لطافت کے باوجود اکثر لوگوں کی نگاہ میں بھاری سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ چند احباب نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کو مختصر کر دوں اور مزید اپنی جانب سے اس پر توضیحی اشارے بیان کر دوں۔ میں نے ان کی درخواست قبول کر کے التحصیل کے نام سے اس کا ملخص تیار کیا ہے۔

(۳) قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی کتاب "منہاج الوصول الی علم الاصول" بھی "المحاصل" سے ماخوذ ہے۔ مگر یہ بات کہے نہیں رہا جاتا کہ ان تمام حضرات نے اس درجہ زیادہ اختصار سے کام لیا ہے کہ ان کا کلام چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مقصد تالیف افہام و تفہیم سے بالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں مزید شروح کی محتاج ہوئیں تاکہ ان کی چیستان کی توضیح اور ان کے معموں کی تحلیل کریں۔ چنانچہ قاضی بیضاوی کی منہاج الوصول کی ایک نہایت عمدہ شرح اسنوی نے لکھی ہے۔ اسنویؒ شرح کے آغاز میں رقمطراز ہیں:

"اس زمانے میں علمِ اصولِ فقہ سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والے اکثر لوگ اس علم کی کتابوں سے بے نیاز ہو کر صرف "المنہاج" پر اکتفاء کر چکے ہیں۔ کیونکہ یہ کتاب ضخامت کے لحاظ سے چھوٹی ہے۔ لیکن اس میں معلومات اور مطالب بڑی افراط سے جمع ہیں۔ اور اس کی زبان نہایت لطیف اور رواں ہے۔" اسنوی کا یہ تبصرہ میرے لیے بڑا حیرت افزا ہوا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ المنہاج میں زبان کی لطافت اور روانی کہاں سے آ گئی۔ حالانکہ اس کا پورا کلام اغلاق و

Marfat.com

ابہام کا مرقع ہے۔ مجھے جب کبھی کسی مسئلے کے بارے میں اس کی مراجعت کی ضرورت پڑتی ہے تو میں المنہاج کی متن خوانی پر اپنی جان گھلانے کے بجائے المنہاج کے شارح کی طرف رُخ کرتا ہوں اور انہی سے امداد طلب کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسنوی رح جس خوبی سے مطالب کی تشریح و تبیین کرتے ہیں۔ اس بارے میں ان کے ہم پلّہ کوئی شارح میری نظر سے نہیں گزرا۔

الاحکام کے مختصرات | آمدی کی کتاب "الاحکام" کا اختصار سب سے پہلے ابو عمرو عثمان بن عمر معروف بہ ابن حاجب المالکی (متوفی ۶۴۶ھ) نے کیا ہے۔ یہ اختصار مُنتہَی السُّول والاَمل فی علم الاصول والجدل کے نام سے موسوم ہے، اور علمی حلقوں میں خاصا مشہور ہے۔ ابن حاجب نے اپنے اسی مجموعے کا ایک اور خلاصہ لکھا اور اسے "مختصر المنتہیٰ" کا نام دیا ہے۔ اس خلاصے کی عبارت "المنہاج" سے ملتی جُلتی ہے۔ مختصر المنتہیٰ کی سب سے بہترین شرح عَضُدالدین عبدالرحمٰن بن احمد ایجی[1] (متوفی ۷۵۶ھ) کی ہے۔ لیکن اپنی عمدگی کے باوجود اسنوی کی شرح المنہاج سے کم پایہ ہے

حنفی اسکول کی بڑی بڑی کتابیں | اصولِ فقہ میں حنفیہ کے طرزِ تدوین

---

[1] ایجی کی نسبت شہر ایج کی طرف ہے جو فارس کی شمالی حدود پر واقع ہے۔

Marfat.com

پر اصول کی کتابیں تالیف کرنے والوں کی بھی کثیر تعداد ملتی ہے۔ جو زمانۂ قدیم کے نوابغ ارباب اصول سے لے کر متاخرین کے دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ متقدمین میں سے جن بزرگوں نے اس فن کو غیر معمولی نشوونما دی ہے اور اس میں ضخیم و بسیط مجموعے تصنیف کیے ہیں، ان میں مندرجۂ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

۱۔ ابوبکر احمد بن علی (ف ۳۷۰ھ)۔ یہ بالعموم جصّاص کے لقب سے مشہور ہیں۔

۲۔ ابوبکر عبیداللہ بن عمر القاضی الدبوسی[1]۔ متوفی ۴۳۰ھ۔

۳۔ شمس الائمہ محمد بن احمد السرخسی[2]۔ متوفی ۴۸۳ھ۔

میرے مطالعہ میں متقدمین کی کتابوں میں سے سب سے عمدہ اور مفید کتاب فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی[3] (متوفی ۴۸۳ھ) کی کتاب "الاصول"

---

[1] دبوسیہ سمرقند کے صدر مقام صغد کے ماتحت شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے۔ ابوزید اسی شہر کے رہنے والے تھے اور اسی وجہ سے دبوسی کہلائے۔ یاقوت نے ان کا سنِ وفات ۴۳۰ھ لکھا ہے۔

[2] سرخس خراسان کے نواح میں ایک شہر کا نام ہے اور نیشاپور اور مرو کے درمیان واقع ہے۔ اسے سرَخس بفتح را بھی پڑھتے اور سَرْخس بسکون را بھی۔

[3] بزدہ نسف سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ایک نہایت محکم اور مضبوط قلعے کا نام ہے۔ نسف دریائے جیحوں اور سمرقند کے درمیان ایک بہت بڑا شہر ہے۔ بزدوی قلعہ بزدہ کی جانب منسوب ہیں۔

Marfat.com

آئی ہے۔ علاؤالدین عبدالعزیز بن احمد البخاری (متوفی سنہ ۷۳۰ھ) نے اس کی ایک نہایت بلند پایہ اور عظیم شرح بھی لکھی ہے۔ متأخرین حنفیہ میں سے عبداللہ بن احمد نسفی کی کتاب المنار علم اصول کی مشہور و متداول کتابوں میں سے ہے۔

دونوں مدرسہ ہائے فکر کی جامع کتب متأخرین حنفیہ اور دوسرے مذاہب کے علماء کا ایک گروہ ایسا بھی گذرا ہے، جس نے حنفیہ اور متکلمین کے دونوں طریقوں کی جامع کتب لکھی ہیں۔ مثلاً بغداد کے مشہور حنفی عالم مظفرالدین احمد بن علی الساعاتی (متوفی سنہ ۶۹۴ھ) نے فخر الاسلام بزدوی کی "الاصول" اور آمدی کی "الاحکام" کو ملا کر ایک مجموعہ تالیف کیا ہے جس کا نام "بدیع النظام الجامع بین کتاب البزدوی والاحکام" ہے۔ اسی نوعیت کی ایک کتاب صدرالشریعۃ عبیداللہ بن مسعود بخاری حنفی (متوفی سنہ ۷۴۷ھ) نے "تنقیح الاصول" کے نام سے تحریر کی ہے۔ پھر صدرالشریعۃ نے خود ہی التوضیح کے نام سے اس کی شرح کی ہے۔ صدرالشریعۃ کی تنقیح الاصول، بزدوی کی الاصول، رازی کی محصول اور ابن حاجب کی تلخیص منتہی السؤل کا ملخص ہے۔ صدرالشریعۃ کی شرح التوضیح پر شافعی عالم سعدالدین مسعود بن عمر تفتازانی (متوفی سنہ ۷۹۲ھ) کا حاشیہ بھی بہت بڑی شہرت کا حامل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کمال الدین محمد بن عبدالواحد حنفی (متوفی سنہ ۸۶۱ھ)، جو عام طور پر ابن ہمام کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، کی کتاب "التحریر" اور التحریر کی شرح جو ابن ہمام کے شاگرد محمد بن محمد امیر حاج الحلبی

Marfat.com

(متوفی ۸۷۹ھ) نے لکھی ہے) اور تاج الدین عبدالوہاب بن علی السبکی شافعی (متوفی ۷۷۱ھ) کی کتاب جمع الجوامع دونوں اسکولوں کی جامع کتب کی فہرست میں شامل ہیں۔ تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب جمع الجوامع کے شروع میں تصریح کی ہے کہ ان کی یہ کتاب فنِ اصول کی تقریباً یکصد کتابوں کا نچوڑ ہے۔

مذکورہ کتب کی خصوصیات مذکورۂ بالا کتب، جن میں فنِ اصول کی ہر بات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، ایجاز و اختصار کا انتہائی نمونہ ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی عبارت بالکل ایک پہیلی اور کلامِ معجز کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اور زبان کے لحاظ سے بھی عربیت سے غیر مانوس معلوم ہوتی ہیں۔ ابنِ ہمام کی التحریر کو تو اس معاملے میں سبقت حاصل ہے۔ اس کو شرح سے الگ کر کے اگر کوئی شخص پڑھے اور قائل کی مراد معلوم کرنا چاہے تو اُسے سعی و محنت کا اسی قدر سرمایہ درکار ہوگا جس قدر معموں کو حل کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اگر اسے ابنِ حاجب کی شرح کی طرف رجوع کرنے سے پہلے پڑھا جائے اور بعد میں ابنِ حاجب کی شرح کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف ابنِ حاجب کی عبارت کو لیتا ہے اور اس کی اس قدر تراش خراش کرتا ہے، اور اس کے الفاظ و تراکیب میں اس قدر ادل بدل کرتا ہے کہ عبارت ژولیدہ و پیچیدہ ہو جاتی ہے اور اس میں ابہام کی کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔ سبکی کی جمع الجوامع مختلف، اقوال کے مجموعے سے عبارت ہے۔ کوئی قاری جامع اس کے متن سے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے

Marfat.com

تو اسے کامیابی نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں اس میں اصولِ فقہ کے جن قواعد و ضوابط کو ذکر کیا گیا ہے ان کے حوالوں کا سرے سے ذکر نہیں کیا گیا۔

دورِ جمود میں اصولِ فقہ کی حالت بعد کے ادوار میں علمِ اصولِ فقہ کے جس قدر مصنفین آئے، اُن سب کی تگ و دو صرف کتبِ سابقہ کی تشریحات اور حاشیہ نویسی تک محدود رہی ہے۔ اس علم میں انہوں نے اپنی جانب سے کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا اور نہ اس کے کسی پہلو کو مزید ترقی دینے کی کوشش کی۔ ان کا سرمایۂ محنت زندگی بھر اسی میں صرف ہوتا رہا کہ وہ ملخصات کی تشریح کریں۔ ژولیدہ عبارتوں کو حل کریں، پیچیدہ اور مبہم کلام کی گرہیں کھولیں اور اُسے بامعنی بنائیں۔ ان کی اجتہاد و فکر کی قوتیں بانجھ پن کا شکار ہو گئیں اور اُن میں ترجیح و انتخاب کا ذوق تقریباً ناپید ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آخری ادوار میں اجتہاد کے دروازے پر قفل لگ چکے تھے۔ جس کی وجہ سے علم اصول فقہ کی حیثیت آثارِ کہنہ کی سی ہو گئی تھی۔ اس لیے اصولِ فقہ کی بحثوں میں نئے اور استنباط و قیاس کے قاعدوں میں (جن کا تعلق اجتہاد سے ہے) قابلیتیں اور محنتیں صرف کرنے کی کوئی ضرورت اور کوئی افادیت محسوس نہ کی گئی۔

متاخرین کی کتب میں سے دقیق ترین کتاب مُسلّم الثبوت ہے، جس کے مؤلف محب اللہ بن عبدالشکور (متوفی ۱۱۱۹ھ) ہیں۔

Marfat.com

حیرت ہوتی ہے کہ اصولِ فقہ پر اس کثرت اور وسعت سے لٹریچر وجود میں آیا ہے، لیکن اصحابِ اصول میں سے کسی نے اُن ضابطوں اور کلیّوں کے بارے میں لاہوارِ قلم کی جولانی نہیں دکھائی جن کو خود صاحب شریعت نے تشریع (قانون سازی) کے باب میں معتبر و ملحوظ رکھا ہے، اور یہی اصول فی الحقیقت قیاس اور استنباط کی اساس ہیں۔ کیونکہ قیاس کی اصل روح وہ علّتیں ہیں جو شریعت کے احکام میں کارفرما ہیں اور ان احکام کا مدار ہیں۔ آن علّتوں کا ایک حصّہ وہ ہے جن کا مدارِ حکم ہونا خود شارع سے منصوص ہے اور دوسرا حصّہ وہ ہے جن کا استخراج مجتہدینِ امّت نے کیا ہے اور احکام میں ان کو مؤثر گردانا ہے۔ انہی علّتوں سے وہ اصول و قواعد مرتب ہوئے ہیں جن پر قیاس کی عمارت قائم ہے۔ چنانچہ بہتر یہ تھا کہ ذہن و فکر کا زیادہ تر زور انہی اصول کی توضیح و ترتیب پر صرف کیا جاتا تاکہ یہ اصول مجتہدین و فقہاء کے لیے مشعلِ راہ بنیں۔ اور اجتہاد و استنباط کا کارواں انہی کی روشنی میں پوری تازگی کے ساتھ رواں دواں رہے۔ یہ طریقہ ہر لحاظ سے بہتر تھا اور نتائج کے اعتبار سے بھی اس امر سے بڑا مفید تھا کہ وقت اور قوّت کو خلافیات و جدلیات میں اکارت کیا جاتا اور ایسے مسائل پر کشمکش برپا رکھنے میں ضائع کیا جاتا، جن کی مخالفت یا موافقت سے کسی شرعی حکم پر اثر نہیں پڑتا۔ غالباً اربابِ اصول نے ان قواعد و کلیات پر بحث و تحقیق کا کام فقہاء اور مجتہدین (جو اصول سے نہیں بلکہ جزئیات مسائل سے بحث کرتے ہیں) کے لیے مختص کر دیا تھا، حالانکہ ان کا زیادہ

Marfat.com

تعلّق اصولِ فقہ کے فن سے ہے۔

اصولِ فقہ پر بہترین کتاب ابو اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی (متوفی ۷۹۰ھ) کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے مذکورۂ بالا امور کی جانب توجہ مبذول کی ہے، اور اصولِ فقہ میں شارع علیہ السلام کے اختیار کردہ اصول کو لیا ہے اور ان کی تشریح و توضیح کی ہے۔ اس لحاظ سے شاطبی کی الموافقات کو میں نے بہترین کتاب پایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب عظیم فائدوں کی حامل ہے۔ عبارت و اندازِ بیان نہایت سہل اور رواں ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کتاب کے ہوتے کسی دوسری کتاب کی پیاس باقی نہیں رہتی، تو اس میں کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ والسّلام۔

(ترجمان القرآن: ستمبر ۵۸ء)

Marfat.com

دار المطالعہ
تنظیم المسلمین
فتح گڑھ

Marfat.com

ڈاکٹر محمد معروف دوالیبی

شام کے ممتاز اہلِ علم و فضل میں سے ہیں۔ اسلامی قانون و فقہ اور جدید قوانین پر ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ حلب کے شریعت کالج میں علوم شرعیہ کی تکمیل کی۔ پیرس یونیورسٹی میں رومن لا کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہاں سے ڈاکٹر آف لاء کی ڈگری لی۔ آج کل شام یونیورسٹی کے لاء کالج میں اصول قانون اور رومن لا کے پروفیسر ہیں۔

سیاسی میدان میں بھی موصوف نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ کئی سالوں سے شام پارلیمنٹ کے ممبر منتخب چلے آ رہے ہیں، اور متعدد مرتبہ شام کے وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ آپ کا سیاسی تعلق شام کی مشہور پارٹی: "حزب الشعب" (پیپلز پارٹی) سے ہے، لیکن آپ بڑے متوازن خیالات اور مرنجان مرنج طبیعت کے حامل ہیں۔ ہمیشہ اسلام پسند عناصر کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ عربستان کی اسلامی تحریک: "اخوان المسلمون" اور پاکستان کی تحریک احیائے اسلام سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔

Marfat.com

مصر و شام کے اتحاد سے قبل شام میں جو دستور رائج تھا اُس کی تدوین و ترتیب میں موصوف نے نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس دستور میں کتاب و سنّت کو قانون کا ماخذ اساسی تسلیم کیا گیا تھا، جو ڈاکٹر دوالیبی، مصطفیٰ سباعی اور ان کے دیگر رفقاء کی مساعی کا رہین منّت تھا۔

دوالیبی کی شخصیّت علم و سیاست کا نہایت حسین امتزاج ہے۔ آپ جس زمانے میں وزارتِ عظمیٰ پر بھی فائز ہوتے ہیں اُس وقت بھی علمی مشاغل سے منقطع نہیں ہوتے۔ بحیثیّت وزیر اعظم پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں شریک اور فرائض منصبی میں منہمک ہوتے ہیں اور بحیثیّت استاذ لا کالج میں قانون و دستور کے مسائل پر طلبہ کو لیکچر دیتے ہیں۔۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں جب شام میں فوجی انقلاب آیا، تو موصوف اس وقت وزیر اعظم تھے۔ انقلابیوں نے آپ کو المزّہ کی جیل میں نظر بند کر دیا۔ آپ نے نظر بندی کے ایام سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور اپنی عظیم الشان کتاب "الوجیز فی الحقوق الرومانیہ" (رومن لا کی تشریح و تاریخ) تصنیف کی۔

قانون اور دستور کے موضوع پر آپ کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے نمایاں ترین یہ ہیں: (۱) المدخل الی الحقوق الرومانیہ (۲) الوجیز فی الحقوق الرومانیہ (۳) المدخل

Marfat.com

الی السنۃ وعلومہا (۴) قومیت عرب اور عربوں کے ماضی اور مستقبل پر چند لیکچر (۵) الاجتہاد فی الحقوق الاسلامیہ .... (فرانسیسی زبان میں) (۶) المدخل الی علم اصول الفقہ۔ زیر نظر مقالہ آپ کی آخر الذکر کتاب کا ایک باب ہے۔ یہ کتاب آپ کے ان لیکچروں کا مجموعہ ہے جو شام یونیورسٹی کے لاکالج میں تعلیمی سال کے دوران میں آپ نے دیے ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

ملّتِ اسلامیہ کا فقہی سرمایہ

تحریک فقہ اور اس کے محرّکات

عہد صحابہؓ کے بعد امّت میں علوم وفنون کی تدوین کی جو حیرت انگیز تحریک اُٹھی، اس نے اگرچہ زندگی کے ہر گوشے پر علوم ومعارف کے انبار لگا دیئے۔ مگر امت کو سب سے زیادہ جس شعبۂ علم سے فائدہ پہنچا وہ اسلامی قانون کا شعبہ ہے۔ فقہائے اسلام نے اس شعبے میں جو تحقیقی وتالیفی سرگرمیاں دکھائی ہیں اور قانونی مواد کا جو قابلِ قدر اور بافراط ذخیرہ مستقبل کی نسلوں کی طرف منتقل کیا ہے اُس کی نظیر دوسری کسی قوم کی تاریخ سے مہیّا نہیں کی جا سکتی، اور نہ کسی دوسری قوم کا علمی وقانونی ورثہ اس کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ شعبۂ قانون کی شادابی اور اس سے علماء کا غیر معمولی شغف دراصل تین بنیادی محرّکات کا رہینِ منّت ہے۔

پہلا محرّک: آزادیٔ فکر

پہلا بنیادی محرک اجتہاد ہے۔ شریعت اسلامی نے شروع ہی سے اجتہاد کو قانون کے مآخذ کے دائرے میں شامل کر لیا تھا۔ اور اجتہاد کے اختیارات اسلامی حکومت کی آزاد عدلیہ اور فقہائے اسلام کی خداداد صلاحیتوں کو تفویض کر دیے تھے۔ شریعت

Marfat.com

اسلامی کا یہ فیصلہ فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے بحث و تحقیق کے راستوں کو وجود میں لانے کا بہت بڑا محرّک ثابت ہوا، اور اس نے ہر فقیہ اور ہر قانون دان کے اندر یہ ولولہ پیدا کر دیا کہ وہ اپنے اجتہادات اور نتائجِ تحقیق کو جامۂ تدوین و ترتیب پہنائے۔ اجتہاد اور قیاس کی بساط لپٹ جانے کا دَور بہت بعد کا ہے۔ جس دَور کی بات ہم کر رہے ہیں ـــــ اور وہی دراصل ہمارے فقہی و قانونی سرمائے کے توسّع کا دَور ہے ـــــ اس وقت علماء اور حاملینِ فقہ کی جانب سے کبھی یہ کوشش نہیں کی گئی کہ وہ اجتہاد کے دروازے پر تالے چڑھا دیں۔ اور لوگوں کو صرف ایک مخصوص مذہب کی پیروی پر مجبور کریں۔ اور اُس علمی تحریک کے روز افزوں پھیلاؤ کو روک دیں جس کے برگ و بار سے آج تک امت نہ صرف مستفید ہو رہی ہے بلکہ دوسری اقوام کے سامنے اُس کا سر فخر بلند ہے۔ اس کے برعکس ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وقت "وحدتِ مذہب" کا خیال نوکِ زبان پر لایا ہے تو خود فقہاء نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کی دو بیّن مثالیں موجود ہیں:

۱۔ مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد عبّاسی خلیفہ منصور جب حج کو گیا تو وہاں امام مالک رحمہ اللہ سے اُس کی ملاقات ہوئی۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت منصور نے مجھ سے کہا: میں نے عزم کر لیا ہے کہ آپ کی تصنیف (مؤطّا) کی ایک ایک نقل مسلمانوں کے ہر شہر میں بھیج

Marfat.com

دوں اور حکم جاری کردوں کہ لوگ اس کے احکام پر عمل کریں اور اس کے سوا کسی کی طرف رجوع نہ کریں۔" میں نے کہا : امیر المومنین! آپ کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ لوگوں کے اندر پہلے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے اقوال جاری و ساری ہیں۔ ان کی زبانوں پر مختلف احادیث کا چرچا ہے۔ اور ہر گروہ اپنے اُن احکام و فتاویٰ پر قائم ہے جو صحابہ کرام سے وراثۃً اُس تک پہنچے ہیں۔ ایسی حالت میں لوگوں کے مختار مسلک سے تعرّض مناسب نہیں ہے۔"

۲۔ امام مالکؒ ہی سے ایک دوسری روایت ہے جسے ابو نُعیمؒ نے حِلیۃ الاولیاء میں بیان کیا ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ "ہارون الرشید نے مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ وہ چاہتا ہے کہ مؤطا کو خانۂ کعبہ میں آویزاں کرے اور تمام مسلمانوں کو شرعی احکام میں اس کی پیروی پر مجبور کرے۔ لیکن میں نے جواب دیا کہ ایسا نہ کرو، خود صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اندر جزئیات و فروع میں اختلافات تھے، اور وہ اسی حالت میں مختلف شہروں میں پھیل گئے اور اُن میں سے ہر شخص راہِ صواب پر تھا۔"

دوسرا محرّک : اسلامی سلطنت کی وسعت

دوسرا بنیادی محرّک، جو ہمارے قانونی اور تشریعی ذخیرے کے اندر تعجب خیز فراوانی کا موجب ہوا ہے، یہ تھا کہ اسلامی سلطنت کے وسیع و عریض اطراف میں بیک وقت اجتہادی قوتیں سرگرمِ عمل تھیں۔ اور اَندلس سے لے کر

Marfat.com

حدودِ چین تک مجتہدین کی مجالسِ درس پھیلی ہوئی تھیں۔ چونکہ ہر خطے کے باشندے جُدا جُدا عادات و مزاج رکھتے تھے اور ہر ایک کی اقتصادی و تمدنی ضروریات دوسرے سے مختلف تھیں، اس وجہ سے ہر خطّے کے لوگ لاتعداد ایسے مسائل و معاملات سے دوچار تھے جن کے بارے میں کتاب اللہ یا سنّتِ رسولؐ میں سے ان کے پاس کوئی رہنمائی نہ تھی۔ چنانچہ وہاں کے علماء کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسے مسائل و معاملات کے بارے میں اپنی اجتہادی بصیرت سے کام لیں اور کتاب و سنّت سے ان کے احکام مستنبط کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہر خطّہ میں تخریجِ احکام اور استنباطِ مسائل کا عمل جاری ہو گیا۔ اور اس طرح عالمِ اسلامی کے ہر بڑے شہر میں فقہ اسلامی کا ایک مرکز وجود میں آ گیا۔ حدودِ چین کی طرف افغانستان، ایران میں نیشاپور، عراق میں بغداد، کوفہ اور بصرہ، شام میں دمشق اور حمص، حجاز میں مدینہ اور مکہ، مصر میں فسطاط، تونس میں قیروان، اندلس میں قرطبہ، غرناطہ اور طلیطلہ کے تاریخی شہر ائمۂ مجتہدین اور بالغ نظر مقنّنین سے مالا مال رہے ہیں۔ مرکزی شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں کی تعداد احاطۂ شمار سے باہر ہے جہاں مدّت مدید تک تحقیقات و تخریجات کے چشمے اُبلتے رہے ہیں اور امت کی کھیتی کو سیراب کرتے رہے ہیں۔

تیسرا محرّک: حج کا عالمگیر اجتماع اسی طرح فقہی ثروت میں اضافے کا باعث حج کا عالمگیر اجتماع بھی تھا۔ دورِ اجتہاد میں علماء کی معتدبہ تعداد اسلامی سلطنت کے اطراف و اکناف سے جمع ہو کر ہر سال حج کے

Marfat.com

لیے آتی۔ اور مکہ اور مدینہ میں سال بہ سال علمی کانفرنس کا انعقاد ہوتا رہتا جس میں ہر صاحبِ علم اپنے علمی افکار، اجتہادی آراء اور اپنے ملک کے پیش آمدہ مسائل دوسروں کے سامنے رکھتا تھا۔ ان پر تبادلۂ خیالات ہوتا۔ مذاکرے و مباحثے ہوتے۔ ایک خطّہ کے علماء کو دوسرے خطّے کے علماء کے خیالات و آراء سے مستفید ہونے اور ہر ایک کو اپنے اپنے حالات کے مطابق مسائل و احکام انتخاب کر لینے کا موقع ملتا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی عالمگیر سالانہ علمی کانفرنسیں، جو حج کے طفیل منعقد ہو جایا کرتی تھیں، کتنے عظیم اثرات کی حامل ہوتی تھیں، اور انھوں نے مجتہدانہ نکتہ رسی اور فقہی تالیف و تصنیف کی تحریک کو فروغ دینے میں کتنا حصّہ لیا ہے۔

ثمراتِ تحریک ان تین اساسی محرّکات کے فیض سے مسلمان قوم کے اندر اسلامی قانون کے لٹریچر کی بڑی بڑی الماریاں وجود میں آگئیں۔ ان الماریوں میں مشرق سے لے کر مغرب تک کی گوناگوں اجتہادی صلاحیتوں، تفقہ و استنباط کے نتھرے ہوئے ذوق اور تشریع و تقنین کے ملکہ سے بہرہ مند ذہنوں کے نتائجِ تحقیق، جنہیں ہم موجودہ اصطلاح میں قانونی نظائر سے تعبیر کرتے ہیں، مجموعوں کی شکل میں موجود ہیں۔ اور صرف ایک ملک میں نہیں بلکہ قدیم دنیا کے تینوں برّ اعظموں میں ان جواہر کی بہتات ہے۔ ان مجموعوں میں جس کثرت کے ساتھ احکام و مسائل کو جمع کیا گیا ہے اور ان پر جس قدر سیر حاصل اور ہمہ پہلو بحثیں کی گئی ہیں اُس کی نظیر دنیا کے

Marfat.com

کسی قانونی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ اس قانونی لٹریچر میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگرچہ یہ مختلف ممالک کے مقنّنین اور اربابِ اجتہاد کی کاوشوں پر مشتمل ہے اور مختلف طبائع اور متضاد ذوق اس کی تخلیق کرتے رہے ہیں، بایں ہمہ آج ہمارے سامنے وہ اس صورت میں ہے کہ گویا یہ ایک ہی ٹکسال کے سکّے ہیں اور ایک ہی کاریگر کے ہاتھ نے ان کی تراش خراش کی ہے۔

فقہی لٹریچر کی اقسام

جگہ کی قلّت میرے راستے میں حائل ہے ورنہ میں کتب خانۂ اسلام کی کم از کم ان اہم اور نفیس ترین کتابوں سے قارئین کرام کو روشناس کراتا جو آج تک ہمارے عظیم المرتبت علماء کے قلم سے نکلی ہیں۔ اس لیے میں اس خیال سے قطعِ نظر کر کے صرف یہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ کتب خانہ ترتیب و تدوین اور موضوع کے لحاظ سے کتنی اقسام پر مشتمل ہے۔

تمام فقہی کتابوں اور قانونی مجلّوں کو اُن کی نوعیتِ ترتیب کے لحاظ سے، ہم سات قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم میں وہ مجموعے شامل ہیں جن میں احکام کو احادیث و آثار کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ اور ان کی ترتیب احکامِ فقہیہ کی ترتیب کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ اور انہیں ابواب و فصول کے تحت درج کیا گیا ہے۔ اور بعض ابواب کے آخر میں مؤلف نے احادیث و آثار کے ذکر کے بعد چند ایسے احکام و وقائع بھی درج کر دیے ہیں جو اُس کے نزدیک اس باب کے نظائر (Precedents) کی حیثیت رکھتے ہیں یا ان پر اپنے فقہی قواعد کی رُو

Marfat.com

سے حکم لگایا ہے۔ اس طرح کے مجموعوں میں عمدہ ترین مجموعہ امام مالک رحمہ اللہ کی "موطا" ہے۔

دوسری قسم میں وہ عام فقہی کتب داخل ہیں، جن میں احادیث و آثار کو بیان نہیں کیا گیا، بلکہ صرف احکام کا ذکر ہے۔ اور مؤلف نے ان احکام کو اپنے فقہی مسلک کے مطابق ابواب و فصول میں منقسم کیا ہے۔ اس طرز کی بہترین کتاب المبسوط ہے۔ یہ کتاب اپنے مواد و مطالب کے لحاظ سے بڑی بلند پایہ ہے۔ اور چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد امام محمدؒ بن حسن شیبانی نے تالیف کیا ہے۔ امام محمدؒ نے اس میں لاکھوں کی تعداد تک مسائل جمع کر دیے ہیں۔ ان میں سے ہزاروں مسائل وہ ہیں جنہیں امام ابوحنیفہؒ نے مستنبط کیا ہے، اور ہزاروں ایسے ہیں جن میں صاحبین (امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ) نے اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ سے اختلاف کیا ہے۔ کتاب کی تدوین میں مؤلف رحمہ اللہ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ کسی باب کو جب وہ شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے اُن احادیث و آثار کو لاتے ہیں جو اس باب سے متعلق اُن کے پاس ہوتے ہیں۔ پھر اُن سے مستنبط ہونے والے مسائل بیان کرتے ہیں۔ اور بالعموم باب کا خاتمہ ان مسائل پر کرتے ہیں جن میں امام ابوحنیفہؒ اور ابن ابی لیلیٰ نے اختلاف کیا ہے۔ احکام کی علتوں اور توجیہات کے ذکر سے یہ کتاب خالی ہے۔

تیسری قسم کتبِ آثار کی ہے۔ ان میں مختلف مذاہب کے علماء نے

Marfat.com

اپنے مذہب کے وہ تمام آثار جمع کر دیے گئے ہیں جن سے ائمہ مذہب نے احکام و فروع میں استدلال کیا ہے۔ امام محمدؒ کی کتاب الآثار اسی نوعیت کی ہے۔ انہوں نے اس میں وہ تمام آثار درج کر دیے ہیں جن سے ائمۂ احناف استدلال کرتے ہیں۔

چوتھی قسم ان کتابوں کی ہے جن میں مسائل پر علمی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ اور مؤلفین نے ان میں اپنے مخالفین کی آراء کا تجزیہ کر کے اُن کی کمزوریوں کو نمایاں کیا ہے اور اپنے مذہب کی صحت کے وجوہ واضح کیے ہیں۔ امام محمدؒ کی کتاب "الرد علیٰ اہل المدینۃ" اسی طرز کی کتاب ہے۔ یہ انہوں نے اہلِ مدینہ کے رد میں لکھی ہے اور اس میں ان مسائل پر بحث کی ہے جن میں امام ابو حنیفہؒ نے اہلِ مدینہ کی مخالفت کی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "الاُمّ" میں اس کو روایت کیا ہے۔ اور اس کے ہر مسئلہ پر تعقیب کر کے اس میں یا تو اہلِ مدینہ کی تائید کی ہے یا امام ابو حنیفہؒ کی رائے سے موافقت کی ہے یا دونوں کی تردید کی ہے۔ میری نگاہ میں قانونی نقد و جرح کے موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کتاب سے قانون کے طالب علم کو نہ صرف مختلف فیہ احکام اور ان پر تنقید کرنے کا اسلوب ہی معلوم ہوگا بلکہ یہ کتاب اس کے اندر قانونی نکتہ رسی کا ذوق بھی پیدا کرے گی۔ اور یہ بات فقہ و قانون کی دوسری کسی کتاب سے حاصل نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر ہم آپ کے سامنے کتاب کا ایک باب نقل کرتے

Marfat.com

ہیں جس سے پوری کتاب کا انداز معلوم کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔

اس باب میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ ایک شخص ایک دوسرے شخص کو پکڑ رکھتا ہے اور ایک تیسرا شخص گرفتار شدہ کو قتل کر دیتا ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ قانون کی نگاہ میں پکڑ رکھنے والے کی حیثیت کیا ہے اور یہ واضح ہے کہ وہ قاتل نہیں ہے بلکہ قاتل کا معاون و مددگار ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ پکڑ رکھنے والے پر قصاص نہیں ہے۔ قصاص صرف قاتل پر ہے۔ البتہ پکڑ رکھنے والے کو اذیت ناک سزا دی جائے گی۔ اور اُسے حبس میں ڈالا جائے گا۔

اہلِ مدینہ کی رائے یہ ہے کہ اگر گیرندہ کا یہ خیال تھا کہ قاتل ارادۂ قتل رکھتا ہے تو اُس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔

امام محمدؒ بن حسن کہتے ہیں کہ "گیرندہ کو کیونکر قتل کیا جائے گا؟ جب کہ فعلِ قتل اس سے سرزد نہیں ہوا ہے۔" امام محمدؒ اپنی رائے پر تفصیلی بحث کرتے ہیں اور اپنے مخالفین سے استفسار کرتے ہیں کہ "اگر گیرندہ (ممسک) قاتل کے بارے میں یہ خیال رکھتا ہو کہ اس کا ارادہ قتل کا نہیں ہے تو کیا تم لوگ اُسے واجب القتل ٹھہراؤ گے؟ اگر تمہارا جواب یہ ہے کہ اُسے قاتل کے ارادۂ قتل سے لاعلم ہونے کی صورت میں قتل نہیں کریں گے بلکہ اُس وقت قتل کریں گے جب کہ وہ یہ گمان رکھتا ہو کہ قاتل ارادۂ قتل سے آیا تھا، تو تمہارے اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے نزدیک مقتول کو پکڑ رکھنے والا محض گمان کی بنا پر مستوجبِ قصاص ہے۔ حالانکہ گمان غلط بھی ہوتا ہے

Marfat.com

اور صحیح بھی"۔ (اس کے بعد امام محمدؒ اس رائے کی غلطی کو متعدد مثالوں سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں) :

"میں آپ حضرات سے دریافت کرتا ہوں کہ دلالتِ قتل کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ یعنی ایک شخص قاتل کو مقتول کا سُراغ دیتا ہے۔ اور قاتل جاکر اُسے قتل کر دیتا ہے۔ سراغ دینے والے کو یہ معلوم ہے کہ اگر اس شخص کا بس چل گیا تو ضرور اُسے قتل کر دے گا۔ کیا آپ حضرات گیرندہ پر قیاس کرکے سُراغ دہندہ کو بھی واجب القتل ٹھہرائیں گے؟ اسی طرح ایک شخص دوسرے شخص کو حکم دیتا ہے کہ فلاں کو قتل کر دو اور وہ اُسے جاکر قتل کر دیتا ہے تو کیا قاتل اور حکم دینے والا دونوں پر قصاص نافذ ہوگا؟ علیٰ ہذا القیاس ایک شخص نے ایک عورت کو کسی دوسرے شخص کی خاطر محبوس رکھا اور اس نے عورت کے ساتھ فعلِ زنا کا ارتکاب کیا تو کیا حابس اور زانی دونوں پر حدِ زنا جاری ہوگی اور محصن ہونے کی صورت میں دونوں کو رجم کیا جائے گا؟ یا صرف وہ شخص مستحقِ حد ہوگا جس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے؟ جو حضرات واقعۂ قتل میں گیرندہ کو بھی واجب القتل قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک تو واقعۂ زنا میں حابس اور زانی دونوں مستحق حد ہوں گے۔ ایسے ہی ایک شخص نے دوسرے کو شراب پلائی تو کیا صرف شاربِ پر حدِ خمر جاری کی جائے گی یا شارب اور ساقی دونوں اس کی زد میں آئیں گے؟ ایسے ہی ایک شخص کسی کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم فلاں پر تہمتِ زنا لگاؤ اور وہ اس پر افترا پردازی کر دیتا ہے تو کیا فقط قاذف پر حدِ قذف کا اطلاق ہوگا یا

Marfat.com

دونوں پر ہوگا ؟ اہلِ مدینہ کے خیال کی رُو سے دونوں پر حدّ واجب ہونی چاہیے۔
عطاء بن ابی رباح سے مروی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک مقدمۂ قتل میں، جس میں ایک شخص قتلِ عمد کا مرتکب تھا اور دوسرا مقتول کو روکے رکھنے کا، یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ "قاتل کو قتل کیا جائے اور دوسرے کو قید کی سزا دی جائے یہاں تک کہ وہ حالتِ قید ہی مر جائے"۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نفسِ فعل پر سزا دی ہے اور اسی کے لیے قصاص مقرر فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ : كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (مقتولوں کے بارے میں تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے) اور وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا (اور جو شخص ظلم سے مارا گیا ہم نے اُس کے وارث کو مطالبۂ قصاص کا اختیار دیا ہے)۔ دوسری آیت کے نزول کے وقت جو لوگ اس کے مخاطب تھے ان میں یہ بات معروف اور مسلّم تھی کہ مقتول کا وارث صرف قاتل سے مطالبۂ قصاص کا اختیار رکھتا ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا : من اغتبط مسلماً بقتل فهو قوديد (جس نے کسی مسلمان کا ناحق خون بہایا تو وہ اُس کے قصاص کا رہین ہے)۔ نیز ذیل کی آیات سے واضح ہے کہ حدِّ زنا اور حدِّ قذف صرف زنا اور قذف کے جرم کا ارتکاب کرنے والوں پر نافذ ہوگی : اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (زانی عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک

Marfat.com

کو سو کوڑے مارو) اور وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً (اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسّی کوڑے مارو)۔ میں نے خلقِ خدا میں سے کوئی ایسا پیشوا یا صاحبِ امر نہیں دیکھا جس نے کسی شخص کو ایسے فعل یا ایسے قول (افتراء) پر حدّ جاری کی ہو جو اُس نے خود نہ کیا ہو یا اُس کی زبان سے نہ نکلا ہو۔ اس لیے اگر ایک شخص قتل کرنے کا مجرم ہے اور دوسرا مقتول کو محبوس رکھنے کا، تو قاتل کو فیصلۂ الٰہی کے مطابق قتل کیا جائے گا اور پکڑ رکھنے والے کو دوسری سزا دی جائے گی۔ خدا کے فیصلے میں یہ جائز نہیں ہے کہ جب میں قاتل کو اس کے فعلِ قتل کی پاداش میں قتل کر دیتا ہوں تو محبوس کرنیوالے کو اس کے فعلِ حبس پر قتل کر دوں۔ حالانکہ حبس اور قتل دو مختلف فعل ہیں جس نے حابس پر قصاص نافذ کیا اُس نے اللہ کے حکم کو بدل ڈالا۔ کیونکہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ۔ تو قصاص یہی ہے کہ آدمی کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے جو اُس نے کیا ہے۔ تو کیا (مذکورہ مثال میں) اس نے (یعنی گیرندہ نے) قتل کیا ہے جس کے بدلے میں اُسے قتل کیا جائے گا؟ وہ صرف حبس مقتول کا مجرم ہے اور حبس معصیت ہے۔ اس پر تعزیر تو دی جا سکتی ہے قصاص جاری نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ اُس کا پکڑ رکھنا قتل کے لیے تھا یا نہیں۔ البتہ اگر حبس قتل کا قائمقام ہوتا یعنی حابس نے کسی شخص کو قصداً اس لیے محبوس کر

Marfat.com

رکھا ہو کر اُسے قتل کیا جائے تو ایسی حالت میں چاہے محبوس کو قتل نہ بھی کیا جائے، حابس واجب القتل ہوتا۔ کیونکہ اُس نے نیّت کے ساتھ ایک ایسا کام کیا جسے وہ قتل کے قائم مقام سمجھتا تھا۔ یہ امام مالکؒ بن انس اور محمدؒ بن حسن کے قول کے خلاف ہے۔

محمد بن حسنؒ نے امام مالکؒ پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں، وہ تمام اعتراضات بلکہ اُن سے زیادہ امام مالکؒ پر وارد ہوتے ہیں۔ لیکن دوسرے مواقع پر محمد بن حسن بھی غفلت سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ وہاں وہ خود بھی امام مالکؒ کے قول کی بیان کردہ خامیوں میں سے اکثر میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور وہ تمام دلائل جو انہوں نے امام مالکؒ کے خلاف قائم کیے ہیں بعینہٖ ان کے خلاف قائم ہو جاتے ہیں۔ وہ موقع یہ ہے کہ امام محمدؒ کا قول ہے کہ اگر رہزنوں کی ایک جماعت نے مسافروں پر ڈاکہ مارا اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اور اس جماعت کے ساتھ مددگاروں کا ایک گروہ ہے۔ اور وہ ایسی جگہ پر ہے کہ شور و ہنگامہ تو سُن رہا ہے مگر وہ حملہ آور جماعت کو کشت و خون کرتے نہیں دیکھ رہا ہے تو قاتلوں اور مددگاروں دونوں کو تیغ زد کیا جائے گا۔ قاتل اپنے قتل کی وجہ سے مورد قصاص ٹھہریں گے، اور مددگاروں کو اس لیے قتل کیا جائے گا کہ قاتلوں نے اُن کے بل بوتے پر کشت و خون کیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن حسنؒ سے دریافت کیا کہ آپ کو اس بارے میں کوئی روایت بھی ملی ہے؟ انھوں نے کہی

Marfat.com

روایت کا ذکر نہ کیا۔ میں نے کہا : "آپ کا کیا خیال ہے کہ ایک کمزور شخص ایک طاقتور شخص کو قتل کرنا چاہتا ہے، اور وہ ایک دوسرے طاقتور شخص سے کہتا ہے کہ اگر میں ناتواں نہ ہوتا تو فلاں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا۔ طاقتور شخص اس سے کہتا ہے کہ چلو میں تمہیں اُس کی مُشکیں باندھ دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ اس کی مُشکیں کَس دیتا ہے اور اُس کے سینے پر سوار ہو جاتا ہے اور سوار ہو کر اُس کی ڈاڑھی ہٹاتا ہے تاکہ گلا نمایاں ہو جائے۔ اور پھر اُسے چھری دے دیتا ہے اور وہ چھری سے اُسے ذبح کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ـــــ اہلِ مدینہ کے مسلک کے برخلاف ـــــ صرف ذبح کرنے والے پر حکمِ قتل لگائیں گے۔ کیونکہ فعلِ قتل اُس کے ہاتھوں سرانجام پایا ہے۔ اور اُس شخص کی مدد کا لحاظ نہ کریں گے جو قتل کا سبب تھا۔ کیونکہ فعل اور سببِ فعل دو مختلف چیزیں ہیں۔ خدا صرف فعل پر انسانوں سے مواخذہ کرتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں قتل پر کس کا تعاون زیادہ مؤثر اور کارگر ہے۔ کیا راہزنوں کے لیے مددگار گروہ کا یا ناتواں شخص کے لیے طاقتور کا؟ پھر آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر راہزنوں کا مددگار گروہ ایسی جگہ ہو جہاں سے وہ آواز نہ سُن رہا ہو، اور گو وہ ڈاکوؤں کو قتل کرتے دیکھ رہا ہو اور اُن کے لیے موجبِ قوت و حوصلہ ہو رہا ہو تو مستوجبِ قتل نہیں ہوگا، بلکہ مستوجبِ تعزیر ہوگا۔ تو میں کہتا ہوں کہ آواز سن لینے کی صورت میں آپ اُس پر کیوں حدِّ قصاص جاری کر

Marfat.com

دیتے ہیں ؟ (کیونکہ آپ کے نزدیک تو نفسِ فعل پر قصاص واجب ہونا چاہیے)
اس پر امام محمدؒ بن حسن کہنے لگے کہ "آپ کے ساتھی مالک بن انسؒ بھی
مددگار گروہ کو قتل کر دینے کے بارے میں میری رائے سے متفق ہیں"۔
میں نے کہا: "کیا امام مالکؒ کے اتفاق سے آپ کا قول دوسروں کے لیے
حجت بن سکتا ہے؟ جب آپ کا قول حجت نہیں ہے تو کیا ہمارے ساتھی
امام مالک کا اسی قسم کا قول، جس پر آپ کو اعتراض ہے حجت ہوگا؟ محمدؒ
بن حسن نے پوچھا: تو کیا آپ کی یہ رائے نہیں ہے؟ میں نے کہا: نہیں،
اور نہ میں کسی عقلمند آدمی کو اس رائے کے حق میں پاتا ہوں۔ اور جو ایسی
رائے رکھے، وہ کتاب اللہ اور قیاسِ معقول کے دائرے سے نکل گیا"۔

الغرض یہ پوری کتاب اسی طرز پر ہے اور اس کا ہر مسئلہ اسی قسم
کے دلچسپ، اور معنی آفرین مناقشات اور فریقین کے پُرزور استدلالات
کا مرقع ہے۔ ہمارے سرمایۂ قانون میں یہ کتاب بڑی قدر و قیمت کی
حامل ہے، اور اس لائق ہے کہ قانون کا ہر طالبِ علم اور اس فن سے
ممارست رکھنے والا ہر شخص اس کے مطالعہ سے محروم نہ ہونا چاہیے۔

پانچویں قسم ان کتابوں کی ہے جن میں مختلف مدارسِ فقہیہ کے
احکام و مجتہدات کا موازنہ کیا گیا ہے۔ بعض کتابوں میں یہ موازنہ تمام
فقہی مسلکوں کے مابین کیا گیا ہے اور بعض میں صرف دو یا تین مسلکوں
تک محدود ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی نوعیت وہی ہے جو جدید علمِ قانون
میں قانون کے تقابلی مطالعہ کی کتابوں کی ہے۔ امام محمد کی مؤطا کو اس

Marfat.com

نوعیت کے قانونی لٹریچر میں سرِفہرست رکھا جا سکتا ہے۔ مؤلف موصوف نے اسے مؤطا امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور امام مالکؒ کی مؤطا کا اس میں جائزہ لیا ہے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ مؤطا کی احادیث کو نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مخالف یا موافق عمل نقل کرتے ہیں۔ اور اگر امام صاحب کا عمل ان کے خلاف ہو تو وجوہ اختلاف پر بحث کرتے ہیں۔ بعد کے فقہائے کرام کے اندر بھی قانون کے متقابل مطالعہ میں بڑا شغف و اہتمام پایا جاتا رہا ہے۔ بلکہ اس میں ان کی دلچسپیوں کا یہ حال رہا ہے۔ کہ "علم الاختلافات" کے نام سے فقہ کے اندر ایک مستقل فن وجود میں آگیا ہے۔ جس میں مذاہب اربعہ کے آراء و اقوال کا موازنہ کیا جاتا ہے، وجوہِ اختلاف اور ماخذ استدلال کی تحقیق کی جاتی ہے اور اس کے حسن و قبح پر بحثیں کی جاتی ہیں۔ اس فن میں سب سے زیادہ جس کتاب نے شہرت حاصل کی ہے وہ "بدایۃ المجتہد" ہے۔ جو قرطبہ کے قاضی فیلسوفِ اسلام ابن رشد کی تالیف ہے۔

فنِ قانون پر بے نظیر تالیفات میں سے چھٹی قسم میں وہ عظیم ذخیرۂ کتب آتا ہے جن میں کسی ایک مذہب کے آراء و مسائل کو جمع کیا گیا ہے۔ اور مسائل کے ساتھ ساتھ اس مذہب کے اصول و مبادی کا تذکرہ بھی ہے۔ اور یہاں دلائل و شواہد کی ضرورت ہے وہاں دلائل و شواہد بھی لائے گئے ہیں۔ اور حسبِ اقتضاء مخالف آراء پر تبصرہ و تنقید بھی کی گئی ہے۔ ہمارے علم میں اس نوع کا سب سے اعلیٰ نمونہ امام

Marfat.com

شافعی رحمہ اللہ کی کتاب "الام" ہے۔ اس عظیم القدر کتاب کا ایک اقتباس ہم امام محمد کی "الرد علیٰ اہل المدینہ" کے ذکر میں آپ کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ اسی اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام شافعیؒ رحمہ اللہ اپنے مسلک کے اثبات میں اور اپنے اقوال کے دفاع میں کیا اسلوبِ بیان اور تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

ساتویں اور آخری قسم کے دامن میں فقہ کا اصولی لٹریچر آتا ہے۔ یہ لٹریچر فلسفیانہ تعمق، فہم و بصیرت اور فکر و نظر کے اُن تحیّر خیز خزانوں سے عبارت ہے جنہیں مجتہدین اور فقہائے کرام نے علمِ اصولِ فقہ کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اصولِ فقہ کی کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب کے نزدیک شریعت کے مآخذ و مصادر کیا ہیں، اُس کا طریقہ اجتہاد کیا ہے، اور وہ اصول و قواعد کیا ہیں جن پر اُس کا اجتہاد مبنی ہے۔ اور دوسروں کے اجتہاد سے ممتاز ہوتا ہے۔ اور پھر ان اصولوں کی تشریح و توضیح کے ضمن میں احکام و مسائل بھی بکثرت ملتے ہیں۔ یہ شرف امام شافعیؒ کو حاصل ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس فن کی داغ بیل ڈالی اور اس پر باقاعدہ کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب الرسالہ کے نام سے مشہور ہے۔ امام شافعیؒ رحمہ اللہ کے بعد اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ علماء کا ایک گروہِ کثیر اس طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی ترتیب و تدوین میں بڑی عرق ریزیاں کی گئیں اور بالآخر یہ ارتقاء اور پختگی کے اس درجہ تک پہنچ گیا کہ اسے مستقل بالذات علم کی

Marfat.com

حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور آج تک امت کے اہلِ علم میں اصولِ فقہ کے نام سے متداول ہے۔

(ترجمان القرآن : اکتوبر و نومبر ۱۹۵۷ء)

Marfat.com

امام ابنِ قیمؒ :

امام ابن قیمؒ ساتویں صدی ہجری کے مجدد شہیر اور مجاہد کبیر امام ابن تیمیہؒ کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ہیں۔ علومِ دین میں یکتائے روزگار تھے۔ اپنے استاذ کی طرح مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے۔ ابن رجب حنبلیؒ لکھتے ہیں: "میں نے کسی کو امام ابن قیمؒ کا ہم پلہ نہیں دیکھا، نہ ورع و عبادت میں اور نہ بحر کتاب و سنت کی شناوری میں"۔ بارہا مبتلائے آزمائش ہوئے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ جب آخری مرتبہ قلعہ دمشق میں قید کیے گئے تو امام موصوف بھی ان کے ساتھ قید ہوئے۔ مگر ان کو اپنے استاذ سے علیحدہ رکھا گیا، اور اس وقت رہا کیا گیا جب ان کے استاذ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ قیدخانہ میں ان کا شغل صرف قرآن کی تلاوت و مطالعہ تھا۔ اس مطالعہ نے امام پر علومِ قرآنی اور حکمتِ دین کے بے شمار خزانے وا کر دیے۔ امام موصوف نے تصوف کی حقیقت اور صوفیہ کے اسرار و رموز پر بھی بڑی ٹھوس تنقید کی ہے،

Marfat.com

اوران کے غلط نظریات کا تار و پود بکھیرا ہے۔

کئی بار حج سے مشرف ہوئے اور مسجد حرام میں گوشہ نشینی کی۔ تصنیفات کا بہت بڑا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ آپ کی مشہور کتابیں یہ ہیں:

تہذیب سنن ابی داؤد، اعلام الموقعین (زیرِ نظر مقالہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے)۔ زاد المعاد، مدارج السالکین، بدائع الفوائد، الصواعق المرسلہ، سفر الہجرتین، مفتاح دار السعادۃ، الوابل الصیب۔

آپ ۶۹۱ھ میں جوزیہ میں پیدا ہوئے، اور رجب ۷۵۱ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ آپ کا پورا نام شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابو بکر ہے۔ رضی اللہ عنہ۔

Marfat.com

شریعت میں مصلحت وضرورت کا لحاظ

(یہ مقالہ امام ابنِ قیم کی مشہور کتاب "اعلام الموقعین" کا ایک باب ہے۔ اس میں انہوں نے شریعت کے اس قاعدے پر بحث کی ہے کہ زمان ومکان اور حالات وعادات کے تغیّر سے احکامِ شریعت کی تبدیلی کن مصالح اور شرائط کے تحت رونما ہوتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور ائمۂ مجتہدین سے ہمیں اس بارے میں کیا رہنمائی ملتی ہے۔ یہ بحث امام موصوف نے بڑی تفصیل و وضاحت اور مثالوں کی روشنی میں بیان کی ہے۔ لیکن ہم نے طوالتِ کلام سے بچتے ہوئے زیرِ نظر مقالہ میں صرف ان حصّوں کو لیا ہے جو اس مسئلہ سے براہِ راست متعلق ہیں۔ ضمنی جزئیات اور فقہی تفصیلات سے تعرض نہیں کیا۔ جو صاحب امام رحمہ اللہ کی پوری بحث کو جو نو فصلوں پر مشتمل ہے، معلوم کرنا چاہتے ہوں، وہ اعلام الموقعین ج ۳ صفحہ ۱ سے پڑھ لیں ---- خ خ)

Marfat.com

"زمان و مکان کے تغیر، حالات و نیات کے اختلاف اور عرف و عادت کی تبدیلی سے فتویٰ بدل جاتا ہے"۔ فتویٰ میں تبدیلی کا یہ بڑا اہم اصول ہے۔ جو لوگ اس کی حقیقت کو نہیں جانتے وہ شریعتِ اسلامی کے بارے میں زبردست غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، جن کی وجہ سے شریعت کے اندر تنگی، مشقت اور تکلیف مالایطاق کی ایسی صورتیں فرض کرلی گئی ہیں جن کے بارے میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ بیضاء — جو انسانی مصالح کا پورا پورا لحاظ کرتی ہے — ان کی روادار نہیں ہے۔ کیونکہ شریعت کی بنیاد حکمت اور بندوں کے دینوی و اخروی مصالح پر رکھی گئی ہے۔ بلکہ شریعت تو مجسّم عدل و مساوات، یکسر رحم و ہمدردی اور سراسر مصلحت و حکمت ہے۔ اس لیے ہر وہ مسئلہ جو انصاف کے بجائے ظلم و زیادتی کا، سہولت کے بجائے مشقت کا، مصلحت کے بجائے مفسدت کا اور حکمت کے بجائے لغویت کا سبب بن جائے وہ ہرگز شریعت کا مسئلہ نہیں ہو سکتا خواہ تاویل و توجیہ کے ذریعے اسے نظامِ شریعت میں زبردستی ٹھونس دیا جائے۔ دراصل شریعت نام ہے انسانوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی عدل گستری کا، مخلوق پر اس کی رحمت و مہربانی کا، روئے زمین پر اس کے سایۂ کرم کا، بلکہ شریعت عبارت ہے اس حکمتِ الٰہی اور تدبیرِ خداوندی سے، جس کی جلوہ نمایاں اس کی ہستی کی مکمل شہادت اور اس کے رسولوں کی صداقت کا محکم ثبوت فراہم کر رہی ہیں — یہ وہ خدائی نور ہے کہ اسی سے ارباب بصیرت نے روشنی حاصل کی، یہ وہ ربانی قندیل ہے کہ جہانِ

Marfat.com

حق اسی کی بدولت راہ یاب ہوئے، یہ وہ نسخۂ شفائے کامل ہے کہ اسی کے فیض سے ہر درد مند نے دوا پائی۔ یہ وہ صراطِ مستقیم ہے کہ جو اس پر گامزن ہوا وہ راہِ اعتدال سے ہٹا نہ بھٹکا۔ شریعت آنکھوں کے لیے نور ہے دلوں کے لیے زندگی اور روحوں کے لیے وجہِ مسرت ہے۔ حیات و حرکت، سلامتی و حفاظت، غذا و دوا اور نور و شفا کا وجود اسی کا مرہونِ منت ہے۔ کائنات کی ہر خوبی اسی سے ماخوذ و مستفاد ہے اور ہر خرابی اس کے خلاف کا نتیجہ ہے۔ اگر شریعتِ الٰہی کے یہ بیش بہا کچھ نشانات بھی نہ ہوتے تو لامحالہ دنیا کا بازار اجڑ چکا ہوتا اور بساطِ عالم لپٹ چکی ہوتی۔ چونکہ نوعِ بشر کی تحفظ اور کائنات کا نظم شریعت کے وجود سے وابستہ ہے اور شریعت ہی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے زمینوں اور آسمانوں کو زائل ہونے سے تھام رکھا ہے تاکہ جب مشیتِ ایزدی خراب آباد عالم کی بساط لپیٹنے کا فیصلہ کرے گی تو شریعت کے یہ باقیماندہ نقوش بھی محو کر دیے جائیں گے۔ پس وہ شریعت جس کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں کائنات کی جان، فلاح کا مدار اور معاش و معاد کی سعادت کا مرکز ہے۔

اب ہم ذیل میں اللہ کی تائید و نصرت سے تغیرِ احکام کے اصول کو چند صحیح مثالوں سے تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

منکر کو مٹانے میں حالات کا لحاظ

انکارِ منکر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لیے شریعت حقہ کے نہایت اہم واجبات میں

Marfat.com

سے قرار دیا ہے تاکہ منکر کے ازالے سے وہ معروف حاصل ہو جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی منکر کی مخالفت اس سے عظیم تر اور خدا و رسول کے نزدیک مبغوض تر منکر برپا کر دینے کا موجب بنتی ہو تو اس سے تعرّض کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا وجود بھی بجائے خود اللہ کو ناپسند ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والے غضب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً امراء و سلاطین کے اندر فسق و فجور دیکھ کر ان کے خلاف خروج کر لینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ چیز تمام فتنوں کی جڑ ہے، اور اس سے قیامت تک کے لیے شر و فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ چنانچہ جب صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے حکمرانوں کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت طلب کی جو نماز کو وقت پر ادا نہ کریں تو آپؐ نے اس سے روکا اور فرمایا: "لَا، مَا اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ" (نہیں، جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں)۔ نیز آپؐ نے فرمایا:

من رأی من امیرہ ما یکرھہ فلیصبر ولا ینزعن یدا من طاعتہ۔

جو شخص اپنے امیر کے اندر کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو وہ صبر سے کام لے اور اس کی اطاعت سے دست کش نہ ہو۔

چنانچہ اسلامی تاریخ میں برپا ہونے والے فتنوں اور مسلمانوں کی باہمی آویزشوں کے دوران اسلام پر جو کچھ بیتی ہے، جو شخص اس کا بنظر غائر مطالعہ کرے گا اُسے معلوم ہوگا کہ اس کا اصل سبب یہی تھا کہ مذکورۂ بالا اصول

Marfat.com

کو نظر انداز کر دیا گیا اور مُنکر کو برداشت نہ کیا جا سکا بلکہ اُس کی بیخ کنی کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ کوشش مزید فتنہ و فساد رونما کر دینے اور سابق سے بھی قبیح تر مُنکَر کو جنم دینے پر منتج ہوئی۔ مکّہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے مُنکرات کا ارتکاب ہوتا تھا۔ مگر آپ اُن کو مٹانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اس لیے خاموش رہتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ جب بہ تائید ایزدی مکّہ زیر نگیں ہو گیا، اور دار الاسلام بن گیا تو آپؐ نے عمارتِ کعبہ میں تغیّر و تبدل کر کے اسے بنائے ابراہیمی پر قائم کرنے کا عزم کر لیا۔ لیکن پھر آپ قدرت و استطاعت کے باوجود صرف اس اندیشے کی بنا پر رُک گئے کہ قریش جو نئے نئے کفر سے نکل کر اسلام کے دامن میں آ رہے ہیں اس تبدیلی کو برداشت نہیں کریں گے اور نتیجہ یہ ہو گا کہ جو خرابی اب موجود ہے اس کی بہ نسبت بڑی خرابی رونما ہو جائے گی۔ اسی اصول کے تحت آپؐ نے فاسق و ظالم امراء کے مقابلے میں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی، کیونکہ اس سے ایسی خرابیاں واقع ہونے کا اندیشہ ہے جو ان کے شر سے عظیم تر ہوں۔

انکارِ مُنکر کی چار صورتیں

انکارِ مُنکَر کے چار درجے ہیں:

۱۔ مُنکَر کو زائل کر کے، اس کی جگہ معروف کو قائم کر دیا جائے۔

۲۔ مُنکَر کو بالکلیہ زائل نہ کیا جا سکے تاہم اس کی شدّت میں کمی کر دی جائے۔

Marfat.com

۳- ایک منکر کو مٹایا جائے اور اُسی پیمانے کا دوسرا منکر برپا ہو جائے۔

۴- منکر کو مٹانے کے نتیجے میں اس سے بدتر اور خطرناک تر منکر اُٹھ کھڑا ہو۔

پہلے دو درجوں میں نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دینا عین تقاضائے شریعت ہے۔ تیسرا درجہ محلِ اجتہاد میں ہے۔ یعنی اس میں غور و فکر کے بعد کوئی سا پہلو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چوتھے درجہ میں منکر سے تعرض کرنا حرام ہے۔ چنانچہ تم اگر اوباش لوگوں کو شطرنج بازی میں مگن پاؤ تو تم اگر انہیں شطرنج سے روک کر کسی ایسے کھیل میں لگا سکو جو خدا اور رسول نے پسند کیا ہو مثلاً تیر اندازی یا اسپ دوانی وغیرہ تو بہتر ورنہ یونہی ان پر تمہارا نکیر کرنا بصیرت و تفقہ کے دیوالیہ پن کی علامت ہوگی۔ اسی طرح ایک جگہ تم دیکھتے ہو کہ فساق و فجار کا مجمع ہے۔ وادیٔ لہو و لعب دی جا رہی ہے یا رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی ہے تو اگر تم کسی تدبیر سے انہیں اللہ کی اطاعت و عبادت کی جانب مبذول کر سکو تو یہ عین مقصود و مطلوب ہے اور اگر یہ نہ کیا جا سکے تو ان کو اپنے حال میں مست رہنے دینا اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں دریغ تر فتنہ پردازی کے لیے فارغ کر دو، حالانکہ جس چیز میں وہ اب مستغرق ہیں وہ انہیں اس فتنہ پردازی سے غافل کیے ہوئے ہے۔ ایسے ہی اگر ایک شخص فحش قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے میں منہمک ہے۔ اگر اُسے ایسی چیزوں کے

Marfat.com

مطالعہ سے منع کرنے کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ بدعات، وضلالات اور طلسم وجادو کی کتابوں کی طرف رجوع کرے گا تو اُسے پہلی نوعیت کی کتابوں ہی میں مشغول رہنے دیا جائے۔ الغرض اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ روحہٗ فرماتے تھے کہ فتنۂ تاتار کے زمانہ میں ہمارا گزر ایک گروہ پر ہوا جو شراب و کباب میں مشغول تھا۔ میرے ایک ساتھی نے ان لوگوں کو شراب نوشی سے منع کرنا چاہا مگر میں نے اسے ٹوکا کہ بندۂ خدا شراب اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روکتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے حرام کر دیا ہے۔ اور یہاں حال یہ ہے کہ شراب ان ظالموں کو بڑے فتنے یعنی قتلِ نفوس، سلبِ اموال اور عورتوں اور بچوں پر دست درازی سے روکے ہوئے ہے۔ لہٰذا ان کو ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا جائے۔

قطع ید کے حکم میں مصلحت کا لحاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقع پر چوروں کے ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد) ملاحظہ کیجیے۔ قطعِ ید اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدّوں میں سے ایک حدّ ہے۔ لیکن چونکہ جنگ کے دوران اقامتِ حدّ میں اندیشہ ہے کہ مجرم حمیّتِ شیطانی اور جوشِ نفسانی سے مغلوب ہو کر کفار و مشرکین سے جا ملے گا اور یہ بات خدا کے نزدیک حدود کے معطل یا موقوف ہو جانے سے زیادہ مبغوض ہے۔ اس لیے شارع علیہ السلام نے جنگ کے دوران اُسے نافذ کرنے کی ممانعت فرما دی۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ، ابو الدرداءؓ اور حذیفہؓ وغیرہم نے فرمایا

Marfat.com

ہے۔ اس بناء پر ائمہ اسلام میں سے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، امام اوزاعی اور دوسرے حضرات نے یہ اصول اختیار کیا ہے کہ اِنَّ الْحُدُوْدَ لَا تُقَامُ فِیْ اَرْضِ الْعَدُوِّ (دشمن کی سرزمین میں حدود اللہ جاری نہ کی جائیں)۔ ابوالقاسم خرقی نے بھی اپنے "مختصر" میں اس اصول کو بیان کیا ہے لیکن اُن کے الفاظ یہ ہیں: لَا یُقَامُ الْحَدُّ عَلٰی مُسْلِمٍ فِیْ اَرْضِ الْعَدُوِّ (دشمنوں کے علاقہ میں کسی مسلمان پر حد جاری نہیں کی جائے گی)۔

ایک بار جنگ کے موقع پر ایک فوجی نے بسر بن ارطاۃ کی ڈھال چُرالی۔ اُسے جب گرفتار کر کے بسر کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے فرمایا:

لولا انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: لا تقطع الایدی فی الغزو لقطعت یدک (ابوداؤد)

اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہ سُنا ہوتا کہ "دورانِ جنگ میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں" تو میں ضرور تیرا ہاتھ کاٹ دیتا۔

ابو محمد المقدسی کہتے ہیں کہ وھو اجماع الصحابۃ (اس اصول پر تمام صحابہ کا اجماع ہے)۔ سعید بن منصور نے اپنے سنن میں احوص بن حکیم کی سند سے روایت کیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے افواج کے نام فرمان جاری کیا تھا کہ:

لا یجلدن امیر جیش ولا سریۃ ولا رجل من

کسی سپہ سالار، کسی سردار دستہ یا کسی مسلمان شخص پر حالتِ جنگ میں

Marfat.com

المسلمین وھو غازٍ حتی یقطع الدرب قافلا لئلا تلحقہ حمیۃ الشیطان فیلحق بالکفّار۔

حد نہ جاری کی جائے۔ تاوقتیکہ وہ سرحدوں کو عبور کر کے اپنے علاقے میں نہ آ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر حمیّتِ شیطانی کا غلبہ ہو جائے اور وہ کفار سے جا ملے۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ علقمہ کا بیان ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے جو روم پر حملہ آور تھا۔ حذیفہ ابن یمان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ولید بن عتبہ ہمارے سردار تھے۔ انہوں نے وہاں شراب پی لی۔ ہم نے ان پر حد جاری کرنا چاہی مگر حذیفہ نے روک دیا اور کہا: کیا تم اس حال میں اپنے امیر پر حد جاری کرنا چاہتے ہو جب کہ دشمن تمہارے سامنے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر دشمن کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔"

جنگِ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقّاص کے پاس ابو محجن ثقفی جرمِ بادہ خواری میں گرفتار ہو کر آئے۔ حضرت سعد نے انہیں قید کر دیا۔ جب معرکۂ کارزار گرم ہوا تو ابو محجن نے اسلامی فوج کے حالات دیکھ کر کہا:

کفی حزنا ان تطرد الخیل بالقنا واترک مشدودا علی وثاقیا

(بڑے رنج کی بات ہے کہ دشمن کے نیزے ہمارے گھوڑوں کو پیچھے پھینکتے رہیں اور میں یہاں زنجیروں میں جکڑا ہوا پڑا رہوں)۔

Marfat.com

آخر کار ابو محجن نے حضرت سعدؓ کی بیوی سے درخواست کی کہ آپ مجھے کھول دیں۔ اگر خدا نے مجھے رکھ لیا تو واپس آکر یہ زنجیریں پاؤں میں ڈال لوں گا، اور اگر مارا گیا تو جھگڑا ہی چکتا ہو جائے گا۔ حضرت سعدؓ کی بیوی نے ان کے بند کھول دیے۔ انہوں نے حضرت سعدؓ ہی کا گھوڑا لیا (جو اتفاق سے فارغ تھا، کیونکہ حضرت سعد اس روز ایک زخم کی تکلیف کی وجہ سے قتال کے لیے نہ نکل سکے تھے) اور لشکر کفار پر ہلہ بول دیا اور اس قدر دادِ شجاعت دی کہ جس سمت ٹوٹ پڑتے تھے صفیں پلٹ دیتے تھے۔ ان کے حیرت انگیز کارنامے کو دیکھ کر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ شاید یہ کوئی فرشتہ آسمان سے مدد کے لیے اتر آیا ہے۔ حضرت سعدؓ بھی ان کی یہ بہادری عذیب نامی مقام پر کھڑے دیکھ رہے تھے، اور دادِ تحسین دے رہے تھے۔ آخر کار ابو محجن نے دشمن کو تہ و بالا کر دیا اور واپس آکر حسبِ وعدہ بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعدؓ کی بیوی نے ان کے سامنے یہ سارا قصہ بیان کیا۔ حضرت سعدؓ نے یہ سن کر فرمایا: خدا کی قسم! میں ایسے شخص کو ہرگز سزا نہ دوں گا جس نے مسلمانوں کی خاطر اس قدر جاں نثاری دکھائی ہے۔" ابو محجن نے اس فیصلے سے متاثر ہو کر کہا: "سعد، مجھے کوڑے مار کر پاک کیا جاتا تھا تو میں برابر شراب پیتا رہا۔ اب جب آپ نے میری حد سزا لگا قرار دی ہے (یعنی ساقط کر دی ہے) تو خدا کی قسم! میں آئندہ اس بلا کو منہ نہیں لگاؤں گا۔"

اس میں کوئی بات نص یا قیاس یا اصولِ شریعت میں سے کسی

Marfat.com

اصل کے خلاف نہیں ہے، نہ اجماع کے مخالف ہے۔ بلکہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اسی پر صحابہ کا اجماع ہے تو زیادہ درست ہوگا۔ چنانچہ شیخ ابن قدامہ اپنی کتاب المغنی میں رقمطراز ہیں: ھذا اتفاق لم یظھر خلافہ (یہ متفق علیہ ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف ظاہر نہیں ہوا)۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد امام ابن قیم تاخیر حد کی ضرورت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: میرے نزدیک اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقامت حد میں یہ تاخیر دو بہتر مصالح میں سے کسی ایک مصلحت کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ خود مسلمانوں کو ایک جنگ آزما سپاہی کی ضرورت ہو اور دوسرے یہ کہ مجرم کے مرتد ہو جانے اور کفار سے مل جانے کا کھٹکا ہو۔ عوارض کی بنا پر حد کو مؤخر کر دینے کی تصریح خود شریعت میں وارد ہے۔ مثلاً حاملہ عورت کی یا جس عورت کا بچہ دودھ پیتا ہو اس کی حد ملتوی کر دی جاتی ہے۔ مریض پر حالتِ مرض میں حد جاری کرنا ممنوع ہے۔ سخت گرمی اور سخت سردی کے وقت بھی حد نافذ کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اگر شریعت میں مجرم (یا ایک فرد) کے مصالح کو ملحوظ رکھ کر حد مؤخر کی جا سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ مصلحتِ دین کی خاطر اس کو مؤخر کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

سعد بن ابی وقاص نے ابو محجن کے ساتھ جو معاملہ کیا اس سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سعد نے ابو محجن سے حد ملتوی نہیں کی بلکہ منسوخ ہی کر دی تھی تو کیا حد منسوخ کر دینا جائز ہے؟ اس کا جواب یہ

Marfat.com

ہے کہ اوّلاً تو ہمارے لیے حضرت سعدؓ کا یہ عمل قابلِ حجت نہیں ہے کہ اس سے تنسیخِ حد کا اصول قائم کر لیا جائے، اور ثانیاً یہ کہ جو لوگ حضرت سعدؓ کے قول سے استشہاد کرتے ہیں وہ بھی اس سے صرف یہ استنباط کرتے ہیں کہ دارالحرب میں مسلمان پر حد واجب نہیں ہے۔ جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعدؓ نے اس معاملہ میں سنت اللہ کی پیروی کی ہے۔ چنانچہ حضرت سعدؓ نے جب ابو محجن کے اندر دین کی غیر معمولی تاثیر، جہاد کا جذبہ اور جان افشردگی کا شوق موجزن دیکھا تو اُن کی حدّ کو درگزر کر دیا۔ اس لیے کہ ابو محجنؓ سے جن نیکیوں کا صدور ہوا وہ اُن کی ایک بدی پر چھا گئیں، اور اس کی مثال اُس قطرۂ نجاست کی سی ہو گئی جو سمندر میں تحلیل ہو گیا ہو۔ علاوہ ازیں عین میدانِ کارزار میں حضرت سعدؓ نے بچشم خود ابو محجن کی سچی توبہ کے آثار دیکھ لیے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ کسی مسلمان کے متعلق یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسے کڑے وقت میں بھی جب کہ موت سامنے دیکھ رہا ہو، اور ہر لحہ دربارِ الٰہی میں حاضری کا گمان ہو، اپنے گناہ پر اصرار کرے گا۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو حوالے کر کے اور اپنے پاؤں میں برضائے خود بیڑیاں ڈال کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ فی الواقع اس بات کے مستحق ہیں کہ اُن کی سزا کو عفو کے آبِ زلال سے دھو دیا جائے۔"

نفاذِ احکام میں حکمتِ نبوی کے نظائر

یہ تبصرہ کرنے کے بعد امامِ موصوفؒ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے عمل کی چند نظیریں نقل

Marfat.com

کی ہیں جن سے اس قسم کی رعایت ثابت ہے :-

۱- ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، یارسولؐ اللہ! میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں، مجھ پر حد جاری فرمایئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا، "کیا تم نے ابھی ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟" اُس نے عرض کیا، "جی ہاں" فرمایا "جا اللہ نے تیرا قصور معاف کر دیا۔" اس درگزر اور دفعِ حدّ کی برکت اس طرح ظاہر ہوئی کہ اس نے صدقِ دل سے توبہ کر لی اور وہیں اعلان کر دیا "خدا کی قسم میں آئندہ ہرگز (اور دوسری روایت میں ہے ابدالاباد تک) شراب نہیں پیوں گا۔" ایک اور روایت میں ہے، اس نے کہا، "تمہارے کوڑوں کی وجہ سے میں شراب ترک کر دینا اپنی شان کے منافی سمجھتا تھا۔ جب تم نے مجھ کو چھوڑ دیا ہے تو خدا کی قسم! میں آئندہ اس ملعون کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

۲- حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی جذیمہ کے ساتھ جو نامناسب کارروائی کی تھی، اُس کا علم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا تو آپؐ نے صرف اتنا فرمایا: اللھم انی ابرأ الیک مما صنع خالد (اے اللہ! جس فعل کا ارتکاب خالد نے کیا ہے میں تیرے حضور اس سے اظہارِ براءت کرتا ہوں) اس سے زیادہ جناب رسالتمآبؐ نے حضرت خالدؓ کی عمدہ صلاحیتوں، خدماتِ جلیلہ اور نصرتِ اسلام کا پاس کرتے ہوئے ان پر کسی قسم کی گرفت نہیں فرمائی۔ بہرحال یہ اصول بڑی اہمیت و افادیت کا حامل ہے اور اس کے فلسفہ و رموز تک صرف وہی رسائی

Marfat.com

حاصل کر سکتا ہے جو امر و نہی اور ثواب و عقاب کے باہمی ربط و تعلق کا گہرا مطالعہ کرے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ تائب کو عذاب نہیں دیتا، اسی طرح تائب پر حد بھی نہیں قائم کی جاتی۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے واضح حکم کے ذریعے ان محاربین اور مفسدین پر سے حد ساقط کر دی ہے جو مسلمانوں کے قابو میں آنے سے پہلے توبہ کر لیں۔ اس حکم میں یہ تنبیہ مضمر ہے کہ جب اس قدر سنگین جرم کی سزا توبہ و رجوع الی اللہ سے معاف ہو سکتی ہے تو محاربہ و فساد سے کم تر جرم کی سزا توبہ و انابت سے بدرجۂ اولیٰ معاف ہونی چاہیے۔

۱۲۔ نسائی کی ایک روایت میں منقول ہے کہ ایک عورت اندھیرے منہ صبح کی نماز کے لیے مسجد کی طرف نکلی۔ راستے میں ایک شخص نے اس پر ہاتھ ڈالا اور اس کی عصمت دری کرنے لگا۔ عورت نے شور مچانا شروع کر دیا اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو مدد کے لیے پکارا۔ وہ شخص جب آیا تو مجرم بھاگ گیا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑا۔ اتنے میں کچھ اور لوگ گزرے۔ عورت نے ان سے بھی فریاد کی۔ وہ بھی فوراً مجرم کی تلاش میں دوڑے۔ مجرم تو کہیں آگے نکل گیا اور انہوں نے اسی شخص کو جا لیا جو خود عورت کی مدد کو نکلا تھا۔ اس کو پکڑ کر عورت کے پاس لے آئے۔ اس نے کہا میں تو اس کی مدد کو لپکا تھا۔ جس شخص نے اس پر دست درازی کی ہے وہ بھاگ گیا ہے۔ مگر کسی نے اس کی نہ سنی۔ آخر کار وہ لوگ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔

Marfat.com

عورت نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اسی شخص نے میری عصمت دری کی ہے۔ لوگوں نے بھی کہا کہ ہم نے اس شخص کو بھاگتے ہوئے پکڑا ہے۔ اس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: میں تو دراصل اس عورت کی فریاد سُن کر مدد کے لیے آیا تھا اور مجرم کو پکڑنے کے لیے بھاگ رہا تھا کہ ان لوگوں نے راستہ میں مجھے دوڑتے ہوئے پایا اور دھر لائے۔ عورت نے کہا: "جھوٹ کہتا ہے۔ اسی نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔" حضورؐ نے حکم دیا کہ اسے لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔ مجمع میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر کہا: "اس کو سنگسار نہ کرو، مجھے سنگسار کرو۔ یہ فعل مجھ سے سرزد ہوا ہے۔" اب تینوں فریق رسول اللہؐ کے سامنے موجود تھے۔ ایک، جس نے عصمت دری کی۔ دوسرا، جو عورت کی مدد کے لیے بڑھا تھا۔ اور تیسری خود عورت۔ آپؐ نے پہلے شخص (اقبالِ جرم کر لینے والے) سے فرمایا: تجھے تو اللہ نے معاف کر دیا۔ دوسرے شخص کے حق میں بھی کلمۂ تحسین فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! زنا کا اعتراف کر لینے والے کو رجم کی سزا دیجیے۔" مگر آپؐ نے انکار کیا اور فرمایا: "اس نے اللہ سے توبہ کر لی ہے۔"

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد امام ابنِ قیمؒ نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جرم کے ثبوت یا اعتراف کے بغیر عورت کے مددگار کو کیوں رجم کا حکم جاری فرما دیا تھا۔ امام موصوف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلے کو فوجداری مقدمات میں قرائن

Marfat.com

اور ظاہری حالات کی شہادت کے اعتبار و استناد کی سب سے بڑی دلیل قرار دیا ہے۔ بلکہ انہوں نے مذکورہ واقعہ کی تمام جزئیات پر قانونی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بالکل درست اور قانون کے تقاضے پر مبنی ہے۔ اسی ضمن میں امام موصوف نے یہ اصول نقل کیا ہے کہ الاحکام الظاھرۃ تابعۃ الادلۃ الظاھرۃ (احکام کا اجراء ظاہری دلائل کے تحت ہوگا) اور آخر میں لکھا ہے:

"رہا معترف بالزنا سے حد کو ساقط کر دینا تو جب امیر المؤمنین عمر بن خطاب جیسے شخص کا دامنِ عفو وسیع نہ ہو سکا تو فقہاء کی کثیر تعداد کے نزدیک اس وسعت کے نہ ہونے کے اور زیادہ امکانات ہیں۔ لیکن رؤف و رحیم ہستی کے دامنِ عفو میں اس کے لیے جگہ تھی، اس لیے اُس نے فرما دیا کہ "یہ اللہ سے توبہ کر چکا ہے۔" اور سزا دینے سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ بے شک اصل مجرم نے برضا و رغبت اعترافِ جرم کر کے جس نیکی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف اللہ ہی کی مشیت سے صادر ہو سکتی ہے۔ اُس کا ایک مسلمان آدمی کو موت کے منہ سے بچا لینا، اور اپنی زندگی پر اپنے بھائی کی زندگی کو ترجیح دینا اور اپنی ذات کو خود ہلاکت کے لیے پیش کر دینا یہ اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس کے مقابلے میں اس سے سرزد ہونے والا گناہ بالکل ہیچ ہے۔ چنانچہ نیکی کی دوا نے برائی کی بیماری کی مزاحمت کی، مریض کی قوتِ مدافعت بحال تھی اس لیے مرض زائل ہو گیا اور قلب

Marfat.com

میں از سرِ نو صحت امڈ آئی اور عدالتِ نبوی سے اُسے یہ فیصلہ دے دیا گیا کہ اب ہم سزا نافذ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ سزا تطہیر و علاج ہی کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔ جب تو سزا کے بغیر ہی طاہر و تندرست ہو گیا ہے تو ہمارے عفو نے بھی تیرے لیے اپنا دامن وا کر دیا ہے۔ سبحان اللہ! کونسا فیصلہ اس فیصلہ سے بہتر ہو گا جو رحمدلی سے بھی بھرپور ہے اور حکمت اور مصلحت کے بھی مطابق ہے۔

قحط سالی میں حدِ سرقہ کی تنسیخ اور اس کے وجوہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانے میں چور کے ہاتھ کاٹ دینے کی سزا منسوخ کر دی تھی اور فرمایا تھا: لا تقطع الایدی فی عذق ولا عام سنة (کھجور کی چوری اور قحط سالی میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں)۔ السعدی کہتے ہیں، میں نے احمد بن حنبلؒ سے دریافت کیا۔ "کیا آپ کی بھی یہی رائے ہے؟" فرمایا: "بے شک"۔ میں نے مکرر پوچھا: "کیا قحط کے زمانہ میں چوری کی جائے تو آپ ہاتھ نہ کاٹیں گے؟" فرمایا: "نہیں، اگر زمانہ خشک سالی کا ہو اور لوگوں پر سختی گذر رہی ہو۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص حاجت سے مجبور ہو کر چوری کرے تو میں اُسے قطعِ ید کی سزا نہیں دوں گا۔"

السعدی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حاطب کے غلاموں کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی اس رائے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حاطب کے غلاموں نے قبیلۂ مُزَنیہ کے ایک شخص کی اونٹنی چرالی مگر گرفتار ہو گئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیے گئے۔

Marfat.com

حضرت عمرؓ کے سامنے انہوں نے چوری کا اعتراف کر لیا۔ آپ نے خاطب کے بیٹے عبدالرحمٰن کو بلا کر واقعہ کی اطلاع دی اور کثیر بن الصلت کو غلاموں کے ہاتھ کاٹ لینے کا حکم دیا۔ جب وہ غلاموں کو سزا کے لیے لے چلے تو آپ کو فوراً تنبہ ہوا اور انہیں روک دیا اور فرمایا:

"تم لوگ ان غریبوں سے کام لیتے ہو مگر ان کو بھوکا مارد یتے ہو اور اس حال میں پہنچا دیتے ہو کہ اگر ان میں سے کوئی حرام چیز بھی کھا لے تو اس کے لیے جائز ہو جائے۔ خدا کی قسم اگر میں یہ نہ جانتا ہوتا تو ضرور ان کے ہاتھ کاٹ دیتا۔ مگر اب ان کے ہاتھ کاٹنے کے بجائے تم پر ایسا تاوان ڈالوں گا کہ تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔"

اس کے بعد آپ نے مُزَنی سے اونٹنی کی قیمت دریافت کی۔ اس نے چار سو درہم بتائی۔ آپ نے غلاموں کے مالکوں کو حکم دیا کہ: "اسے آٹھ سو درہم ادا کرو۔"

امام احمد بن حنبلؒ نے ان دونوں صورتوں میں حضرت عمرؓ کا مسلک اختیار کیا ہے۔ اسماعیل ابن سعید شالنجی کی کتاب المسائل ـــــ جس کی شرح السعدی نے "المترجم" کے نام سے کی ہے ـــــ میں مذکور ہے کہ السعدی نے امام احمد بن حنبل سے سوال کیا: ایسے شخص کے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہے جو کسی شخص کے پھل درخت کے اوپر سے چوری

Marfat.com

کرلے ؟ امام صاحب نے فرمایا : مالک کو دوگنی قیمت دلوائی جائے گی ، اور چور کو عبرتناک ماردی جائے گی ۔ نیز فرمایا : "ہم جس سے حد اور قصاص کو ٹال دیتے ہیں اس پر تاوان دوگنا لگا دیتے ہیں ۔" قحط سالی میں حدّ سرقہ کے سقوط پر امام اوزاعیؒ کی بھی وہی رائے ہے جسے امام احمد بن حنبلؒ نے اختیار کیا ہے ۔ یہ رائے سراسر قیاس اور اصولِ شریعت کے تقاضے پر مبنی ہے ۔ کیونکہ جب کال پڑ جاتا ہے اور فقر و فاقہ عام ہو جاتا ہے تو عوام الناس بنیادی ضروریات کے ہاتھوں اتنے مجبور ہو جاتے ہیں کہ چور کے لیے بھی رشتۂ جسم و جان قائم رکھنے کے لیے بنیادی ضروریات کے دباؤ سے محفوظ رہنا ناممکن ہوتا ہے ۔ اور ایسے حالات میں خود صاحبِ مال کا بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ محتاج کی ضرورت کو بالمعاوضہ یا بلامعاوضہ پوری کرے ۔ اس بارے میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح قول یہی ہے کہ بلامعاوضہ ضرورت کو پورا کرے ۔ اس لیے کہ اسلام نے ہر شخص پر یہ واجب ٹھیرایا ہے کہ وہ دوسرے بھائی کی مواسات کرے ، قدرت اور استطاعت ہو تو انسانی جانوں کو بچائے اور ضرورت سے زائد مال کو محتاج پر صرف کرے ، جب کہ وہ ابتدائی لوازمِ زندگی سے بھی تنگ ہو ۔"

علامہ موصوف رحمہ اللہ نے اس موقع پر ان شبہات اور گنجائشوں کو بیان کیا ہے جن کو فقہاء نے حدِّ سرقہ منسوخ کر دینے کے لیے مؤثر و معتبر گردانا ہے ۔ اور پھر امام نے پوری قوت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ قحط سالی اور فقر و فاقہ کے غلبے کا وجود بھی دفعِ حدّ کے لیے نہایت قوی

Marfat.com

شبہ ہے۔ بلکہ ان تمام شبہات و احتمالات سے زیادہ قوی اور قابلِ لحاظ ہے جن کو اربابِ فقہ و قانون تسلیم کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں فرماتے ہیں :

"زمانۂ قحط میں حاجتمندوں اور بھوکوں کی کثرت ہوتی ہے اور یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون مستغنی ہے، اور بلا وجہ چوری کرنے والا ہے اور کس نے ضرورت سے مجبور ہو کر چوری کی ہے۔ اور اس سے یہ امر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ کون درحقیقت حدّ کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے (لہٰذا سب پر سے حد ساقط کر دی جاتی ہے)۔ البتہ جب یہ صاف واضح ہو جائے کہ چوری کرنے والے کو واقعی اس غلط اقدام کی ضرورت نہ تھی تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹ دیا جائے گا۔"

احکام کی تعبیر میں عُرف و عادت کا لحاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر میں کھجور، جو، کشمش اور پنیر کا ایک صاع واجب فرمایا ہے آپ کے زمانہ میں اہلِ مدینہ کی یہی عام غذائیں تھیں۔ لیکن اگر کسی شہر یا بستی کے باشندوں کی غذا ان سے مختلف ہو۔ مثلاً وہ مکّی یا چاول یا انجیر یا از قسمِ اناج کوئی اور چیز کھاتے ہوں، تو وہ اُسی میں سے ایک صاع ادا کریں گے۔ بلکہ اگر کسی آبادی کی عام غذا اناج نہ ہو بلکہ دودھ، گوشت، مچھلی وغیرہ ہو تو بہرحال جو غذا بھی ہو گی اُسی میں سے وہ صدقۂ فطر ادا کرنے کے مکلّف ہوں گے۔

Marfat.com

جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ شارع علیہ السلام کا اصل منشاء یہ ہے کہ عید کے روز غرباء اور مساکین بھوکے نہ رہ جائیں اور لوگ جو کچھ خود کھاتے ہوں اُسی سے غریب بھائیوں کی بھی خبر گیری کریں۔ اس لحاظ سے غلّہ کے بجائے آٹا بھی صدقۂ فطر میں دے دینا کافی ہوگا، اگرچہ حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ رہا پکے ہوئے طعام کو صدقہ میں دینا تو اگرچہ ایک لحاظ سے یہ غرباء و مساکین کے لیے زیادہ مفید ہے کیونکہ انہیں پکانے کی زحمت و مشقّت نہیں اٹھانا پڑے گی لیکن دوسرے لحاظ سے خشک اناج اُن کے لیے زیادہ کارآمد ہے، کیونکہ ایک تو وہ دیر تک باقی رہ سکتا ہے اور دوسرے اناج سے جو ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں وہ پکے ہوئے طعام سے نہیں کی جا سکتیں۔ بالخصوص جب غرباء کے گھر میں پکا ہوا طعام کثیر مقدار میں جمع ہو جائے گا۔ تو ان کے لیے اسے محفوظ کرنا ناممکن ہوگا اور بیشتر ضائع ہو جائے گا۔ بعض علماء کے نزدیک یہ توجیہ درست نہیں ہے۔ ان کے خیال میں اصل منشاء عید کے دن غرباء کو اس حد تک بے نیاز کر دینا ہے کہ وہ اس پُرعظمت تہوار میں لوگوں کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

اغنوھم فی ھٰذا الیوم عن المسائلۃ (آج کے دن ان کو سوال سے بے نیاز کر دو)۔ آپ نے غلّہ کو صدقۂ فطر میں دینے کا جو حکم فرمایا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں لوگ عید کے روز خاص طور پر کچھ پکانے کے عادی نہ تھے۔ بلکہ عید کے روز بھی اُن کی وہی غذا ہوتی تھی جو سال کے

Marfat.com

دوسرے ایام کی ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عید الاضحیٰ کو چونکہ ان کی غذا معمول کے برعکس گوشت ہوتی تھی۔ اس لیے انہیں حکم دیا گیا کہ "اطعموا منا القانع والمعتر" (قربانی کے گوشت میں سے کھلاؤ صابر مستحق کو بھی، اور بے قرار مستحق کو بھی)۔ چنانچہ اگر کسی شہر یا بستی کے لوگ عید الفطر کے دن خاص طور پر کچھ کھانے پکانے کے خوگر ہوں تو ان کے لیے جائز ہی نہیں، لازم ہے کہ وہ انہی کھانوں سے غریبوں اور مسکینوں کی مواسات کریں۔"

(ترجمان القرآن: مئی ۱۹۵۹ء)

Marfat.com

شیخ محمد ابوزہرہ :

پاکستان کا پڑھا لکھا طبقہ اس جلیل القدر شخصیت سے ناواقف نہیں ہے۔ موصوف دنیائے اسلام کے چند اکابر اہلِ علم و فضل میں سے ہیں۔ ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ عربی ادبیات کی اعلیٰ سند رکھتے ہیں۔ اسلامی قانون میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ قاہرہ یونیورسٹی (مصر) کے لا کالج کے وائس پرنسپل اور اسلامی قانون کے استاذ ہیں۔ لاہور کے بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ (۵۸-۱۹۵۷ء) میں شریک ہو چکے ہیں۔ وزارت اوقافِ مصر کے "تدوین حدیث" بورڈ کے رکن بھی ہیں۔

شیخ محترم اسلامی قانون و فقہ پر نہایت ٹھوس تحقیقی مواد پیش کر چکے ہیں۔ ان کا یہ کام عہد حاضر کا شاہکار مرقع ہے۔ چند سال پیشتر شیخ موصوف نے لا کالج کے درجۂ تخصص کے طلباء کے سامنے اسلامی فقہ اور فقہاء و مجتہدین کے موضوع پر لیکچر دینے شروع کیے تھے۔ یہ سلسلہ امام شافعی رحمہ اللہ سے شروع ہو کر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام

Marfat.com

ابن حزمؒ تک پہنچا۔ اور بعد میں امام زید، امام جعفر صادق بھی اس میں شامل کیے گئے۔ بعد میں یہی سلسلۂ خطبات ہزاروں صفحات پر مشتمل کتابی صورت میں شائع ہو گیا۔ موصوف نے ان خطبات میں اسلامی قانون کی پوری ارتقائی تاریخ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی قانون ایک متحرک اور مربوط قانون ہے۔ ہر دور کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام کے اصولی اور نظریاتی مذاہب پر بھی تحقیق کا آغاز کر چکے ہیں۔ "المذاہب الاسلامیہ" کے نام سے اس سلسلے کا ایک حصہ شائع کر چکے ہیں۔ قاہرہ کے اسلامی مجلّہ "لواء الاسلام" میں ان کی تفسیر قرآن بالاقساط چھپ رہی ہے۔ حضارۃ الاسلام (دمشق)، المسلمون (جینوا) میں وقتاً فوقتاً موصوف کے نہایت عمدہ مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔

شیخ موصوف نہ صرف علمی شخصیت ہیں، بلکہ عمل و کردار کے میدان کے بھی شہسوار ہیں۔ مصر کی وحشت ناک آمریت کے سامنے جہاں بڑے بڑے دم بخود ہو گئے، وہاں موصوف نے قابلِ رشک جرأت کی مثالیں قائم کی ہیں۔ مصر کے ملحدین نے اسلام کی تذلیل اور اسلامی روایات و اقدار کی تحریف کا جو مذموم سلسلہ شروع کر رکھا ہے

Marfat.com

ابوزھرہ مومنانہ عزم کے ساتھ اس کے آگے سینہ سپر ہیں۔

کثرالله من امثالهم

Marfat.com

Marfat.com

مصلحت کے پردے میں الحاد

محترم مقالہ نگار شیخ ابوزہرہ کا خطاب مصر کے متجدّدین کی طرف ہے۔ مصر کے متجدّدین بعض دوسرے اسلامی ممالک کے متجدّدین سے مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ دو چار قدم آگے ہیں۔ وہاں اس گروہ کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن حکّام کی سرپرستی ہونے کی وجہ سے ان کو اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے ہر طرح کے وسائل و ذرائع مہیّا ہیں۔ مترفین کا طبقہ اور وہاں کا فحش نگار اور فسق پرور پریس ان کی خوب پیٹھ ٹھونک رہا ہے۔ ان حضرات کا فتویٰ ہے کہ سود حلال ہے۔ ملکی معیشت اس کے بغیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ تنظیم النسل مُباح ہے۔ رقص جائز ہے۔ رقّاصہ عورتوں کا عُریاں لباس قابلِ اعتراض نہیں ہے، کیونکہ لباس نے زمانہ کے ساتھ ترقی کی ہے اور دین بھی ترقی پذیر ہے۔ اس لیے ایسی عورتوں کے لباس کو اگر "لباسِ شرعی" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مرد و زن کے عام اختلاط میں کوئی حرج نہیں ہے۔

Marfat.com

کیونکہ "وَقَرْنَ" (اور تم عورتیں اپنے گھروں میں قرار سے رہو) میں "بیوت" سے مراد گھر نہیں ہے بلکہ سوسائٹی ہے۔ مرد کو عورت کا قوام بنانا استعمار پرستانہ نظریہ ہے۔ قومی ضرورت کے پیشِ نظر روزہ ترک کیا جا سکتا ہے۔ شراب نوشی جائز بلکہ "کارِ ثواب" ہے۔ الغرض شریعت کا کوئی شعبہ خواہ وہ شخصی قوانین سے تعلق رکھتا ہو یا عبادات و معاملات سے، اس گروہ کا نشانۂ تحریف و تنسیخ بننے سے محفوظ نہیں رہا۔

یہ مسندِ افتاء پر متمکن ہونے والے حضرات صرف مرد ہی نہیں ہیں، بلکہ ان میں بیگمات کی ایک جماعت بھی شامل ہے جو مصلحت اور تقاضائے حالات کی اوٹ میں دین کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہے۔ دین سے ان کو جو کچھ دلچسپی ہے اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے فراعنہ کے اسٹیچو نصب کیے جاتے ہیں اور ملحد شاعروں کی برسیاں منائی جاتی ہیں جن میں یہ ذوق و شوق سے حصہ لیتے ہیں لیکن ابن تیمیہؒ کی برسی منانے کی تجویز جب سامنے آتی ہے تو طرح طرح کے اعتراض وارد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

مصر کے جدید نظام میں شہری اور دیہاتی علاقوں کی یونین کونسلیں بن چکی ہیں جن کے ہاتھ میں نہ صرف لوگوں کے نکاح و طلاق کے اختیارات ہیں بلکہ سماجی اصلاح کے فرائض بھی انہی

Marfat.com

کے کندھوں پر ہیں - ان نئے چودھریوں نے سماجی اصلاح کا جو راستہ اختیار کر رکھا ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے . علاقہ سوہاج کے محافظ (ڈویژنل آفیسر) نے سوہاج کی "نیشنل یونین کونسل" کی انتظامیہ کی میٹنگ میں شرکت کی اور انتظامیہ کے ارکان کو توجہ دلائی کہ "سوہاج میں ابھی تک بعض خواتین پردے پر کاربند ہیں، ان عورتوں کو ترکِ پردہ کی دعوت دی جائے تاکہ یہ بھی قافلۂ ترقی کا ساتھ دے سکیں۔" (روزنامہ الجمہوریہ)

اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ الحمدللہ مصر کے مسلمان عوام اور علماء کی کثیر جماعت متجدّدین اور "مُصلحین" کی ان حرکات سے نہ صرف بیزار ہے، بلکہ سختی کے ساتھ اُن کا نوٹس لے رہی ہے۔ اور ان کی خرافات کو اُٹھا کر ان کے منہ پر مار رہی ہے۔ چنانچہ جب کبھی وہاں کے "روشن خیال مفکرین" نے سُود، عائلی معاملات، اجتہاد و قانون سازی کے اختیارات اور اسی قبیل کے دیگر مسائل کے متعلق احکامِ شریعت کو مسخ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، اُسی وقت علمائے حق کی کثیر تعداد نے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی صورت میں بھی اسلام کے صحیح احکام کو پیش کر کے حق اور باطل کے درمیان امتیاز قائم کر دیا ہے۔ شیخ ابوزہرہ کا مندرجۂ ذیل مضمون جسے ہم نے قاہرہ

Marfat.com

کے مشہور ماہنامہ "لواء الاسلام" سے لیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ـــ خ ح)

شریعت کی بنیادیں | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

ترکت فیکم ما ان اخذتم بہ لن تضلّوا بعدی ابداً ؛ کتاب اللّٰہ و سنّتی۔

میں تمہارے اندر دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے ان کو پکڑ لیا تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری سنّت۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ، ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔

(نساء : ۵۹)

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا۔

(نساء : ۶۰)

اے نبی! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے، اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔ مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا، شیطان انھیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دُور لے جانا چاہتا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

(نساء : ۶۵)

پس نہیں (اے محمدؐ!) تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو اپنا حَکَم نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

قرآن اور سنّت کے یہ صریح احکام بتا رہے ہیں کہ ایمان اور

Marfat.com

کفر کے درمیان جو چیز امتیاز قائم کرتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول جو ہدایت لے کر آیا ہے اُس کو سچّا تسلیم کیا جائے، اُس کے آگے جُھکا جائے، اور یہ یقین کر لیا جائے کہ اتباعِ رسول میں ہی انسان کی مصلحت ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ صراحت کر دی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان پر بلا جھجک کاربند ہو جانا چاہیے اور جن کاموں سے منع کیا ہے اُن سے بلا تامّل دستبردار ہو جانا چاہیے۔ کسی مومن کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اُس کے لیے جو راستہ تجویز کیا ہو اُس سے رُوگردانی کر کے اپنی مرضی سے کوئی دوسرا راستہ منتخب کر لے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِيْنًا۔

(احزاب: ۳۶)

اور کسی ایمان دار مرد اور ایمان دار عورت کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ان کے لیے کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو وہ اپنے معاملے میں اپنا اختیار چلائیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔

بکثرت صحیح احادیث میں یہ حکم وارد ہے کہ خدا اور رسول کے احکام سے ہٹ کر جو چیز لائی جائے اُسے فوراً لانے والے کے مُنہ پر مار

Marfat.com

دینا چاہیے۔

تجدّد اور متجدّدین خدا اور رسول کے قطعی احکام اور شریعت کی دائمی حدود سے جو شخص تجاوز کرتا ہے وہ گمراہ اور بھٹکا ہوا ہے۔ اور جو ان پر قائم رہتا ہے وہ ایسی شاہراہ پر گامزن ہے جس میں کوئی خم و پیچ نہیں ہے۔ نہ بہکنے اور بھٹکنے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ فساد فی الارض کا احتمال ہے۔ لیکن قرآن و سنّت کی اس حکیمانہ تعلیم اور محکم نظام کے باوجود مسلمان قوم کے اندر ایک ایسا گروہ نمودار ہو گیا ہے جو اسلام سے ناک بھوں چڑھا رہا ہے۔ اللہ کے کلام کو فضول سمجھتا ہے اور شریعت کے احکام کو متروک ٹھہراتا ہے۔ بلکہ اس گروہ کے بعض افراد تو بڑی بے شرمی کے ساتھ احکامِ شریعت کو تمسخر اور استہزا کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک قانون دان سے وراثت کے ایک مقدمہ میں جب یہ دریافت کیا گیا کہ کیا اس میں شرعی احکام کے مطابق فیصلہ کیا جائے، تو وہ صاحب اس رائے کا مذاق اڑاتے ہوئے کہنے لگے: کیا آپ نہیں جانتے کہ مُلّا کہتا ہے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (مرد کا حصّہ دو عورتوں کے برابر ہوتا ہے) ــــ گویا ان کے نزدیک نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ بھی مُلّا ہے، کیونکہ یہ حکم اُسی نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے۔

اس گروہ کے کچھ افراد وہ ہیں جو اسلام کی مضبوط اور مستحکم رسّی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے خاص منصوبہ اور تدریج کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

Marfat.com

ان لوگوں کی زبانیں بکثرت "زمانہ کے حالات" اور "مصلحت کے تقاضوں" کے الفاظ دُہراتی رہتی ہیں۔ یہ بار بار کہتے ہیں کہ اسلام کی خیر اسی میں ہے کہ وہ ترقی کے راستے کا پتھر بننے کے بجائے زمانہ کے ساتھ چلے۔ ان کا ارشاد ہے کہ اسلام کا اس وقت تک بول بالا نہیں ہوگا جب تک وہ زمان و مکان کے مطالبات کے سامنے نہیں جھکے گا۔ گویا ان لوگوں کی قاموس میں اسلام کی بالاتری کے معنی یہ ہیں کہ اہلِ زمانہ ـــــ نہ کہ اصحابِ علم و بصیرت ـــــ جس چیز کو اختیار کریں اسلام اُن کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ بعض اوقات یہ لوگ بڑی پوچ باتیں کرتے ہیں۔ اور اپنے ادعائے دانشمندی کے باوجود ایسے بھونڈے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ایک ذی عقل انسان سُن کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ ہنسی کیا ہے ماتم ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ پہلے مُنکرات اور افعالِ قبیحہ کو رواج دیتے ہیں اور پھر احکامِ الٰہی کو انہی کے تابع کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ اسلام غسل کے وقت سر کے بالوں کو دھونے کی شرط کیوں عائد کرتا ہے۔ یہ شرط ان عورتوں کے لیے موجبِ حرج و تنگی ہے جو ہیر ڈریسر سے بال بنواتی ہیں۔ پھر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ چونکہ یہ شرط ایسی عورتوں کو غسل کے تمام احکام سے بیزار کر دے گی، اس لیے اولیٰ یہ ہے کہ غسل میں سر پر صرف مسح کو کافی سمجھا جائے۔ اور جب ہم اُن سے گزارش کرتے ہیں کہ غسل میں سر کا دھونا واجب ہے تو ارشاد ہوتا

Marfat.com

ہے کہ یہ بیگمات بالوں کی تراش خراش پر جو رقم خرچ کرتی ہیں کیا اس پر پانی پھیرنا چاہتے ہو؟ اس طرح تو دین میں تنگی پیدا ہوگی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اس نے تم پر دین کے معاملے میں تنگی روا نہیں رکھی)۔ لیکن ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ آخر عورت کو سر دھونے کے لیے کتنے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے؟ کیا وہ مہینوں اسے بلا دھوئے رکھے گی؟ اور پھر مسلمانوں کے شہروں اور بستیوں میں اس نوعیت کی عورتوں کی کتنی تعداد ہے؟ کیا مسلمان قوم کے اندر ایسی عورتوں کا تناسب شاذ و نادر کے حکم میں نہیں ہے؟ محلات کو چھوڑ کر عام شہری آبادی کے اندر ان کی تعداد ایک فی ہزار سے متجاوز نہیں ہے۔ دیہاتی آبادی میں تو یہ تناسب اور بھی گھٹ جاتا ہے۔ کیا ان گنتی کی چند بیگمات کی خاطر ہم اپنے پروردگار کی شریعت کو تبدیل کر دیں، اور اپنے نبیؐ کی سنّت کو ساقط کر دیں، اور ثابت شدہ حقائق کا چہرہ مسخ کر کے رکھ دیں؟ چند افراد کے انحراف سے شریعت کی تبدیلی تو کجا خود ان منحرفین کی سرکوبی لازم آتی ہے۔ کیونکہ یہ فطرتِ انسانی سے بغاوت کر رہے ہیں اور اس کے حسین چہرے پر سیاہی لیپ رہے ہیں۔ اس ایک چھوٹی سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ احکامِ دین کا قلادہ گلے سے اتارنے کے لیے کیا کیا حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں، اور کس طرح دین کو اپنی خواہشات کا غلام بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

Marfat.com

لایومن احدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ (تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اُس کی خواہش میری لائی ہوئی ہدایت کے تابع نہ ہو جائے)۔

علیٰ ہذا القیاس اس گروہ کے لوگ نفس کی آگ بجھانے کے لیے اہلِ یورپ کی نقالی میں پہلے تو خود ہی ایک بدعت قائم کرتے ہیں، پھر اُسے واجب الاتباع شریعت کا رنگ دینے کے لیے کتاب و سنّت کے ثابت شدہ احکام میں تحریف کے درپے ہو جاتے ہیں اور مصلحتِ وقت کی آڑ لے کر ناقابلِ تردید حق کو اپنے نفس کے احکام کے آگے جھکا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَھْوَاءَھُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْھِنَّ (اگر حق ان کی خواہشوں کے تابع ہو جاتا تو آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان کے اندر ہے ان میں فساد رونما ہو چکا ہوتا۔ مومنون : ۷۱)۔

تجدّد اور جاہلیّتِ قدیمہ میں مماثلت | شریعت انسانوں پر حاکم بن کر آئی ہے اور یہ اُس نظام کی دعوت دیتی ہے جو اپنی فطرت میں افضل و اولیٰ نظام ہے اور قانونِ اخلاق کی طرح حکم عام رکھتا ہے۔ جسے خاص اور محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ انسانی اخلاقِ فاضلہ کے کسی قانون کو کسی ایک شخص کی خواہش کی بنا پر یا کسی نئے فعل یا نئے رواج کی پیروی کے لیے تغیّر کا نشانہ بنایا گیا ہو

Marfat.com

اگرچہ وہ فعل یا رواج تقلید پر مبنی نہ ہو بلکہ خود ساختہ ہو؟ لیکن مغرب کی یہ کورانہ تقلید جس میں ہم غرق ہو رہے ہیں اور جس کی پشت پر تفکّر و تدبّر کا کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک قومی اور اجتماعی آفت ہے اور اس کا ازالہ ناگزیر ہے۔ کسی چیز کے ترک و قبول میں اُس کے اچھے یا بُرے پہلو کا جائزہ لیے بغیر اندھا دھند کسی قوم کی تقلید کرنا عقلی تعطّل کا باعث ہوتا ہے اور عملی زندگی میں جب عقلی تعطّل اور فکری اضمحلال رونما ہو جاتا ہے تو لازماً نفسِ انسانی میں فساد اور بغاوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے قوم کا اجتماعی توازن بگڑ جاتا ہے اور معاشرتی بیماریوں کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ اگر اسلام ہر تقلید کے آگے سپر انداز ہو جاتا تو اُس کی دعوت کو کبھی ثبات حاصل نہ ہوتا، اور اُس کے کلمے کو وہ سربلندی اور وسعت نصیب نہ ہوتی جو اسے حاصل ہوئی ہے۔ قرآن کی زبان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی کے مقابلے میں مشرکین جو حجّت پیش کرتے تھے وہ اُسی طرز کی حجت تھی جو عصرِ حاضر کے "عقلاء" پیش کرتے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا	ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے
مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ	جو کچھ نازل کیا ہے اُس کی پیروی کرو
مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ	تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اُسی طریقے
كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ	کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے
شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۔ وَ	باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان

Marfat.com

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً، صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

(البقرۃ : ۱۷۰-۱۷۱)

کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو (تو کیا پھر بھی انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے)۔ یہ لوگ جنہوں نے (خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے) انکار کر دیا ہے، ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا چانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

بعینہٖ یہی روش ان لوگوں کی ہے جو اہلِ مغرب کی نقالی پر اُترے ہوئے ہیں۔ یہ کسی چیز کو اختیار کرتے وقت اُس کے حُسن و قبح کو پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، بلکہ تقلید کی رَو میں بالکل بے دست و پا ہو کر بہے جا رہے ہیں۔ اِن میں اور اہلِ جاہلیّت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا ہے کہ اہلِ جاہلیّت کی تقلیدِ آباء کی منطق یہ تھی کہ بیٹے بزرگوں کے وارث ہوتے ہیں، بزرگوں کے افکار و عادات ان میں سرایت کر چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جن خیالات پر ان کی تربیت اور نشوونما ہوئی ہے، اس میں تغیّر و تبدّل کے بارے میں سوچنا مناسب نہیں ہوتا۔ لیکن عہدِ حاضر کے مقلّدین کا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ ان کی نشوونما کسی قدر اسلام کے ماحول میں ہوئی ہے، لیکن

Marfat.com

یہ اسلام سے خروج کر چکے ہیں۔ مغرب کی پُر فریب تہذیب کی لذتوں نے ان کو رام کر لیا ہے اور یہ بلا دلیل و حجت اور بلا تشخیص و تمیز اُس کی پیروی کر رہے ہیں۔ اب ان کی کوشش یہ ہے کہ جن فاسد نظریات کو انہوں نے اپنے لیے منتخب کر لیا ہے انہیں اسلام کی پشت پر لاد دیں۔ یہ دراصل وہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد بالکل صحیح صادق آتا ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَا اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۔ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ، اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ جاتا ہے ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ جب ان کو بُلایا جاتا ہے اللہ اور رسولؐ کی طرف تاکہ رسول ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے۔ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسول کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں

Marfat.com

پڑے ہوئے ہیں یا ان کو خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

(نور : ۴۷-۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسولؐ ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور کامیاب بھی وہی ہیں۔

مصلحت یا خواہشِ نفس

گنتی کے چند لوگوں کی خواہشوں پر احکامِ الٰہی کو ترک کر دینے والے حضرات ہمیشہ مصلحت کے نام پر گفتگو کرتے ہیں۔ اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ "حقیقی مصلحت" وہی ہے جس کا وہ دعویٰ کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ نفس کی خواہشوں کو مصلحت کا لباس پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ حضرات حقائق پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر مصلحتِ انسانی پر کیا ستم ہو گا کہ خواہشاتِ نفس کو حقیقی مصالح کا نام دے دیا جائے۔ اور اصل مصلحت کو گمنامی کی نذر کر دیا جائے۔ یہ لوگ شتر بے مہار ہیں جن کو کوئی اخلاقی بندھن، کوئی دینی ضابطہ، کوئی شریفانہ رواج اور کوئی بھلی روایت دائرہ انضباط میں نہیں لا سکتی۔ ان کی آرزو یہ ہے کہ اللہ کی شریعت

Marfat.com

کے ساتھ کھیلیں اور اُسے اپنے محبوب اور مرغوب سانچوں میں ڈھالتے رہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی ایسے لوگ تھے۔ ایک مرتبہ ان کی ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا ہم ایسے علاقہ میں رہتے ہیں جہاں سردی سخت پڑتی ہے۔ اور لوگ شراب پی کر جسمانی حرارت حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے ہم شراب نہیں چھوڑ سکتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ بات سُن کر فرمایا: اُقْتُلُوْهُمْ (ایسے لوگوں کی گردن مار دو)۔ پس جو لوگ اپنی خواہشات کے ہاتھ میں گرفتار ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی خواہشات حاکم اور شریعتِ الٰہی محکوم ہو، وہ اُن کج فطرت اور فتنہ جو لوگوں کی صف میں شامل ہیں جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کا فرمان صادر فرمایا تھا۔ کیونکہ ان کی قانون شکنی سے دوسرے لوگ بھی ضعفِ ایمانی کا شکار ہوں گے اور نتیجۃً فسق و فجور علانیہ ہونے لگے گا اور اتباعِ ہوا کے دروازے چوپٹ کھُل جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ذیل کی نصیحت فرمائی ہے۔ مگر اس کا رُخ ہر صادق الایمان مومن کی طرف ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ	پھر ہم نے تم کو دین کے راستہ پر چلایا
مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ	ہے، پس تم اُسی کی پیروی کرو اور
اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ	نادانوں کی خواہشوں پہ نہ چلو، وہ
اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ	اللہ کے سامنے ہرگز تمہارے کام

Marfat.com

اللّٰہِ شَیْئًا وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ ، وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ۔

(جاثیہ : ۱۸-۱۹)

نہ آئیں گے۔ بے شک ظالم لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اللہ تعالےٰ پرہیزگاروں کا رفیق ہے۔

شرعی مصالح کی حقیقت

یہ حضرات دعوت تو دیتے ہیں ہوا پرستی اور بندگیٔ نفس کی، مگر سمجھتے یہ ہیں کہ وہ "مصلحتِ قومی" کے علمبردار ہیں۔ حالانکہ حقیقی مصلحت ان کی رائے کے یکسر خلاف ہے اور عقلِ سلیم بھی ان کی دعوت سے ابا کرتی ہے۔ ہوا پرستی کے ہاتھ میں جب فیصلوں کی زمام کار آجاتی ہے تو وہ عقل پر غالب آجاتی ہے اور عقل اس کی بندۂ بے دام بن کر رہ جاتی ہے۔ اسلام جن مصالح کو قابلِ اعتبار سمجھتا ہے وہ بالکل واضح ہیں۔ فقہائے اسلام نے ـــــ جن کا نام سنتے ہی یہ حضرات اپنا سر مٹکانے لگتے ہیں ـــــ ان مصالح کو جامعیت کے ساتھ منضبط کر دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء کہتے ہیں کہ شرعی مصلحت انسان کی جان، مال، نسل، عقل اور دین کی حفاظت کا نام ہے۔ لیکن گروہِ منحرفین انہی تمام شرعی مصلحتوں پر خود "مصلحت" کے نام سے حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ لوگ شراب نوشی اور فسق و فجور کو مصلحتوں کے نام لے لے کر ہی رواج دے رہے ہیں۔ کیا یہ عقلِ انسانی اور نسلِ بشری پر غارتگری نہیں ہے؟ اسی طرح سے یہ ربا کی ہر مقدار کو خواہ کم ہو یا زیادہ حلال و طیب قرار دے رہے ہیں اور اکل الاموال بالباطل کا کوئی ایسا دروازہ نہیں ہے جس میں یہ داخل نہ ہو رہے ہوں۔ کیا یہ انسانی مال

Marfat.com

کی ظالمانہ لوٹ کھسوٹ نہیں ہے ؟ پھر یہ لوگ الحاد و زندقہ اور دین سے بغاوت کی کھلّم کھلاّ تشہیر کر رہے ہیں۔ اسلام کی بنیادی حقیقتوں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں۔ اسلام کے کسی ایک شعار کو بھی یہ باوقار نہیں دیکھنا چاہتے۔ دین کی علانیہ بے حرمتی کرتے ہیں۔ محرمات کا آشکارا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک شخص بھری مجلس میں اٹھتا ہے اور منہ پھٹ ہو کر اسلامی حقائق و اقدار کو کھوکھلا اور بے بنیاد ثابت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح کے "ہر مفکر" کے لیے اسلام ایک خوانِ یغما بنا ہوا ہے۔ ان منحرفین کی سوسائٹی میں یہ عام مشہور ہے کہ جو شخص بھی ناموری حاصل کرنا چاہتا ہو وہ ادیانِ سماوی اور بالخصوص اسلام پر نکتہ چینی اور طعن و تشنیع شروع کر دے۔ کیا یہ ملتِ مسلمہ کی بیخ کنی نہیں ہے ؟ دین و ایمان کی چولیں ڈھیلی ہو جانے کے بعد مسلمانوں کا ٹھکانا کہاں ہے ! کیا واقعی "مصلحت" یہی ہے کہ مسلمانوں کو ایک بے یقین، بے سیرت اور بد اخلاق قوم بنا ڈالا جائے ؟

اسلام کا ہر حکم بذاتِ خود ایک مصلحت ہے اور اس کی ممانعت بذاتِ خود ایک مضرّت۔ جو شخص اسلام کے حکم قطعی سے ہٹ کر مصلحت تلاش کرتا ہے، وہ ضلالِ بعید میں مبتلا ہے۔ عرب عصرِ حاضر کے منحرفین سے زیادہ مصلحت شناس تھے۔ ایک بدوی سے پوچھا گیا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کیوں ایمان لائے ہو ؟ اس نے جواب دیا: "ما رأیت محمدا یقول فی امر: "افعل" والعقل یقول "لا

Marfat.com

تفعل" وما رأیت محمداً یقول فی امر : لا تفعل والعقل یقول: "افعل" (میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ محمدؐ نے کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہو اور عقل نے کہا ہو: "نہ کر"۔ یا محمدؐ نے کسی کام سے روکا ہو اور عقل نے کہا ہو: "کر")۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے انسان کو مہمل نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اُسے صراحت سے بتا دیا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور گمراہی کیا ہے، مصلحت کیا ہے اور مضرت کیا ہے، حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ ارشاد باری ہے: اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اُس کو یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ (قیامہ : ۳۶)۔

ترقی کے نام پر شریعت پر حملے شریعتِ الٰہی ہی تمام انسانی امراض کی شفاء ہے اور معاشرے کی تمام خرابیوں کا علاج ہے۔ یہ انحراف جو نوجوانوں کو لپیٹ میں لے رہا ہے، یہ فحاشی جو محفلوں پر چھائی جا رہی ہے، اور یہ بدحالت جن کے پیچھے عورت روز بروز دوڑی جا رہی ہے، ان سب کی دوا شریعت کے سوا کہیں نہیں ملے گی اور ان سے نجات کی جگہ دین کی شہر پناہ کے سوا کہیں حاصل نہ ہوگی۔ اس وقت بگاڑ معاشرے کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ٹیلیویژن پر عالمی پروگرام پیش کیا جاتا ہے تو اس میں مناظرِ فطرت اور صنعتی ترقی اور تہذیبی مظاہر دکھانے کے بجائے عورتوں کی چوٹیوں کے مختلف مناظر، زنانہ پوشاکوں اور پازیبوں کے رنگا رنگ نمونے دکھائے جاتے ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ کل کی نسبت آج ان میں کیا تبدیلی آگئی

Marfat.com

ہے۔ کیا یہ بات حیران کُن نہیں ہے کہ یہی ثقافت گزیدہ لوگ ہمارے پاس آکر کہتے ہیں کہ اسلام کو برتر مقام سے نیچے اتارو تاکہ وہ موجودہ حالات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس انحراف کو بیماری کی علامت سمجھ کر اسلام کو ذریعۂ نجات بناتے اور حکومت سے اس کے انسداد کی مدد حاصل کرتے، یہ اس کی مزید حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور الٹا اسلام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے احکام تبدیل کر لے کیونکہ اسی میں مصلحت ہے۔

ایک شخص جس کی عملی زندگی فسق و فجور سے ملوّث ہوتی ہے، اٹھ کر اسلام پر اظہارِ خیال کرنا شروع کر دیتا ہے اور جب اُسے ٹوکا جاتا ہے تو "مفکرین" کی ایک فوج جو اس کی ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتی ہے یہ فتویٰ دینا شروع کر دیتی ہے کہ "وسیع چیز کو لوگوں پر محدود اور تنگ نہ کرو۔ دین میں آسانی ہے دشواری نہیں ہے۔" یہ الفاظ ان "مفکرین" کو خوب ازبر ہوتے ہیں۔ تاکہ اسلام ہی کی چیزوں کو اسلام کے خلاف استعمال کر کے فساق و مُترفین کو خوش کر سکیں، اور ان کا تقرب حاصل کر سکیں۔ مگر درحقیقت یہ اسلام پر بدبختی مسلّط کرتے ہیں۔ اسلام کے چہرے کو سیاہ کرتے ہیں اور اسلام کی ہیبت و شوکت کو لوگوں کے دلوں سے مٹاتے ہیں۔

آپ حضرات تک یقیناً یہ خبر پہنچی ہوگی کہ ایک رقاصہ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلام رقص و سرود کو مباح قرار دیتا ہے اور اس کے

Marfat.com

حلقہ تقرب میں شامل "ماہرین اسلام" نے اس رائے کی تائید کی ہے۔ کاش یہ "ماہرین اسلام" اس منکر پر کم از کم خاموش ہی رہتے اور اس کی ہمت افزائی نہ کرتے۔ مگر چونکہ ان کے نزدیک ایسے موقع پر خاموشی "کتمانِ علم" ہے جو "سخت گناہ" ہے، اس لیے وہ سخن طراز ہوئے۔ اور رقص کو مباح ثابت کر دیا۔ اگرچہ انہوں نے باقاعدہ اس کا اعلان نہیں کیا لیکن اگر وہ یہ بھی کر دیتے، تو "مجددِ اسلام" اور "روشن خیال عالم" کے خطابات اور درجہ اوّل کے تمغے ان کے لیے حاضر تھے۔

عہدِ حاضر میں آزمائش اسلام کی نوعیت

اس وقت اسلام جس آزمائش میں مبتلا ہے، ماضی میں اس نے یہ آزمائش کبھی نہیں دیکھی، حتیٰ کہ تاریک ترین ادوار میں بھی وہ ایسے حالات سے نہیں گزرا۔ عباسی عہد میں زنادقہ کے ہاتھوں اسلام پر آزمائش نازل ہوئی، صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مسلمان اپنی ہی سرزمین میں مبتلائے فتنہ ہوئے، تاتاریوں کی یورش اسلام نے سہی، اور آخر میں استعماری دور، جو صلیبی جنگوں کے سلسلہ کی ایک کڑی تھی، اسلام کے لیے آزمائش کا پیغام لے کر آیا۔ لیکن اسلام صحیح و سلامت باقی رہا۔ اللہ کی کتاب حفظ و تواتر کی بدولت باقی رہی، بلکہ حفظ و تواتر میں اضافہ ہوا، سنت زندہ رہی، علماء کے حلقہ ہائے درس اس کی روایت و درایت میں مشغول رہے، اور فسادِ امت کی یاس انگیز فضا میں کتاب و سنت سے سامانِ تسلی حاصل کرتے رہے۔ اجتہادی ادوار کا فقہی سرمایہ جو سلف سے منقول چلا آ رہا تھا مقلدین کی بدولت محفوظ رہا۔

Marfat.com

بے شک اس دور کے علماء منقولات پر جامد رہے، کوئی تجدید و اضافہ انہوں نے نہیں کیا۔ لیکن اس جمود کا یہ فائدہ تو ہوا کہ انہوں نے ورثۂ اسلام کی نگرانی کی، قرآن پر پہرہ دیا، تحریف سے اُسے بچایا اور اس کی خانہ ساز تاویل کرنے والے کے ہاتھ پکڑ لیے، ان محافظین اور جامدین کو آپ جو کچھ چاہیں کہہ لیں مگر یہ تو مسلّم ہے کہ انہوں نے امانتِ اسلام کی نگرانی کا حق ادا کر دیا اور آنے والی نسلوں تک زیغ و انحراف سے پاک و محفوظ پہنچا دیا۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہم میں سے ایک گروہ تو اپنے سابق بزرگوں کی طرح محض جمود پر قائم ہے، اور دوسرے گروہ نے "مجدّد" بننے کی ٹھان لی ہے۔ تجدید کے ان مدعیوں میں سے کوئی قرآن پر ہاتھ صاف کر رہا ہے، اس کی من مانی تفسیریں کر رہا ہے اور اسے مصلحتِ وقت کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر رہا ہے۔ کچھ لوگ سنّت پر حملے کر رہے ہیں، اور اس کے اکثر و بیشتر ذخیرے کو ساقط الاعتبار قرار دے رہے ہیں۔ کچھ حضرات نے اجماعِ امت ہی کو سرے سے ساقط کر دیا ہے۔ اور بعض ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کے نام تو مسلمانوں کے سے ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ ملّتِ اسلامی نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد سے لے کر آج تک نماز اور دوسرے ارکانِ اسلام کا صحیح مطلب ہی نہیں سمجھا۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا۔

ان حضرات سے ہماری درخواست ہے کہ حلال بھی واضح ہے

Marfat.com

اور حرام بھی واضح۔ تم لوگ دین کے خدّ و خال کو مسخ کرنے کا کام سر انجام نہ دو۔ خود فریبی کسی عقلمند کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اگر تم لوگ مسندِ فتویٰ کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو کم از کم اپنے خود ساختہ نظریات کو اللہ اور رسول کے سر نہ تھوپو، دین کو خواہشات کا کھلونا نہ بناؤ۔ کسی دنیا پرست کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی آخرت کو باطل کے عوض نہ بیچو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پیشِ نظر رکھو کہ: ثلاث منجیات وثلاث مهلکات، فاما المنجیات فتقوی الله فی السّر والعلن، وقول الحق فی الرضاء والسخط، والصدق فی الغنی والفقر واما المهلکات فهوی متبع، و شحّ مطاع، واعجاب المرء بنفسه وهی اشدهن۔ (تین خصلتیں انسان کو نجات دینے والی ہیں اور تین ہلاک کرنے والی۔ تین نجات دینے والی یہ ہیں: پوشیدہ و علانیہ اللہ سے ڈرنا، رضامندی و ناراضی دونوں حالتوں میں حق بات کہنا۔ تونگری و ناداری دونوں صورتوں میں سچائی پر کاربند رہنا۔ اور تین ہلاک کرنے والی خصلتیں یہ ہیں: خواہشات کی پیروی کرنا، بخل کا طریقہ اختیار کرنا اور خود پسندی میں مبتلا ہونا اور یہ سب سے مہلک ہے ——

بروایت بیہقی۔ (ترجمان القرآن: مئی ۱۹۶۱ء)

Marfat.com

باب دوم:

ریاست و حکومت

● ــــ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی،

امیر جماعت اسلامی، پاکستان

● ــــ پروفیسر لبیب السعید،

مصر

● ــــ شیخ محمد محمود شلتوت،

ریکٹر ازھر یونیورسٹی قاھرہ، مصر

● ــــ ڈاکٹر عبدالغنی حسن،

رکن ادارہ ماہنامہ المجلۃ، مصر

● ــــ استاذ مصطفیٰ احمد زرقا،

سابق وزیر قانون واوقاف، شام

● ــــ ڈاکٹر محمد ناصر،

صدر ماشومی پارٹی وسابق وزیر اعظم،

انڈونیشیا

Marfat.com

مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مَودُودی

مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی دنیائے اسلام کے ایک عظیم مفکّر، صاحبِ طرز انشاء پرداز، بلند پایہ مصنّف، تحریکِ اسلامی کے داعی اور رہنما ہیں۔

آپ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو بمقام اورنگ آباد (دکن انڈیا) پیدا ہوئے۔ ۱۷ سال کی عمر میں صحافتی زندگی میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۸ء تک مختلف جرائد و رسائل — تاج (جبل پور)۔ مسلم اور الجمیعۃ (دہلی) — میں کام کیا۔ ۱۹۳۲ء میں احیاءِ اسلام کی دعوت کے لیے حیدرآباد (دکن) سے اپنا معروف ماہنامہ "ترجمان القرآن" شائع کرنا شروع کیا اور آج تک اس کی ادارت فرما رہے ہیں۔

۱۹۳۸ء میں حیدرآباد سے پٹھانکوٹ (مشرقی پنجاب) منتقل ہو کر ادارہ دارالاسلام قائم کیا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۱ء تک نو برس مسلسل قلمی جہاد کے بعد اسلامی نظام کے قیام کیلئے عملی جدوجہد کی غرض سے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی اور اس کے امیر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں

Marfat.com

مارشل لا کے نفاذ تک (بہ استثنائے عرصۂ نظر بندی از اکتوبر ۱۹۵۸ء تا مئی ۱۹۵۹ء
و قید از ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۵ء) اس کے ممبر رہے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں "قادیانی مسئلہ" نامی پمفلٹ کی تصنیف کے جرم میں
پھانسی کی سزا پانے کے مستحق سمجھے گئے جو بعد میں عمر قید میں تبدیل ہو
گئی۔ پھر پنجاب ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کی بناء پر ۱۹۵۵ء میں رہا ہوئے۔

۱۹۵۶ء میں آپ موتمر اسلامی کے اجلاس دمشق میں شریک ہوئے اور
اس کی گورننگ باڈی کے مستقل رکن مقرر کیے گئے۔ ۱۹۵۸ء کے اواخر میں
آپ نے قرآنِ کریم اور سیرتِ طیبہ کے تاریخی آثار و مقامات کو دیکھنے کے لیے
جزیرۂ عرب، فلسطین اور مصر کا اہم سفر کیا۔ ۱۹۶۰ء میں شاہِ سعود کی دعوت
پر مدینہ یونیورسٹی کی مفصل اسکیم پیش کی، اور اس کی ایڈوائزری کونسل کے
ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں رابطۂ عالمِ اسلامی (مکہ معظمہ) کی مجلس تاسیسی
FOUNDERS COUNCIL کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ کی ذات
جدید و قدیم علوم کی جامع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو موجودہ دور کے
تقاضوں کے مطابق سائنٹفک، مدلل طریقہ سے اسلام پیش کرنے
کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا ہے۔ آپ کا اندازِ تحریر اور اسلوبِ بیان ہر طبقۂ
خیال کے لوگوں کو متاثر کرنے میں امتیازی خصوصیت رکھتا ہے آپ نے
اب تک ۷۰ سے زیادہ کتب تصنیف فرمائی ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

انسان کے بنیادی حقوق

ذیل میں فاضل مدیر ترجمان القرآن کی وہ بصیرت افروز تحقیقی تقریر ہے جو مرحوم کی زبانِ حق ترجمان سے روٹری کلب لاہور کے ایک اجلاس (بہ تقریب یوم حقوق انسانی) میں صادر ہوئی۔ اب قلمبند ہونے کے بعد یہ ایک بیش قیمت علمی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ امید ہے کہ دستور و قانون، سیاست و عمرانیات اور تاریخ و اسلامیات کے طلبہ کے لیے یہ مبحث نہایت مفید رہے گا۔

جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے، انسان کے بنیادی حقوق کا تصور ہمارے لیے کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی نگاہ میں ان حقوق کی تاریخ یو، این، او کے چارٹر سے شروع ہوتی ہو، یا انگلستان کے میگنا کارٹا (Magna Charta) سے اس کا آغاز ہوا ہو۔ لیکن ہمارے لیے اس تصور کا آغاز بہت پہلے سے ہے۔ اس موقع پر میں انسان کے بنیادی حقوق پر روشنی ڈالنے سے پہلے مختصر طور پر یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انسانی حقوق کے آغاز کا تصور

Marfat.com

کیوں کر ہوا ہے۔

درحقیقت یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ دنیا میں ایک انسان ہی ایسا ہے جس کے بارے میں خود انسانوں ہی کے درمیان بار بار یہ سوال پیدا ہوتا رہا ہے کہ اس کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ انسان کے سوا دوسری مخلوقات جو اس کائنات میں بس رہی ہیں، ان کے حقوق خود فطرت نے دیے ہیں اور آپ سے آپ انہیں مل رہے ہیں۔ بغیر اس کے کہ وہ اس کے لیے سوچ بچار کریں۔ لیکن صرف انسان وہ مخلوق ہے جس کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے حقوق کیا ہیں اور اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اس کے حقوق متعین کیے جائیں۔

اتنی ہی عجیب بات یہ بھی ہے کہ اس کائنات کی کوئی جنس ایسی نہیں ہے جو اپنی جنس کے افراد سے وہ معاملہ کر رہی ہو جو انسان اپنے ہم جنس افراد سے کر رہا ہے۔ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ حیوانات کی کوئی نوع ایسی نہیں جو کسی دوسری نوع کے حیوانات پر بھی محض لطف و لذت کے لیے یا ان پر حکمران بننے کے لیے حملہ آور ہوتی ہو۔

قانونِ فطرت نے ایک حیوان کو دوسرے حیوان کے لیے اگر غذا بنایا ہے تو وہ صرف غذا کی حد تک ہی اس پر دست درازی کرتا ہے۔ کوئی درندہ ایسا نہیں ہے جو غذائی ضرورت کے بغیر یا اس ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد بلا وجہ جانوروں کو مارتا چلا جاتا ہو۔ خود اپنے ہم جنسوں کے ساتھ نوعِ حیوانی کا وہ سلوک نہیں ہے جو انسان

Marfat.com

کا اپنے افراد کے ساتھ ہے۔ یہ غالباً اس فضل و شرف کا نتیجہ ہے جو اللہ تعالےٰ نے انسان کو عطا کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ذہانت اور قوتِ ایجاد کا کرشمہ ہے کہ انسان نے دنیا میں یہ غیر معمولی روش اختیار کر رکھی ہے۔

شیروں نے آج تک کوئی فوج تیار نہیں کی۔ کسی کتے نے آج تک دوسرے کتوں کو غلام نہیں بنایا۔ کسی مینڈک نے دوسرے مینڈکوں کی زبان بندی نہ کی یہ انسان ہی ہے جس نے اللہ تعالےٰ کی ہدایات سے بے نیاز ہو کر جب اس کی دی ہوئی قوتوں سے کام لینا شروع کیا تو اپنی ہی جنس پر ظلم ڈھانے شروع کر دیے۔ جب سے انسان زمین پر موجود ہے اس وقت سے آج تک تمام حیوانات نے اتنے انسانوں کی جان نہیں لی ہے جتنی انسانوں نے صرف دوسری جنگ عظیم میں انسان کی جان لی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو فی الواقع دوسرے انسانوں کے بنیادی حقوق کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ صرف اللہ ہی ہے جس نے انسان کی راہنمائی اس باب میں کی ہے اور اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسانی حقوق کی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ درحقیقت انسانی حقوق متعین کرنے والا انسان کا خالق ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس خالق نے انسان کے حقوق نہایت تفصیل سے بتائے ہیں۔

دورِ حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کا ارتقاء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقوق انسانی کے اسلامی منشور کے نکات پر گفتگو کرنے سے قبل دورِ حاضر کے انسانی حقوق کے شعور کی ارتقائی

Marfat.com

تاریخ پر اجمالی نظر ڈال لی جائے۔

(۱) انگلستان میں کنگ جان نے ۱۲۱۵ء میں جو میگنا کارٹا جاری کیا تھا وہ دراصل اس کے امراء (Barons) کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اس کی حیثیت بادشاہ اور امراء کے درمیان ایک قرارداد کی سی تھی اور زیادہ تر امراء ہی کے مفاد میں وہ مرتب کیا گیا تھا۔ عوام الناس کے حقوق کا اس میں کوئی سوال نہ تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس کے اندر سے وہ معنی اخذ کیے جو اس کے اصل لکھنے والوں کے سامنے بیان ہوتے تو وہ حیران رہ جاتے۔ سترھویں صدی کے قانون بنیغ لوگوں نے اس میں یہ پڑھا کہ تحقیق جرم روبروئے مجلس قضا (Trial by Jury) حبس بے جا کے خلاف دادرسی (Right of Habeas Corpus) اور ٹیکس لگانے کے اختیارات پر کنٹرول کے حقوق انگلینڈ کے باشندوں کو اس میں دیے گئے ہیں

(۲) ٹام پین (Tom Paine) (۱۷۳۷ء تا ۱۸۰۹ء) کے پمفلٹ، "حقوق انسانی" (Rights of Man) نے اہل مغرب کے خیالات پر بہت بڑا انقلابی اثر ڈالا۔ اور اسی کے پمفلٹ، (۱۷۹۱ء) نے مغربی ممالک میں حقوق انسانی کے تصور کی عام اشاعت کی۔ یہ شخص الہامی مذہب کا قائل نہ تھا اور ویسے بھی وہ دور الہامی مذہب سے بغاوت کا دور تھا۔ اس لیے مغربی عوام نے یہ سمجھا کہ الہامی مذہب حقوقِ انسانی کے تصور سے خالی ہے۔

Marfat.com

(۳) انقلاب فرانس کی داستان کا اہم ترین ورق "منشورِ حقوق انسانی (Declaration of the Rights of Man) ہے جو ۱۷۸۹ء میں نمودار ہوا۔ یہ اٹھارویں صدی کے اجتماعی فلسفے اور خصوصاً روسو کے نظریۂ معاہدہ عمرانی (Social Contract Theory) کا ثمرہ تھا۔ اس میں قوم کی حاکمیت، آزادی، مساوات اور ملکیت کے فطری حقوق کا اثبات کیا گیا تھا۔ اس میں ووٹ کے حق، قانون سازی اور ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات پر رائے عام کے کنٹرول، تحقیق جرم روبرو سے مجلسِ قضا (I[illegible]) وغیرہ کا اثبات کیا گیا۔

اس منشورِ حقوقِ انسانی کو فرانس کی دستور ساز اسمبلی نے انقلاب فرانس کے عہد میں اس غرض کے لیے مرتب کیا تھا کہ جب دستور بنایا جائے تو اس وقت اسے اس کے آغاز میں درج کیا جائے اور دستور میں اس کی سپرٹ کو ملحوظ رکھا جائے۔

(۴) امریکہ کی دس ترامیم میں بڑی حد تک وہ تمام حقوق گنوائے گئے ہیں جو برطانوی فلسفۂ جمہوریت پر مبنی ہو سکتے تھے۔

(۵) انسانی حقوق پر فرانس کا وہ منشور بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے جسے بگوٹا کانفرنس میں امریکی ریاستوں نے ۱۹۴۸ء میں منظور کیا۔

(۶) پھر جمہوری فلسفہ کے تحت یو، این، او نے تقریباً بہت

Marfat.com

سے تحفظ حقوق کے متعلق قراردادیں پاس کیں اور بالآخر عالمی "منشور حقوق انسانی" منظر عام پر آیا۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک ریزولیشن پاس کیا جس میں انسانوں کی نسل کشی (Genocide) کو بین الاقوامی قانون کے خلاف ایک جرم قرار دیا گیا۔

پھر دسمبر ۱۹۴۸ء میں نسل کشی کے انسداد اور سزادہی کے لیے ایک قرارداد پاس کی گئی اور ۱۲ر جنوری ۱۹۵۱ء کو اس کا نفاذ ہوا۔ اس میں نسل کشی کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا کہ حسبِ ذیل افعال میں سے کوئی فعل اس غرض سے کرنا کہ کسی قومی، نسلی یا اخلاقی (Ethical) گروہ (Group) یا اس کے ایک حصّے کو فنا کر دیا جائے:

(۱) ایسے کسی گروہ کے افراد کو قتل کرنا۔

(۲) ان کو شدید نوعیت کا جسمانی یا ذہنی ضرر پہنچانا۔

(۳) اس گروہ پر بالارادہ زندگی کے ایسے احوال کو مسلّط کرنا جو اس کی جسمانی بقا کے لیے کلّاً یا جزءًا تباہ کن ہوں۔

(۴) اس گروہ میں سلسلہ تولید کو روکنے کے لیے جبری اقدامات کرنا۔

(۵) جبری طور پر اس گروہ کی اولادوں کو کسی دوسرے گروہ کی طرف منتقل کرنا۔

Marfat.com

۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو جو "عالمی منشور حقوق انسانی" پاس کیا گیا تھا، اس کے دیباچے میں منجملہ دوسرے عزائم کے ایک یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ:

"بنیادی انسانی حقوق میں، فرد انسانی کی عزت و اہمیت میں، مردوں اور عورتوں کے مساویانہ حقوق میں اعتقاد کو موثق بنانے کے لیے۔"

نیز اس میں اقوام متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ:

"انسانی حقوق کا احترام قائم کرنے، اور نسل و صنف یا زبان و مذہب کا امتیاز کیے بغیر تمام انسانوں کو بنیادی آزادیاں دلوانے کے کام میں بین الاقوامی تعاون کا حصول۔"

اسی طرح دفعہ ۵۵ میں اقوام متحدہ کا یہ منشور کہتا ہے:

"مجلس اقوام متحدہ انسانی حقوق اور سب کے لیے اساسی آزادیوں کے عالمگیر احترام اور ان کی نگہداشت میں اضافہ کرے گی۔"

اس پورے منشور کے کسی جزو سے کوئی اختلاف کسی بھی قوم کے نمائندوں نے نہیں کیا۔ اختلاف نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ صرف عام اصولوں کا اعلان و اظہار تھا۔ کسی نوعیت کی پابندی کسی پر بھی عائد نہ ہوتی تھی۔ یہ کوئی معاہدہ نہیں ہے جس کی بنا پر دستخط کرنے والی تمام حکومتیں اس کی پابندی پر مجبور ہوں اور بین الاقوامی قانون کے

Marfat.com

مطابق ان پر قانونی وجوب عاید ہوتا ہو۔ اس میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ ایک معیار ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر بعض ملکوں نے اس کے حق میں یا اس کے خلاف ووٹ دینے سے اجتناب کیا۔

اب دیکھ لیجئے کہ اس منشور کے عین سائے میں انسانیت کے بالکل ابتدائی حقوق کا قتل عام دنیا میں ہو رہا ہے اور خود مہذب ترین اور سرکردہ ممالک کے اپنے ہاں ہو رہا ہے جو اسے پاس کرنے والے تھے۔

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اول تو مشرب دنیا میں انسانی حقوق کا تصور ہی دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا۔ دوسرے اگر آج ان حقوق کا ذکر کیا بھی جا رہا ہے تو ان کے پیچھے کوئی سند (Authority) اور کوئی قوت نافذہ (Sanction) نہیں ہے، بلکہ یہ صرف خوشنما خواہشات ہیں۔

اس کے مقابلہ میں اسلام نے حقوقِ انسانی کا جو منشور قرآن میں دیا اور جس کا خلاصہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر نشر فرمایا وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور ملّتِ اسلام کے لیے اعتقاد، اخلاق اور مذہب کی حیثیت سے واجب الاتباع بھی۔ پھر ان حقوق کو عملاً قائم کرنے کی بے مثل نظیریں بھی حضور پاکؐ اور خلفائے راشدین نے چھوڑی ہیں۔

Marfat.com

اب میں ان حقوق کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں جو اسلام نے انسان کو دیے ہیں۔

حرمت جان یا جینے کا حق

قرآن مجید میں دنیا کے سب سے پہلے واقعۂ قتل کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا اولین سانحہ تھا جس میں ایک انسان نے دوسرے انسان کی جان لی۔ اس وقت پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی کہ انسان کو انسانی جان کا احترام سکھایا جائے اور اسے بتایا جائے کہ ہر انسان کا حق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا، وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۝ (۵-۳)

جس نے کسی متنفس کو، بغیر اس کے کہ اس نے قتلِ نفس کا ارتکاب کیا ہو، یا زمین میں فساد انگیزی کی ہو، قتل کر دیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا، اور جس نے اسے زندہ رکھا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔

اس آیت میں قرآن کریم نے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانی دنیا کا قتل بتایا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ایک انسان کی جان بچانے کو پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ٹھہرایا ہے۔ "احیاء" کے معنی ہیں زندہ کرنا ــــ دوسرے الفاظ میں اگر کسی شخص نے انسانی زندگی کو بچانے کے لیے کوشش کی اس نے انسان کو زندہ

Marfat.com

کرنے کا کام کیا۔ یہ کوشش اتنی بڑی نیکی ہے کہ اسے ساری انسانیت کے زندہ کرنے کے برابر ٹھہرایا گیا ہے۔ اس اصول سے صرف دو حالتیں مستثنیٰ ہیں:

ایک یہ کہ کوئی شخص قتل کا مرتکب ہو اور اسے قصاص کے طور پر قتل کیا جائے۔

دوسری یہ کہ کوئی شخص زمین میں فساد برپا کرے تو اسے قتل کیا جائے۔

ان دو حالتوں کے ماسوا انسانی جان کو ضائع نہیں کیا جا سکتا[1]

انسانی جان کے تحفظ کا یہ اصول اللہ تعالےٰ نے تاریخ انسانی کے ابتدائی دور میں واضح کر دیا تھا۔ انسان کے بارے میں یہ خیال کرنا غلط ہے کہ وہ تاریکی میں پیدا ہوا ہے اور اپنے ہم جنسوں کو قتل کرتے کرتے کسی مرحلہ پر اس نے یہ سوچا کہ انسان کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی پر مبنی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شروع سے رہنمائی کی ہے اور اسی رہنمائی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ اس نے انسان کو انسان کے حقوق سے آشنا کیا۔

---

[1] مزید ملاحظہ ہو آیت لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (۱۷-۲۳)

Marfat.com

معذوروں اور کمزوروں کا تحفظ

دوسری بات جو قرآن سے معلوم ہوتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے واضح ہے، یہ ہے کہ عورت، بچے، بوڑھے، زخمی اور بیمار کے اوپر کسی حال میں بھی دست اندازی جائز نہیں ہے ـــــ خواہ وہ اپنی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا دشمن قوم سے ـــــ اِلّا یہ کہ جنگ کی صورت میں یہ افراد خود برسرِ پیکار ہوں۔ ورنہ دوسری ہر صورت میں ان پر دست اندازی کی ممانعت ہے۔ یہ اصول اپنی قوم کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے ساتھ یہی اصول برتا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں بڑی واضح ہدایات دی ہیں۔ خلفائے راشدین کا یہ حال تھا کہ وہ جب دشمنوں سے مقابلہ کے لیے فوجیں روانہ کرتے تھے تو وہ پوری فوج کو یہ صاف ہدایات دیتے تھے کہ دشمن پر حملہ کی صورت میں کسی عورت، بچے، بوڑھے، زخمی اور بیمار پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔

تحفظِ ناموسِ خواتین

ایک اور اصولی حق جو ہمیں قرآن سے معلوم ہوتا ہے اور حدیث میں بھی اس کی تفصیلات موجود ہیں، یہ ہے کہ عورت کی عصمت ہر حال میں واجب الاحترام ہے۔ یعنی جنگ کے اندر دشمنوں کی عورتوں سے بھی اگر سابقہ پیش آئے تو کسی مسلمان سپاہی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان پر ہاتھ ڈالے۔ قرآن کی رو سے بدکاری مطلقاً حرام ہے، خواہ

Marfat.com

وہ کسی عورت سے کی جائے وقطع نظر اس کے کہ وہ عورت مسلمان ہو یا غیر مسلم، اپنی قوم کی ہو یا غیر قوم کی، دوست ملک کی ہو یا دشمن ملک کی۔

معاشی تحفظ

ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ بھوکا آدمی ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے روٹی دی جائے، ننگا ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے کپڑا دیا جائے، زخمی اور بیمار آدمی ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے علاج کی سہولت فراہم کی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ بھوکا، ننگا، زخمی، یا مریض شخص دشمن ہو یا دوست، یہ عمومی (Universal) حقوق میں سے ہے۔ دشمن کے ساتھ بھی ہم یہی سلوک کریں گے۔ اگر دشمن قوم کا کوئی فرد ہمارے پاس آجائے گا تو ہمارا فرض ہو گا کہ اسے بھوکا ننگا نہ رہنے دیں اور زخمی یا بیمار ہو تو اس کا علاج کرائیں۔[1]

عادلانہ طرز معاملہ

قرآن کریم کا یہ اٹل اصول ہے کہ انسان کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ — کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۱۵ - ۱۹) نیز آیت ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا۔ (۷۶ - ۸)

Marfat.com

قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ،

(۵-۸)

نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے۔

اس آیت میں اسلام نے یہ اصول متعین کر دیا کہ انسان کے ساتھ ــــ ایک فرد کے ساتھ بھی اور ایک قوم کے ساتھ بھی ــــ بہر حال انصاف کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ اسلام کے نزدیک یہ قطعاً درست نہیں ہے کہ دوستوں کے ساتھ تو ہم عدل و انصاف برتیں اور دشمنوں کے ساتھ اس اصول کو نظر انداز کر دیں۔

نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون

ایک اور اصول جو قرآن معین کرتا ہے، یہ ہے کہ نیکی اور حق رسانی کے معاملے میں ہر ایک کے ساتھ تعاون کیا جائے اور برائی اور ظلم کے معاملہ میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔ برائی خواہ بھائی کر رہا ہو، تو بھی ہم اس کے ساتھ تعاون نہ کریں، اور نیکی اگر دشمن بھی کر رہا ہو تو اس کی جانب دستِ تعاون بڑھائیں۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ

(۵-۳)

جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں، ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔

Marfat.com

بِرّ کے معنی صرف نیکی ہی نہیں، بلکہ عربی زبان میں یہ لفظ "حق رسانی" کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دوسروں کو حقوق دلوانے میں اور تقویٰ اور پرہیزگاری میں ہم ہر ایک کی مدد کریں۔ قرآن کا یہ مستقل اور دائمی اصول ہے۔

مساوات کا حق

ایک اور اصول جسے قرآنِ کریم نے بڑے زور شور کے ساتھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان یکساں ہیں۔ اگر کسی کو فضیلت حاصل ہے تو وہ اخلاق کے اعتبار سے ہے۔ اس معاملے میں قرآن کا ارشاد ہے:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۔

(۴۹ - ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہیں گروہوں اور قبیلوں میں اس لیے بانٹا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

اس میں پہلی بات یہ بتائی گئی کہ تمام انسان، ایک ہی اصل سے ہیں۔ یہ مختلف نسلیں، مختلف رنگ، مختلف زبانیں درحقیقت انسانی دنیا کے لیے کوئی معقول وجہ تقسیم نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ بتائی کہ ہم نے قوموں کی یہ تقسیم صرف تعارف

Marfat.com

کے لیے کی ہے - دوسرے الفاظ میں ایک برادری، ایک قوم اور ایک قبیلہ کو دوسرے پر کوئی فخر و فضیلت نہیں ہے کہ وہ اپنے حقوق تو بڑھا چڑھا کر رکھے اور دوسروں کے کم۔ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی یہ تفریقیں کی ہیں، شکلیں ایک دوسرے سے مختلف بنائی ہیں یا زبانیں ایک دوسرے سے الگ رکھی ہیں تو یہ سب چیزیں فخر کے لیے نہیں ہیں بلکہ صرف اس لیے ہیں کہ باہم تمیز پیدا کر سکیں - اگر تمام انسان یکساں ہوتے تو تمیز نہ کی جا سکتی - اس لحاظ سے یہ تقسیم فطری ہے، لیکن دوسروں کے حقوق مارنے اور بے جا امتیاز برتنے کے لیے نہیں ہے - عزت و افتخار کی بنیاد اخلاقی حالت پر ہے - اس بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے طریقہ سے بیان فرمایا ہے - آپؐ نے فتح مکہ کے بعد جو تقریر ارشاد فرمائی - اس میں فرمایا :

لا فضل للعربی علی	کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت
اعجمی ولا لاعجمی علی	نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی
عربی ولا لاحمر علی اسود	گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو
ولا لاسود علی احمر الا	گورے پر ــــ ماسوا تقویٰ کے اللہ
بالتقوی ولا فضل للانساب۔	نسبی بنیادوں پر کوئی فضیلت نہیں

ہے -

یعنی فضیلت دیانت اور تقویٰ پر ہے - ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص چاندی سے پیدا کیا گیا ہو اور کوئی پتھر سے اور کوئی مٹی سے۔ بلکہ

Marfat.com

سب انسان یکساں ہیں [1]

معصیت سے اجتناب کا حق

ایک اور اصول یہ ہے کہ کسی شخص کو معصیت کا حکم نہیں دیا جا سکتا اور نہ کسی پر یہ واجب یا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ اس کو اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو وہ اطاعت کرے۔ قانونِ قرآن کی رو سے اگر کوئی افسر اپنے ماتحت کو ناجائز کاروائیوں کا حکم دیتا ہے یا کسی پر بے جا دست درازی کا حکم دیتا ہے تو ماتحت کے لیے اس معاملے میں اپنے افسر کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق جن چیزوں کو خالق نے ناجائز ٹھہرایا ہے اور معصیت بتایا ہے کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ ان کے ارتکاب کا کسی کو حکم دے۔ نہ حکم دینے والے کے لیے معصیت کا حکم دینا جائز ہے اور نہ کسی دوسرے شخص کے لیے ایسے حکم کی تعمیل جائز ہے۔

---

[1] نظامِ فرعونی کو قرآن نے جس وجوہ سے باطل قرار دیا ہے ان میں سے ایک یہ تھی کہ: ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعاً یستضعف طائفۃ منھم (۲۸ - ۴)۔ یعنی اسلام اس کا روادار نہیں کہ کسی معاشرہ میں انسانوں کو فوقانی اور تحتانی یا حکمران اور محکوم طبقوں میں بانٹا جائے۔

Marfat.com

ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق

اسلام کا ایک عظیم الشان اصول یہ ہے کہ کسی ظالم کو اطاعت کا حق نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو امام مقرر کیا اور فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، تو حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے سوال کیا کہ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ (کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے ؟) تو اللہ نے جواب میں ارشاد فرمایا: لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ[1] (میرا وعدہ ظالموں کے متعلق نہیں ہے) عہد کا لفظ یہاں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ انگریزی زبان میں "لیٹر آف اپوائنٹمنٹ" (Letter of Appointment) کا مفہوم ہے۔ اردو میں پروانہ امر کہیں گے۔

اس آیت میں اللہ نے صاف بتا دیا کہ ظالموں کو اللہ کی طرف سے کوئی ایسا پروانہ امر نہیں کہ وہ دوسرے سے اطاعت کا مطالبہ کریں[2]۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ "کوئی ظالم اس امر کا مستحق نہیں ہے کہ

---

[1] القرآن (۲ - ۱۲۴) -

[2] مزید برآں صریح آیات سامنے رہیں : لا تطیعوا امر المسرفین (۲۶-۱۵۱) ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا (۱۸-۲۸) ۳ - واجتنبوا الطاغوت (۱۶-۳۶) ۴ - وتلک عاد جحدوا بآیات ربھم و عصوا رسلہ واتبعوا امر کل جبار عنید ۱۱-۵۹ -

Marfat.com

وہ مسلمانوں کا امام ہو۔ اگر ایسا شخص امام بن جائے تو اس کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ اسے صرف برداشت کیا جائے گا۔"

سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق

انسان کے بنیادی حقوق میں سے ایک بڑا حق اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد حکومت میں حصہ دار ہیں۔ تمام افراد کے مشورے سے حکومت قائم ہونی چاہیے۔ قرآن نے فرمایا: لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ[1] (اللہ تعالیٰ ان کو ــــ یعنی اہل ایمان کو ــــ زمین میں خلافت دے گا)۔ یہاں جمع کا لفظ استعمال کیا اور فرمایا کہ ہم بعض افراد کو نہیں بلکہ پوری قوم کو خلافت دیں گے۔ حکومت ایک فرد کی یا ایک خاندان کی یا ایک طبقے کی نہیں، بلکہ پوری ملت کی ہوگی اور تمام افراد کے مشورے سے وجود میں آئے گی۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ[2]۔ یعنی یہ حکومت آپس کے مشورے سے چلے گی۔ اس معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاف الفاظ موجود ہیں، کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر ان پر حکومت کرے۔ مسلمان راضی ہوں تو ان پر حکومت کی جا سکتی ہے اور راضی نہ ہوں تو نہیں کی جا سکتی۔ اس حکم کی رو سے اسلام

---

[1] القرآن (۲۴ - ۵۵)

[2] القرآن (۴۲ - ۳۸)۔ نیز آیت: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳ - ۱۵۹)

Marfat.com

ایک جمہوری دشورائی حکومت کا اصول قائم کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری بدقسمتی سے تاریخ کے ادوار میں ہمارے اوپر بادشاہیاں مسلط رہی ہیں۔ اسلام نے ہمیں ایسی بادشاہیوں کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ ہماری اپنی جماعتوں کا نتیجہ ہیں۔

آزادی کا تحفظ

ایک اور اصول یہ ہے کہ کسی انسان کی آزادی عدل کے بغیر سلب نہیں کی جا سکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ: لا یرمس رجل فی الاسلام الا بحق: اس کی رو سے عدل کا وہ تصور قائم ہوتا ہے جسے موجودہ اصطلاح میں باضابطہ عدالتی کارروائی (Judicial Process of Law) کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی آزادی سلب کرنے کے لیے اس پر متعین الزام لگانا، کھلی عدالت میں اس پر مقدمہ چلانا اور اسے دفاع کا پورا پورا موقع دینا۔ اس کے بغیر کسی کارروائی پر عدل کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل معمولی عقل کا تقاضا ہے کہ ملزم کو صفائی کا موقع دیے بغیر انصاف نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں اور امریکہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ایک شخص کو پکڑا جائے اور اسے صفائی کا موقع دیے بغیر بند کر دیا جائے۔ اسلامی حکومت اور عدلیہ کے لیے انصاف کے تقاضے پورے کرنا قرآن نے واجب ٹھہرایا ہے[1]

---

[1] آیت، واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل (۴-۵۸)۔

Marfat.com

تحفظِ ملکیت

ایک بنیادی حق یہ ہے کہ قرآن واضح طور پر انفرادی ملکیت کا تصور دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ۔ (۲-۱۸۸)

تم باطل طریقے سے ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ۔

اگر قرآن و حدیث اور فقہ کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے مال کو کھانے کے کون کون سے طریقے باطل ہیں۔ اسلام نے ان طریقوں کو مبہم نہیں رکھا ہے۔ اس اصولی کی رو سے کسی آدمی سے ناجائز طریقے سے کوئی مال حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ .....

کسی شخص کو یا کسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قانون توڑ کر اور ان متعین شکلوں کے علاوہ جو خود اسلام نے واضح کر دی ہیں، کسی کی ملکیت پر دست درازی کرے۔

عزت کا تحفظ

انسان کا یہ بھی بنیادی حق ہے کہ اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے۔ سورہ حجرات میں اس حق کی پوری تفصیل موجود ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے کہ :

۱۔ لا یسخر قوم من قوم۔ تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے۔

Marfat.com

۲- ولا تنابزوا بالالقاب۔ اور تم ایک دوسرے کو بُرے القاب سے نہ پکارو۔

۳- ولا یغتب بعضکم بعضا۔ (۴۹-۱۱-۱۲) اور تم ایک دوسرے کی برائی پیٹھ پیچھے بیان نہ کرو۔

یعنی جتنی شکلیں بھی انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کرنے کی ہو سکتی ہیں۔ ان سے منع کر دیا گیا۔ وضاحت سے کہہ دیا کہ انسان خواہ موجود ہو خواہ موجود نہ ہو اُس کا نہ مذاق اڑایا جا سکتا ہے، نہ بُرے القاب دیے جا سکتے ہیں اور نہ اس کی برائی کی جا سکتی ہے۔ ہر شخص کا یہ قانونی حق ہے کہ کوئی اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے اور ہاتھ سے یا زبان سے اس پر کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔

نجی زندگی کا تحفظ

اسلام کے بنیادی حقوق کی رو سے ہر آدمی کو (۴۹:۱۲) یعنی نجی زندگی کو محفوظ بنانے کا حق حاصل ہے۔ اس سلسلے میں سورہ نور میں وضاحت کر دی گئی کہ لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا[1]۔ (اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو تاآنکہ ان کے ساتھ ربط ضبط بڑھا چکو)۔ سورۂ حجرات میں فرمایا گیا لا تجسسوا[2] (تجسس نہ کرو)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

---

[1] القرآن (۲۴-۲۷)۔

[2] القرآن (۴۹-۱۲)۔

Marfat.com

مبارک ہے کہ ایک آدمی کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے گھر سے دوسرے آدمی کے گھر میں جھانکے۔ ایک شخص کو پورا پورا آئینی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر میں دوسروں کے شور و شغب سے، دوسروں کی تاک جھانک سے اور دوسروں کی مداخلت سے محفوظ و مامون رہے۔ اس کی گھریلو زندگی کی رازداری اور پردہ داری برقرار رہنی چاہیے۔ مزید برآں یہ کہ کسی شخص کو دوسرے کا خط اوپر سے نگاہ ڈال کر دیکھنے کا حق بھی نہیں ہے کجا کہ اسے پڑھا جائے۔ اسلام انسان کی پرائیویسی کا پورا پورا تحفظ کرتا ہے اور صاف ممانعت کرتا ہے کہ گھروں میں تانک جھانک نہ کی جائے۔ اور کسی کی ڈاک نہ دیکھی جائے الا یہ کہ کسی شخص کے متعلق معتبر ذریعہ سے یہ اطلاع مل جائے کہ وہ کوئی خطرناک کام کر رہا ہے۔ ورنہ خواہ مخواہ کسی کے حالات کا تجسس کرنا شریعتِ اسلامی میں جائز نہیں ہے۔

ظلم کے خلاف احتجاج کا حق۔

اسلام کے بنیادی حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم (۴/۱۴۸)	اللہ (تعالیٰ) کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔

یعنی مظلوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ظالم کے خلاف آواز اٹھائے۔

Marfat.com

آزادئ اظہار

ایک اور اہم چیز جسے آج کے زمانہ میں آزادئ اظہار (Freedom of Expression) کہا جاتا ہے، قرآن اسے دوسری زبان میں بیان کرتا ہے۔ مگر دیکھئے مقابلتاً قرآن کا کتنا بلند تصور ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ "امر بالمعروف[1]" اور "نہی عن المنکر" نہ صرف انسان کا حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے۔ قرآن کی رو سے بھی اور حدیث کی ہدایات کے مطابق بھی انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ بھلائی کے لیے لوگوں سے کہے اور برائی سے روکے۔ اگر کوئی برائی ہو رہی ہو تو صرف یہی نہیں کہ بس اس کے خلاف آواز اٹھائے، بلکہ اس کے انسداد کی کوشش بھی فرض ہے۔ اور اگر اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاتی اور اس کے انسداد کی فکر نہیں کی جاتی تو اتنا گناہ ہوگا۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کو پاکیزہ رکھے۔ اگر اس معاملے میں مسلمان کی آواز بند کی جائے تو اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے بھلائی کے فروغ سے روکا تو اس نے نہ صرف ایک بنیادی حق سلب کیا بلکہ ایک فرض کی ادائیگی سے روکا۔ معاشرے کی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو ہر حالت میں یہ حق

---

[1] ملاحظہ ہو آیت: کنتم خیر امة اخرجت للناس، تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر ..... (۳ - ۱۱۰)

Marfat.com

حاصل رہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کے تنزل کے اسباب بیان کیے ہیں اُن میں سے ایک سبب یہ بیان کیا ہے کہ کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ[1] (وہ برائیوں سے ایک دوسرے کو باز نہ رکھتے تھے)۔ یعنی کسی قوم میں اگر یہ حالات پیدا ہو جائیں کہ برائی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے والا نہ ہو تو آخر کار رفتہ رفتہ برائی پوری قوم میں پھیل جاتی ہے اور وہ پھپھوندی کے سڑے ہوئے ٹوکرے کی مانند ہو جاتی ہے جس کو اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس قوم کے عذابِ الٰہی کے مستحق ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق

اسلام نے "لَآ إِكْرَاهَ فِي ٱلدِّينِ" (۲-۲۵۶) کا اصول انسانیت کو دیا اور اس کے تحت ہر شخص کو آزادی عطا کی کہ وہ کفر و ایمان میں سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ قوت کا استعمال اسلام میں اگر ہے تو دو ضرورتوں کے لیے ہے۔ ایک یہ کہ اسلامی ریاست کے وجود اور اس کے استقلال کی سلامتی کے لیے میدانِ جہاد میں دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ نظم و نسق اور امن و امان کے تحفظ کے لیے جرائم اور فتنوں کا سدِّ باب کرنے کے لیے عدالتی اور انتظامی اقدامات کیے جائیں۔

---

[1] القرآن (۵-۷۹)

Marfat.com

ضمیر و اعتقاد کی آزادی ہی کا قیمتی حق تھا جسے حاصل کرنے کے لیے مکہ کے سبزدہ سالہ دورِ ابتلا میں مسلمانوں کے لیے ماریں کھا کھا کر کلمۂ حق کہا اور بالآخر یہ حق ثابت ہو کے رہا۔ مسلمانوں نے یہ حق جس طرح اپنے لیے حاصل کیا تھا، اسی طرح دوسروں کے لیے بھی اس کا پورا پورا اعتراف کیا۔ اسلامی تاریخ اس بات سے خالی ہے کہ مسلمانوں نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو، یا کسی قوم کو مار مار کر کلمہ پڑھوایا ہو۔

مذہبی دلآزاری سے تحفظ کا حق

اسلام اس امر کا روادار نہیں کہ مختلف مذہبی گروہ ایک دوسرے کے خلاف دریدہ دہنی سے کام لیں اور ایک دوسرے کے پیشواؤں پر کیچڑ اچھالا کریں۔ قرآن میں ہر شخص کے مذہبی معتقدات اور اس کے پیشوانِ مذہب کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔ ہدایت یہ ہے کہ ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ[1] (ان کو برا بھلا نہ کہو جنہیں یہ لوگ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں)، یعنی مختلف مذاہب اور معتقدات پر دلیل سے گفتگو کرنا اور معقول طریق سے تنقید کرنا یا اظہارِ اختلاف کرنا تو آزادیٔ اظہار کے حق میں شامل ہے، مگر دلآزاری کے لیے بدگوئی کرنا روا نہیں۔

---

[1] القرآن: ۶-۱۰۹)

Marfat.com

آزادیٔ اجتماع کا حق

آزادیٔ اظہار کے عین منطقی نتیجے کے طور پر آزادیٔ اجتماع کا حق نمودار ہوتا ہے۔ جب اختلافِ آرا کو انسانی زندگی کی ایک اٹل حقیقت کے طور پر قرآن نے بار بار پیش کیا ہے تو پھر اس امر کی روک تھام کہاں ممکن ہے کہ ایک طرح کی رائے رکھنے والے لوگ آپس میں مربوط ہوں۔ ایک اصول اور نظریئے پر مجتمع ہونے والی ملت کے اندر بھی مختلف مدارسِ فکر ہو سکتے ہیں اور ان کے متوسلین بہرحال باہم دگر قریب تر ہوں گے۔ قرآن کہتا ہے:

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔ (۵-۷۸)

اور تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ضرور ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائیں، معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں۔

عملی زندگی میں جب "خیر"، "معروف" اور "منکر" کے تفصیلی تصورات میں فرق واقع ہوتا ہے تو ملت کی اصولی وحدت کے قائم رہتے ہوئے بھی اس کے اندر مختلف مدارسِ فکر تشکیل پاتے ہیں اور —— یہ بات معیارِ مطلوب سے کتنی بھی فروتر ہو —— گروہوں اور پارٹیوں کا ظہور ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں کلام میں بھی، فقہ و قانون میں بھی اور سیاسی نظریات میں بھی اختلافِ آراء آیا اور اس کے ساتھ مختلف گروہ وجود میں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی دستور اور منشورِ حقوق کے لحاظ

Marfat.com

سے کیا مختلف اخلاقی آراء رکھنے والوں کے لیے آزادی اجتماع کا حق ہے؟ یہ سوال سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے خوارج کے ظہور پہ پیش آیا اور آنجناب نے ان کے لیے آزادی اجتماع کے حق کو تسلیم کر لیا۔ انہوں نے خارجیوں سے فرمایا۔ "جب تک تم تلوار اٹھا کر زبردستی اپنا نظریہ دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرو گے، تمہیں پوری آزادی حاصل رہے گی۔"

عمل غیر کی ذمہ داری سے برئیت

اسلام میں آدمی صرف اپنے اعمال اور اپنے جرائم کے لیے جوابدہ ہے۔ دوسروں کے اعمال اور دوسروں کے جرائم میں اسے پکڑا نہیں جا سکتا۔ قرآن نے اصول یہ قرار دیا ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ۔ (۶-۱۶۴) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے پر مکلف نہیں ہے۔

اسلامی قانون میں اس کی گنجائش نہیں کہ کہ سے ڈاڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔

شبہات پر کارروائی نہیں کی جائے گی

اسلام میں ہر شخص کو یہ تحفظ حاصل ہے کہ تحقیق کے بغیر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اس سلسلے میں قرآن کی واضح ہدایت ہے کہ کسی کے خلاف اطلاع ملنے پر تحقیقات کر لو۔ تاکہ ایسا

Marfat.com

نہ ہو کہ کسی گروہ کے خلاف لاعلمی میں کوئی کارروائی کر بیٹھیو۔[1] علاوہ بریں قرآن نے یہ ہدایت بھی دی ہے: اجتنبوا کثیرًا من الظّنّ۔ (۴۹-۱۲)

اجمالاً یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جو اسلام نے انسان کو عطا کیے ہیں۔ ان کا تصوّر بالکل واضح اور مکمّل ہے جو انسانی زندگی کے آغاز ہی سے انسان کو بتا دیا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسی وقت بھی دنیا میں انسانی حقوق کا جو اعلان (Declaration of Human Rights) ہوا ہے اُسے کسی قسم کی سند اور قوّتِ نافذہ حاصل نہیں ہے۔ بس ایک بلند معیار پیش کر دیا گیا ہے۔ اس معیار پر عمل درآمد کی کوئی قوم پابند نہیں ہے۔ نہ اور کوئی ایسا مؤثر معاہدہ ہے جو ان حقوق کو ساری قوموں سے منوا سکے۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت کے پابند ہیں۔ خدا اور رسولؐ نے بنیادی حقوق کی پوری وضاحت کر دی ہے۔ جو مملکت اسلامی ریاست بننا چاہے گی اسے یہ حقوق لازماً دینے ہوں گے۔ مسلمانوں کو بھی یہ حقوق دیے جائیں گے اور دوسری اقوام کو بھی، اس معاملے میں کسی ایسے معاہدے کی حاجت نہیں ہو گی کہ فلاں قوم اگر ہمیں یہ حق دے گی تو ہم اُسے دیں گے۔ بلکہ مسلمانوں کو بہرحال یہ حقوق دینے ہوں گے۔ دوستوں کو بھی، اور دشمنوں کو بھی۔

(سیارہ: ماہ اگست ۱۹۶۲ء)

---

[1] ملاحظہ ہو آیت: اِذَا جَآءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۴۹-۶)

Marfat.com

لبیب السعید :

محبّ الدین الخطیب، صاحب "الفتح" نے جہادِ آزادی کا علم بلند کیا اور خوابیدہ قوم کو جھنجھوڑا۔ احمد حسن زیات، صاحب "الرسالۃ" نے ادب برائے زندگی کی طرح ڈالی اور علم و فکر، اور تاریخ و سیاست میں ادب، دین اور دعوت کا رنگ بھرا۔ امام حسن البنّا نے کہا : "اسلام ہمارا دستورِ زندگی ہے۔" اور پھر اسلام کو پوری زندگی پر نافذ کرنے کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ تینوں آوازوں نے مل کر مصر، بلکہ پورے عرب میں ایک تہلکہ برپا کر دیا۔ غفلت بیداری سے بدلی۔ بھٹکے ہوئے آہو کو شراغِ حرم ملا۔ اجتماعی زندگی کے دھارے نے رُخ تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ "اسلام پوری زندگی کا نظام ہے" تسلیم کر لیا گیا۔ مگر یہ سوال اٹھا کہ "زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اس نظام کی تفصیلات کیا ہیں ؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے مختلف اہلِ علم میدان میں اُتر آئے۔ کچھ الشہاب اور المسلمون کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور کچھ حسبِ

Marfat.com

ذوق الرسالۃ کے حلقہ ارادت سے منسلک ہوئے۔ تحقیق و تنقیح اور تفکر و تدبر کا دور شروع ہوا۔ تاریخ کے اوراق کھنگالے گئے، فقہ و شریعت کے مصادر کا جائزہ لیا گیا، کتاب و سنت سے استنباط و استفادہ کی مجلسیں قائم ہوئیں۔ اور اہل علم و دانش کی عظیم جماعت نے چشم زدن میں وقت کے اہم سوال کا جواب فراہم کر دیا۔

قاہرہ کے نوجوان گریجویٹ پروفیسر لبیب السعید اسی جماعت کے ایک فرد ہیں۔ اور زیر نظر دو مقالے: "ملازموں کے حقوق و فرائض" اور "بلدیاتی نظام" مذکورہ سوال کے جواب کا ایک حصہ ہیں۔ پروفیسر لبیب کا ذہن علم و تحقیق احمد حسن زیات کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ زیات کے الرسالۃ ہی میں ان کی علمی کاوشیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اور ارباب نظر سے خراج تحسین حاصل کرتی رہی ہیں۔ مذکورہ دونوں مقالے بھی الرسالۃ ہی سے نقل کیے گئے ہیں۔

Marfat.com

اسلامی حکومت میں ملازموں کے حقوق و فرائض

اسلامی حکومت میں کارکنانِ حکومت اور سرکاری عہدیداروں کے فرائض و واجبات اور اوصاف و آداب معلوم کرنے کے لیے جب ہم اسلامی لٹریچر کی ورق گردانی کرتے ہیں، تو اس بارے میں ہمیں معلومات کا اس قدر وسیع اور تفصیلی ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے کہ اس مسئلے کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہتا جس میں صاحبِ تحقیق تشنگی محسوس کر سکے۔ البتہ یہ ذخیرہ یکجا اور مرتب شکل میں نہیں ہے اس لیے اس میدان میں تحقیق و طلب کے لیے اترنے والے کو مختلف کتابوں کی ورق گردانی اور مختلف گلستانوں سے گل چینی کرنی پڑتی ہے۔ یہ ذخیرہ اپنے دامن میں صحت مند اور مستحکم و مربوط نظام حکومت کے ایسے حکیمانہ اور مصلحت آمیز عجائب و نوادر رکھتا ہے کہ اس کے مقابلے میں جدید ترقی یافتہ ادارہ ہائے حکومت ناقص اور نارسا معلوم ہوتے ہیں۔ جب ہم اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس مطالبے کے ساتھ ہمیں یہ ضرورت بھی دامنگیر ہوتی ہے کہ اسلام کے سروس سسٹم اور حکومت کے نظم و نسق کے محاسن و امتیازات سے بھی عوام کو روشناس کرائیں تاکہ انھیں غیر اسلامی

Marfat.com

نظامِ حکمرانی اور اسلامی نظامِ حکومت میں تقابل کرنے میں آسانی رہے۔ زیرِ نظر مضمون اسی غرض کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اپنے موضوع پر پورا حاوی نہیں ہے تاہم اس مجمل خاکے سے اس موضوع کے خدّ و خال کسی قدر معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ میں اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد رکھا تو اس کے قیام کے ساتھ ہی ایک ایسا نظام عمل وجود میں آگیا جس کا بار اٹھانے کے لیے خدا ترس، دیانت دار اور احساسِ ذمہ داری رکھنے والے کارکنوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ مختصر سے مختصر جماعت اور چھوٹی سے چھوٹی اجتماعی مہم کے لیے بھی اپنا امیر اور سربراہ منتخب کریں۔ اس طرح آپؐ نے نہایت حکیمانہ طریقے سے چھوٹے چھوٹے اجتماعی کاموں میں نظم و ضبط کی تلقین فرما کر بڑے پیمانے پر ہونے والے اجتماعی کاموں میں نظم و نسق اور جماعتی شیرازہ بندی کی ضرورت اور اہمیت واضح کر دی[1]۔ اور اسلامی ریاست کے لیے موزوں و مطلوب کارکنوں کی تربیت کا دائمی انتظام کر دیا۔ مدینہ میں تمام معاملات کی سربراہ کاری اور رہنمائی آپؐ نے اپنے ہاتھ میں لے لی، اور مدینہ کے باہر دور و نزدیک کے مقامات پر اپنی جانب سے عاملوں

---

[1] الحسبۃ فی الاسلام۔ ابن تیمیہ ص ۵

Marfat.com

اور والیوں کا تقرر کیا۔ جنگی مہم درپیش ہوئی تو فوج کے لیے سپہ سالار نامزد فرمائے۔ زکوٰۃ و صدقات کی جمع و تقسیم کے لیے محصّلین کا بندوبست کیا[1]

موجودہ حکومتوں کے سررشتہ ہائے نظم و نسق، جن کا عرب کی قدیم دنیا میں ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے، مدینہ کی اسلامی حکومت میں اُن میں سے بیشتر کا وجود ہمیں ملتا ہے۔ چونکہ موجودہ ترقی یافتہ حکومت کی محکمانہ اصطلاحات اس وقت رائج نہ تھیں۔ اس لیے ان اصطلاحات (Terms) سے اُس وقت کے محکمے موسوم نہ تھے مگر عملاً یہ صیغہ جاتی نظام اپنی سادہ و مختصر شکل میں موجود تھا۔ خود عہدِ نبوّت میں ہم کو وزارت اور سررشتۂ کار کی متعدد صورتوں اور سفارت و قضا کے مناصب کا وجود ملتا ہے۔ کارپردازانِ حکومت میں سے واجباتِ حکومت وصول کرنے والے، محافظینِ امنِ عامہ، اربابِ تعلیم و صحت، مالیات و جنگی امور کے ذمّہ دار، غنائم اور اموالِ فَے کے منتظمین اور ترجمانِ حکومت وغیرہ کے عہدے ملتے ہیں۔ بلکہ بعض ایسے مناصب بھی ملتے ہیں جو مزاج و ضرورت کے لحاظ سے ترقی یافتہ اور متمدّن گورنمنٹ سے مختص ہیں۔ جیسے پرائیویٹ سیکرٹری اور

---

[1] ایضاً ص ۱۸

Marfat.com

افسرِ استقبال کے منصب[1]

لیکن ان اعمال ومناصب کے لیے اصطلاحات کے وہ لباس نہ تھے جو آج رائج ہیں، اور نہ تصنّع اور شکوہ وطمطراق کے وہ مناظر نظر آتے ہیں جو دورِ حاضر کی حکومتوں کا خاصہ قرار پا چکے ہیں۔

اسلام میں سرکاری منصب کا تصوّر اور اس کے تقاضے

اسلام سرکاری ملازمت اور عہدیداری کو حصولِ جاہ ومنزلت، منفعت جوئی اور کسبِ دنیا کا ذریعہ نہیں قرار دیتا۔ بلکہ اسے ایک ناگوار تکلیف اور امت کی پاسبانی کی کٹھن اور زہرہ گداز ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ جو شخص اس ذمّہ داری کو اپنی پشت پر لاد لیتا ہے اور پھر اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے اطمینان سے گھر میں بیٹھ رہتا ہے یا تغافل برتتا ہے، وہ خدا کی نگاہ میں مبغوض ٹھہرتا ہے، قیامت کے روز اہلِ جنّت کے زمرے میں اس کا کوئی مقام نہیں ہوگا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

مامن امیر یلی امر	جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا
المسلمین ثم لا یجهد لهم	ذمہ دار بنایا جائے پھر نہ تو وہ ان کے
وینصح الا لم یدخل الجنة	لیے دوڑ دھوپ کرے اور نہ ان کی

---

[1] التراتیب الاداریہ، محمد الکتانی (رباط، مراکش)، ج۱ ص ۳۸۰، ۳، ج۲ ص ۱۴۴۔

Marfat.com

معہم[1] خیر خواہی کرے ان کے ساتھ وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

اسلام کا تقاضا صرف یہ نہیں کہ اس ذمہ داری کو پوری سرگرمی اور بے نفسی سے ادا کیا جائے بلکہ کارکنانِ حکومت سے اسلام یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ رعایا اور ماتحتوں کے ساتھ نرمی، دلداری اور شفقت و محبت کا برتاؤ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے رحم حکام کے بارے میں فرمایا ہے: انّ شرّ الرعاء الحُطَمَة[2] (بدترین حاکم حطمہ ہے) حطمہ کے معنی ہیں پامال کرنے والا۔ یعنی ایسا سنگدل اور سخت گیر حاکم جو رعایا کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی سے معاملہ کرنے کے بجائے درشت مزاجی اور تند خوئی کا رویہ اختیار کرے اور اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنے کے بجائے اسے پامال کرے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک دل اور مشفق حاکم کے حق میں اللہ سے مہربانی کی دعا کی ہے وہاں سخت گیر اور بدخواہ حاکم کے لیے آپؐ نے بددعا کی ہے۔ آپؐ کے الفاظ یہ ہیں:

اللھم من ولی من امر امتی شیئًا فشقّ علیھم فاشقق	اے اللہ! جو شخص میری امت کے لوگوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا جائے

---

[1] [2] صحیح مسلم۔

Marfat.com

علیہ، ومن ولی من امر امتی شیئاً فرفق بہم فارفق بہ[1]۔

اور وہ ان کو مشقت میں ڈالے تو تُو بھی اسے مشقت میں ڈال، اور جو ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے تو تُو بھی اسکے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔

ایک اور روایت میں رعیت کی بدخواہی اور حق تلفی کو ایسا سخت جرم بتایا گیا ہے جو قیامت کے روز حکمران کو جنت سے محروم کرنے اور اللہ کے غضب کا مستحق قرار دینے کے لیے کافی ہے:

مامن عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ یموت یوم یموت وھو غاش لرعیتہ الاحرم اللہ علیہ الجنۃ[2]۔	جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کا چرواہا (حاکم) بنایا اور وہ اس حال میں مرا کہ اس نے لوگوں کی بدخواہی کی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دے گا۔

اس کے بالمقابل جو حکام عدل و انصاف اور شفقت سے معاملات کو انجام دیتے ہیں، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کی جو عزت افزائی کرے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہایت بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان فرمایا ہے، آپؐ کا ارشاد ہے:

ان المقسطین عند اللہ	عدل و انصاف کرنے والے امراء و

---

[1]، [2] صحیح مسلم

Marfat.com

على منابر من نور عن يمين الرحمان عز وجل، وكلتا يديه يمين، الذين يعدلون في حكمهم واهليهم وما ولوا [1]

حکّام نور کے منبروں پر اللہ تعالیٰ کے داہنے بیٹھے ہوں گے اور اللہ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے اہل وعیال میں اور اپنے دائرۂ اقتدار میں انصاف کرتے رہے۔

ذمّہ داریوں کی اسی نزاکت اور گرانباری کے پیشِ نظر اسلام اُن لوگوں کو مناصبِ حکومت سے محترز رہنے اور ان سے دامن کش رہنے کی ترغیب دیتا ہے جو اپنے اندر ان کے بارِ گراں کو اٹھانے کی سکت نہ پاتے ہوں یا ان کو کما حقہٗ ادا کرنے سے قاصر رہیں۔ اسلام پکار پکار کر کہتا ہے کہ جو لوگ حکومت کے عہدوں کو اہلیت و استحقاق کے بغیر حاصل کرتے ہیں، اور پھر اُن سے کما حقہٗ عہدہ برآ نہیں ہوتے، وہ خائن ہیں اور قیامت کے روز یہی عہدے ان کے لیے رسوائی اور ندامت کا باعث ہوں گے[2]۔ دوسری طرف اسلام یہ ترغیب بھی دیتا ہے کہ جو باہمت ان ذمہ داریوں کی دشوار گھاٹیوں کو عبور کرنے کی قدرت رکھتے ہوں، اور اُن میں وہ شرائط پائی جاتی ہوں، جو ان ذمہ داریوں کی بجا آوری کے لیے مطلوب ہیں تو یہ اُنہی کو تفویض کی جائیں۔ ایسی صورت میں یہ مناصب تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن

---

[1] صحیح مسلم

[2] صحیح مسلم

Marfat.com

جاتے ہیں اور جو اسے ہمت کی آخری رمق تک ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ کے نزدیک اُن کی یہ کوشش بزرگ ترین نیکی شمار ہوتی ہے[1]

اَلاَمثل فالامثل کا اصول

کارکنوں کے تقرر و انتخاب میں اسلامی حکومت "الاَمثل فالاَمثل" (خوب سے خوب تر) کا اصول اختیار کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ موجود ہوں اُن میں سے بہتر اور اہل تر کو ترجیح دی جائے گی۔ جو اس اصول سے انحراف کرتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا معیار انتخاب اختیار کرتا ہے، اسلام اُسے اسلامی ریاست سے غدّاری تصوّر کرتا ہے۔ ذیل کے قول میں جو غالباً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے، اس امر کی صراحت ملتی ہے:

من قلّد رجلا علی عصابۃ وھو یجد فی تلك العصابۃ من ھو ارضیٰ منہ فقد خان اللہ ورسولہ وخان المومنین[2]	جس نے مسلمانوں کے کسی گروہ پر ایسے شخص کو سربراہ کار بنا دیا کہ اس گروہ میں اس سے زیادہ بہتر شخص موجود تھا، اُس نے اللہ سے، اس کے رسولؐ سے اور عام مسلمانوں سے غدّاری کی۔

---

[1] المبتدع فی الاسلام، ابن تیمیہ ص ۶ [2] ایضاً ص ۸

Marfat.com

اسلامی نظامِ حکومت کا ایک خاصہ یہ ہے کہ اس میں ریاست کے کارفرماؤں اور کارپردازوں کے سامنے خوب و ناخوب کے جو پیمانے رکھے جاتے ہیں، اور سعادت و شقاوت کے جو معیار قائم کیے جاتے ہیں، ان میں بنیادی تصوّر حاکمِ اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) کی رضا جوئی، فلاحِ آخرت اور حاکمِ اعلیٰ کی رعیّت کی خیر خواہی ہوتا ہے۔ یہ تصوّر بڑے سے بڑے عہدیدار سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے اہل کار تک کی کارگزاریوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور فی الجملہ رعیت کے حق میں اس کے بڑے مفید اور خوش کُن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ایک مکتوب میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو اسی بنیادی مقصد کی جانب توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان اسعد الرعاۃ عند اللہ من سعدت بہ رعیتہ، و ان اشقی الرعاۃ من شقیت بہ رعیتہ[1]۔

سب سے زیادہ خوش قسمت حاکم اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس سے اس کی رعیت سعادت پائے، اور سب سے زیادہ بدبخت حاکم وہ ہے جس سے اس کی رعیت شقاوت پائے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں: "یاد رکھ کہ حاکم کو ایک دن اللہ کے روبرو حاضر ہونا ہے۔ اگر حاکم کجروی اختیار کرے گا تو رعایا بھی کجروی

---

[1] کتاب الخراج لابی یوسف۔

Marfat.com

پر اُثر آئے گی اور اس کا وبال حاکم کے سر ہوگا۔" اسلامی نظامِ حکومت ہی نہیں، بلکہ ہر نظامِ حکومت کی کامیابی اور مضبوطی کا رکنانِ حکومت کی عدل گستری اور انصاف پژوہی پر موقوف ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ عادل حکومت کی مدد کرتا ہے۔ خواہ وہ کافر ہی ہو، اور ظالم حکومت کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے خواہ وہ مسلم ہی ہو۔"[1]

کارکنانِ حکومت کے آداب

حکومت کے اعلیٰ عمّال و حکّام سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن میں جن میں آداب و خصائل کا پایا جانا ضروری ہے، اُن کی تفصیل ہم علامہ قلقشندی کی زبان سے نقل کرتے ہیں۔ یہ تفصیل علّامہ قلقشندی نے کاتب (دبیر، سیکرٹری) کے آداب میں بیان کی ہے۔ لیکن آدابِ کاتب کے تحت علامہ موصوف نے جو کچھ ذکر کیا ہے درحقیقت اس کا نمونہ ہر عہدیدار اور ہر کارکن کو ہونا چاہیے:

"اپنے اختیارات اور ذمہ داریوں میں بے لوث اور بے غرض رہے۔ مذموم خواہشوں اور کمینہ طریقوں سے محترز رہے۔ نوائے دلگداز اور دلِ دردمند رکھتا ہو۔ حرص و ہوا کے پاس نہ پھٹکے۔ ناپاک اور ناجائز نفع اندوزیوں سے بالا رہے ـــ یہ روش اُسے اللہ کے

---

[1] الجنۃ فی الاسلام

Marfat.com

تقرب سے بھی بہرہ مند کرے گی اور حکومت کی نگاہ میں بھی محترم کرے گی ـــــ عام لوگوں کے ساتھ اُسے خوش معاملگی اور حسنِ سلوک سے پیش آنا چاہیے۔ جو ملازم ان پاک طریقوں، کی پابندی کرتے ہیں، اُن کے لیے ترقی اور کامیابی کے دروازے ہر وقت کھُلے رہتے ہیں۔ انہی طریقوں سے کم تعلیم والے بڑے بڑے مناصب تک پہنچے، اور ایسے لوگوں پر انھیں برتری حاصل ہو گئی جو قابلیت اور فہم و فراست میں اُن سے بدرجہا بلند تھے۔ اور اللہ تعالےٰ نے دنیوی طور پر بھی انھیں مال و دولت سے نوازا۔ قوم کے اندر انھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ ان خوبیوں نے بیگانوں کو قریب کر دیا اور ان سے عاری لوگوں کو یگانگی کے باوجود دُور پھینک دیا۔ ان کو اختیار کر کے جو کچھ نہ تھے وہ سب کچھ ہو گئے، اور ان کو چھوڑ کر جو لاکھ تھے وہ خاک بھی نہ رہے۔"[1]

احتساب کا نظام

اسلامی حکومت میں احتساب (یعنی ملازمین کی کارگزاریوں کا جائزہ اور ان کی کوتاہیوں اور زیادتیوں کا مؤاخذہ) ان فرائض میں

---

[1] صبح الاعشیٰ جلد اول ص ۱۷۔

Marfat.com

سے ہے جن سے غفلت اور تساہل کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ اوّلاً تو اسلام ہر مسلمان کے دل میں خواہ وہ حکومت کا کارکن ہو یا عام شہری، دائمی طور پر احتساب و باز پُرس کرنے والی ایک ایسی باجبروت اور علیم بذات الصدور ہستی کا تصوّر بٹھا دیتا ہے کہ اس تصوّر کے ہوتے کوئی شخص کسی وقت بھی خیانت و بدعہدی کا خیال بھی نہیں کر سکتا خواہ اُسے کتنے مفید اور محفوظ مواقع میسّر آتے ہوں۔ اور ثانیاً وہ ریاست کے ذمہ داران و عمائد کے فرائض میں یہ شامل کرتا ہے کہ وہ عمّال و حکّام کے تقرّر کے بعد ان کی کارگزاریوں کا برابر محاسبہ کرتے رہیں اور ان کی پرائیویٹ زندگی اور پبلک زندگی کا جائزہ لیتے رہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ملک کے دُور دراز حصّوں میں رہنے والے عمّال اور شہریوں کے بارے میں بھی ان کو اتنی ہی وسیع معلومات ہوتی تھیں جتنی اُس شخص کے بارے میں ہوتی تھیں جس نے اُن کے ساتھ ایک بستر پر اور ایک تکیے پر رات گزاری ہو۔ ملک کا کوئی حصہ اور کوئی گوشہ اور ریاست کا کوئی عامل اور فوج کا کوئی سپہ سالار ایسا نہ تھا جس پر اُن کی کڑی نگاہ نہ ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ملک کے مشرقی کنارے سے لے کر مغربی کنارے تک کے لوگوں کی باتیں صبح و شام اُن تک پہنچتی رہتی تھیں[1]

---

[1] کتاب الخراج المنسوب للیحیٰ ظ ص ۱۶۸۔

Marfat.com

موجودہ حکومتیں ملازمینِ حکومت کی نجی زندگی کو اپنے دائرۂ احتساب سے خارج سمجھتی ہیں، لیکن اسلامی ریاست میں بڑے سے بڑے عہدیدار بھی اپنے خالص ذاتی تصرّفات میں، جو حکومت کی نگاہ میں قابلِ اعتراض ہوں، حکومت کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ حذیفہ بن الیمان نے ایک غیر عرب عورت سے شادی کر لی۔ حضرت عمرؓ کے علم میں جب یہ بات آئی تو آپؓ نے حذیفہ کو حکم دیا کہ اس عورت کو طلاق دے دو۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ: "عجمی عورتوں میں دلکشی پائی جاتی ہے۔ اگر تم لوگ ان کی طرف لپک گئے تو یہ تمہیں عربی عورتوں پر جابر بنا دیں گی۔" [1]

حکومت کا جو کارکن اپنے ایمان و ضمیر کے تقاضوں کو پامال کرتا ہے، اور اپنے اوپر عائد شدہ ذمہ داریوں سے اپنے نفس کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے، اس پر صرف "نااہلی" کا الزام لگا کر سبکدوش نہیں کر دیا جاتا، بلکہ اُسے تمام کوتاہیوں کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اور اپنی غلط کاریوں کا ذرہ ذرہ حساب دینا ہوگا۔ اور اس کے بعد اُسے ایسی قرار واقعی سزا دی جائے گی جو اُس کے ہم پیشہ افراد کی آنکھوں کو کھول دینے کے لیے کافی ہو۔ سلطنتِ عباسیہ کے چیف جسٹس امام ابو یوسف رحمہ اللہ خلیفہ ہارون الرشید کو اس تاریخی

---

[1] الطبری ج ۴ ص ۴۷۔

Marfat.com

نوشتے میں جو کتاب الخراج کا سرنامہ ہے ہدایت کرتے ہیں :

"بہتر یہ ہے کہ آپ نیکوکار، پاکیزہ دامن اور قابلِ اعتماد افراد کی ایک جماعت ملک میں پھیلائیں۔ جو شہروں اور قریوں میں جاکر عُمّالِ ریاست اور ان کی کارگزاریوں کی تفتیش کرے۔ پھر جب آپ کو کسی والی یا حاکم کے بارے میں یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ ظلم و تعدّی اور دشت درازیاں کرتا ہے، رعایا کی دیکھ بھال کے بارے میں آپ کے ساتھ بدعہدی کرتا ہے، سرکاری اموال کا غبن کرتا ہے یا حرام خوری پر اُتر آیا ہے یا اُس کے چال چلن میں خرابی پیدا ہو گئی ہے، تو اس کے بعد آپ کے لیے اُسے بطور حاکم استعمال کرنا، رعیت کے کسی کام کا ذمّہ دار بنانا یا اُسے امورِ مملکت میں شریک کرنا حرام ہے۔ بلکہ ایسے بدطینت شخص کو آپ کیفرِ کردار تک پہنچائیں اور اسے ایسی سخت سزا دیں کہ دوسرے جو ابھی تک ان خرابیوں سے ملوّث نہیں ہوئے ہیں، اُسے دیکھ کر عبرت پذیر ہوں، البتہ مظلوم اور بے گناہ کی آہوں سے آپ بچتے رہیں۔ ان کی دعائیں بارگاہِ ایزدی میں مستجاب و مقبول ہیں"[1]

---

[1] الخراج، ابو یوسف ص ۷۳۔

Marfat.com

یہ بھی ضروری ہے کہ ملازمین اور کارندوں کے متعلق حکومت کے پاس جو رپورٹیں آئیں وہ نہایت صحیح، حقیقت کا آئینہ اور عادلانہ ہوں۔ قاضی ابو یوسف اس سلسلے میں بھی ہارون الرشید کو تاکید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"ہو سکتا ہے کہ خبر رساں رعیت کے خلاف عمّال سے ساز باز کر لیں۔ اور عمّال کی بدمعاملگیوں پر پردہ پوشی کریں۔ یا اس کے برعکس عمّال اور حکّام سے بگڑ جائیں اور ان پر خلافِ واقعہ الزامات لگا دیں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ آپ ہر شہر اور ہر علاقے میں سے عادل اور ثقہ لوگوں کو ڈھونڈیں اور خبر رسانی اور اطّلاعات کا کام ان کے سپرد کریں۔ اور آپ انہیں پیشگی متنبہ کر دیں کہ وہ رعیّت کی کسی بات کو یا حکّام کے کسی فعل کو آپ سے چھپا کر نہ رکھیں اور جو خبریں آپ تک پہنچائیں اُن میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی نہ کریں۔ اس کے بعد جو آپ کی ہدایات پر عمل نہ کریں اُنھیں کیے کا مزہ چکھائیں۔ جب تک علاقوں کے امدادِ اطلاعات بہم پہنچانے والے اور خبر رسانی کرنے والے معتمد اور صادق القول لوگ نہ ہوں، کسی قاضی یا کسی حاکم کے بارے میں موصول ہونے والی اطّلاع پر صاد کرنا

Marfat.com

درست نہیں ہے۔"[1]

آزادیٔ رائے

اسلام کارکنانِ حکومت پر ہر طرح کی پابندیاں عائد کرنے کے باوجود انھیں یہ اجازت بھی دیتا ہے کہ وہ جس بات کو بہتر سمجھیں اُسے اختیار کریں۔ اُن کی اپنی رائے کو اس حد تک سلب نہیں کرتا کہ وہ حکومت کی مشینری کا محض ایک بے جان پرزہ بن کر رہ جائیں۔ موجودہ حکومتیں اپنے ملازمین اور کارکنوں کے اندر جو غلامانہ ذہنیت اور بندۂ حکم بن جانے کا مزاج پیدا کرتی ہیں اس کی بنا پر کوئی کارکن یہ اپنے وہم و خیال میں بھی نہیں لا سکتا کہ وہ اگر افسرِ اعلیٰ کے کسی حکم کو خلافِ مصلحت اور غیر مناسب سمجھے، تو اُس کی تعمیل سے رُک جائے۔ لیکن اسلامی دورِ حکومت میں ہمیں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اوپر سے ایک حکم نافذ ہوتا ہے جسے کارکن بہتر اور مقصدِ اعلیٰ کے منافی تصوّر کرتا ہے تو اس پر عمل درآمد سے ہاتھ روک لیتا ہے۔ زیاد نے ایک بار حکم بن عمرو غفاری کو لکھا کہ امیر المؤمنین معاویہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان کے لیے سونا اور چاندی جمع کروں، لہٰذا لوگوں کے اندر تم سونا اور چاندی تقسیم نہ کرو، اس کے بجائے جو چاہو تقسیم کرو۔ حکم بن عمرو نے جواب دیا: امیر المؤمنین کے حکم سے پہلے میرے پاس اللہ کا حکم موجود ہے۔ بخدا

---

[1] الخراج، ابو یوسف ص ۱۱۴، ۱۱۵۔

Marfat.com

اگر کسی بندے پر زمین و آسمان کے دروازے بند ہو جائیں لیکن وہ اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔" یہ کہہ کر انھوں نے لوگوں کو بلایا اور تمام مال سونے چاندی سمیت تقسیم کر دیا۔

اطاعت کے حدود

شہریوں کے لیے امراؤ حکّام کی اطاعت کے معاملے میں اسلام نے جو شرائط اور حدود متعیّن کی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی اطاعت صرف امرِ معروف میں ہو گی، اور اگر وہ منکرات کا حکم دیں یا خلافِ شریعت باتوں پر لوگوں کو مجبور کریں، تو ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اُن کی اِن باتوں پر نکیر کریں، ان سے کھلّم کھلا بیزاری کا اظہار کریں، اور صرف امرِ حق کی حمایت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "ستکون امراء فتعرفون وتنکرون فمن کرہ برئ ومن انکر سلم ولکن من رضی و تابع"[1] (عنقریب تمہارے اندر سے ایسے امراء ظاہر ہوں گے جن میں تم معروف اور منکر دونوں طرح کی باتیں دیکھو گے۔ سو جس نے منکر کو منکر سمجھا وہ تو بری ہوا۔ اور جس نے اُس کی مخالفت کی وہ سلامت رہا۔ لیکن جو اس پر راضی ہو گیا اور پیروی کرنے لگا (وہ عذاب کا مستحق ہے)۔ ایک دوسری روایت

---

[1] مسلم۔

Marfat.com

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالم حکام کا ساتھ دینے والے اور ان سے تعاون کرنے والے سے صاف صاف برلوت کا اظہار فرمایا ہے۔ من صدقھم بکذبھم واعانھم علی ظلمھم فلیس منی ولست منہ و لا یرد علیّ الحوض (جس نے ان کے جھوٹ کی تصدیق کی اور ظلم پر اُن کی مدد کی۔ اُس کا مجھ سے اور میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ وہ حوضِ کوثر پر میرے پاس آسکے گا۔)

منصب کا غلط استعمال

حکومت کے ملازمین کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے منصب کو لوگوں پر دھاک بٹھانے اور اپنے رعب و دبدبے کی نمایش کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ یا عہدہ و اقتدار کے بل بوتے پر لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا شروع کردیں۔ اسلامی حکومت میں منصب فخر و غرور کی چیز نہیں، بلکہ خدمت گزاری کا وسیلہ ہے۔ اس کی ذمہ داریوں کے بار سے گردن دَب جانی چاہیے نہ کہ الٹی اکڑ جائے۔ اور رعیت کی خدمت کی بجائے اس کے لیے عذاب کا سبب بن جائے۔ حضرت علیؓ اپنے ایک عامل کو لکھتے ہیں: "تو لوگوں کے ساتھ عجز و انکسار سے پیش آ، اُن سے نرمی کا رویّہ اختیار کر، اور اپنے سلام و کلام میں اور مشوروں اور گفتگوؤں میں اُن کے برابر رہ۔ بڑے اور با اثر لوگ تجھ سے ناانصافی کا لالچ نہ رکھیں اور کمزور تیرے عدل سے ناامید نہ ہوں۔" [1]

---

[1] نہج البلاغہ، شریف رضی، ج ۲ ص ۵۴۔

Marfat.com

اسلامی حکومت اپنے شہریوں کے ساتھ جس حُسنِ التفات، خبرگیری اور دیکھ بھال کے احساسات رکھتی ہے، اُن کی بنا پر وہ سربراہ کاروں اور نظم ونسق کے متولیوں پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ خود جاجا کر لوگوں کی ضروریات دریافت کریں اور انھیں بروقت پورا کریں۔ اس فرض کی بجاآوری میں کسی شخص کا کم مرتبہ اور عامی ہونا آڑے نہ آئے۔ بلکہ اُن کی نگاہ میں غریب وامیر دونوں کی اہمیت یکساں ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ابلغونی حاجة من لا یستطیع ابلاغها فانه من ابلغ سلطانه حاجة من لا یستطیع ابلاغها ثبت اللّٰه قدمیه یوم القیامة[1]	جو لوگ اپنی حاجت مجھ تک نہیں پہنچا سکتے، تم لوگ خود ان کی حاجت مجھ تک پہنچاؤ۔ جو حکومت کو لوگوں کی حاجت سے آگاہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز (جب لوگوں کے قدم ڈگمگا رہے ہوں گے) اُسے ثابت، قدمی بخشے گا۔

اسی احساس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا: اگر میں زندہ رہا تو تمام ملک کا دورہ کروں گا، اور رعایا کے حالات معلوم کروں گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ لوگوں کی بعض ضروریات ایسی ہیں جو مجھ تک پہنچ نہیں پاتیں۔ لوگ خود مجھ تک آ

---

[1] الترتیب الاداریہ، الکتانی۔

Marfat.com

نہیں سکتے اور عُمّال اُن کی ضروریات کو میرے علم میں نہیں لاتے۔[1]

وظائف اور تنخواہیں

تنخواہوں اور وظیفوں کے معاملے میں اسلامی حکومت ہر کارکن کے ساتھ اس کی ضروریات کے مطابق معاملہ کرتی ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب فَے کا مال آتا تو آپؐ اُسی وقت تقسیم فرما دیتے۔ اہل و عیال والے کو دو حصّے اور مجرّد کو ایک حصّہ دیتے۔[2] تنخواہ میں اضافے کا موجب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدمت گزار اپنے فرائض میں قابلیت اور محنت و مہارت کا ثبوت دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عمل ماثور ہے کہ آپؐ نے ایک کارکن کے بارے میں، جس نے بعض مواقع پر اپنے کام کو بڑی عمدگی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیا تھا، بعد میں آنے والے امراء کو اُس سے حسن سلوک کی وصیّت کی۔ بلکہ آپؐ نے اسے ایک دستاویز عنایت فرمائی تھی۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ وہ صاحب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے تک زندہ رہے اور اس پورے عرصہ میں خلفاء سے اپنا وظیفہ وصول کرتے رہے۔[3]

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی حدید۔

[2] الادارۃ الاسلامیہ، کرد علی ص ۱۷۸۔

[3] التراتیب الاداریہ، کتانی۔

Marfat.com

معاشی ضروریات ایسی ہیں جن سے بہرحال اسلامی حکومت اپنے کارکنوں اور کارپردازوں کو بالکل یکسو کر دینے کا اصول اختیار کرتی ہے۔ تاکہ وہ سرکاری خدمات کو سکونِ خاطر، دل جمعی اور بے لوث طریقے سے انجام دیتے رہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ایک عامل کو حکم دیا تھا کہ سرکاری کارکنوں کو پورے معاوضے دیے جائیں :

فان ذالك قوة لهم على استصلاح انفسهم وغنى لهم عن تناول ما تحت ايديهم وحجة عليهم ان خالفوا امرك اوثلموا امانتك ۔[1]

کیونکہ یہ چیز کارکنوں کو اپنے حالات درست رکھنے میں مدد دے گی، اور انہیں زیرِ تصرف اموال پر دست درازی کرنے سے بے نیاز کر دے گی۔ اور اگر اس کے بعد وہ تیرے حکم کی خلاف ورزی کریں گے یا تیری امانت میں خیانت کریں گے تو تیری طرف سے اُن پر حجت قائم ہو جائے گی۔

حضرت عمر رضؓ بن عبدالعزیزؒ پر ایک بار یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ اپنے عمّال کو سَو سَو دو دو سو دینار بلکہ اس سے بھی زیادہ ماہانہ وظائف دیتے ہیں؟ خلیفۂ راشد نے جواب دیا: "اگر یہ لوگ اللہ کی کتاب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر عامل رہیں تو میں یہ معاوضے

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ ص ۶۰۔

Marfat.com

بھی ان کے لیے معمولی سمجھتا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ غمِ روزگار سے ان کو بالکل فارغ البال کر دوں[1]۔"

کارکنوں کے معاوضے مسلمانوں کے بیت المال سے جاری کیے جائیں گے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں ہی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہارون رشید نے ایک بار قاضی ابو یوسفؒ سے دریافت کیا تھا کہ "کیا قاضی کو میراث کے مال میں سے وظیفہ ملے گا؟" قاضی ابو یوسف نے جواب دیا: "نہیں، اُسے بھی مسلمانوں کے بیت المال سے وظیفہ دیا جائے گا۔"

صلہ اور پنشن

اسلامی حکومت میں خدمت گذاروں کو عمدہ کارکردگیوں کے صلے دینے اور فراغت کے بعد انھیں پنشن دینے کی مثالیں بھی تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ صلہ دینے کے بارے میں خود حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اس کی متعدد نظیریں احادیث و آثار کے ذخیرے میں موجود ہیں۔ آپؐ نے ہمدان کے ایک شخص قیس بن مالک الارحبی کو اس کی قوم پر، جس میں عرب بھی تھے اور موالی بھی، عامل مقرر کیا، تو آپؐ نے اس کا وظیفہ جاری کیا، اور اس کے علاوہ اسے مستقل طور پر دو سو صاع سالانہ نسار کی مکی کے اور دو سو صاع سالانہ

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ ص ۱۵۴۔

Marfat.com

خیوان کے انجیر بطورِ صلہ عطا کیے۔ آپؒ کا یہ عطیہ نہ صرف حینِ حیات اسے ملتا رہا بلکہ مرنے کے بعد اُس کے ورثاء بھی اُسے ہمیشہ وصول کرتے رہے [1]

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے یہ فرمان جاری کیا تھا کہ ایسے یتیم اور لاوارث بچّے اُن کے علم میں لائے جائیں جن کے باپ حکومت کے تنخواہ دار تھے۔ جب آپ کو ایسے افراد کی فہرست پہنچی تو آپ نے ان میں سے پانچ پانچ کو ایک خدمت گار دیا، اور اُن میں جو غیر شادی شدہ لڑکیاں تھیں اُن کے لیے باقاعدہ وظائف جاری کیے۔

حضرت عمرؒ نومولود بچّوں کا وظیفہ اس وقت جاری کرتے تھے جب وہ دودھ چھوڑتے تھے۔ لوگوں نے قبل از وقت بچوں کا دودھ چھڑانا شروع کر دیا۔ جب اُنھیں خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنے منادی سے اعلان کروا دیا کہ لوگ بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کریں۔ اب ہر بچّے کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا ہے [2]

جو ملازمینِ حکومت معذور یا از کار رفتہ ہو گئے ہوں حکومت کی جانب سے ان کی نگرانی اور امداد و اعانت کا انتظام کیا جائے گا۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے بلادِ شام کے عمّال کو ایک فرمان بھیجا

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ ص ۱۵۔

[2] ایضاً ص ۱۰۵۔

Marfat.com

تھا جس میں ایسے ملازمینِ حکومت کے متعلق معلومات طلب فرمائی تھیں، جو مفقود البصارت ہوں یا چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ہوں، یا فالج زدہ ہوں، یا انھیں ایسا دائمی مرض لاحق ہو گیا ہو، جو ادائے نماز میں حارج ہوتا ہو۔ اس کے بعد انھوں نے من جانبِ حکومت ہر نابینا کے لیے ایک محافظ اور ہر دو دائم المرض شخصوں کے لیے ایک خادم کا انتظام کرنے کا حکم دیا[1]

ذاتی کاروبار کی ممانعت،

اسلامی حکومت کسی ملازم کو دورانِ ملازمت ذاتی کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مذکور ہے کہ ان کے پاس بہت سا مال و متاع جمع ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس گھوڑوں کی کئی نسلیں ہو گئیں، اور ان کی منتشر زمینیں یکجا ہو گئیں، اور ان کی تجارت خوب چمکی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: حضرت! اس مال میں سے آپ اپنا رأس المال اور اپنی تنخواہ رکھ لیں اور باقی پورے کا پورا بیت المال کے حوالے کریں[2]"

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ لکردعلی ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

[2] ایضاً ص ۳۹۔

Marfat.com

سرکاری اشیاء کا ذاتی تصرّف

ملازمین سرکاری اشیاء کو ذاتی تصرّف میں لانے کے مجاز نہیں ہیں۔ قلم و کاغذ سے لے کر حکومت کی گاڑیوں اور ذرائع نقل و حمل تک، کسی چیز سے اپنی ذات کے لیے استفادہ نہیں کر سکتے۔ سرکاری اشیاء دراصل قوم کی امانت ہوتی ہیں اور ان کو صرف قوم کے مفاد و مقاصد میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر محکمۂ ڈاک کا کوئی ملازم ڈاک کی گاڑیوں کو غیر سرکاری کام کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ کتاب الخراج میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے یہ واقعہ درج کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک غلام بلا اجازت ڈاک کے جانور پر ایک شخص کو سوار کر کے لے آیا، تو آپ نے اُسے بلایا اور کہا کہ "جب تک تو اس کا کرایہ بیت المال میں جمع نہیں کرے گا، یہاں سے نہیں ہِل سکتا۔"

"سُرخ فیتے" کا استیصال

عمرؒ بن عبدالعزیز نے عامل یمن کو لکھا:

"میں اگر تجھے حکم دُوں کہ تو مسلمانوں کی ظلم و زیادتی کی شکایات کا جواب دے تو کیا تو میری طرف مراجعت کی ضرورت محسوس کرے گا۔ نہ بُعد مسافت کا خیال کریگا اور نہ موت کے حادثات کا۔ حتیٰ کہ اگر میں لکھوں کہ فلاں

Marfat.com

مسلمان کی ظلم سے لی ہوئی بکری واپس کر تو کیا تو مجھے لکھ بھیجے گا کہ سفید دوں یا کالی دوں ؟ ـــــ یاد رکھ شکایات کا فیصلہ وہیں کر لے، میری طرف بار بار رجوع کرنے کی ضرورت نہیں"۔

اسی نوعیت کا ایک ہدایت نامہ کوفہ کے عامل کو لکھا :

"میرا خیال ہے کہ اگر میں تجھے لکھوں کہ فلاں آدمی کو ایک بکری دے تو تُو مجھے لکھے گا کہ نر دوں یا مادّہ۔ اگر میں لکھ بھیجوں کہ کوئی ایک دے دے، تو تُو پھر یہ پوچھنے لگے گا کہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ اگر میں جواب دوں : "کوئی ایک ہو"، تو پھر ایک خط دوڑائے گا کہ بھیڑ ہو یا بکری ؟ جب میں نے ایک بار لکھ دیا کہ ایسا کر، تو اپنی صوابدید پر اس کی تعمیل کر۔ میری طرف بار بار رجوع کرنے کی حاجت نہیں"۔

ارکانِ حکومت اور عام شہریوں میں قانونی مساوات

اسلامی ریاست ہر شہری کو بڑے سے بڑے عہدیدار کے خلاف بھی اس کی ظلم و زیادتی پر قانونی چارہ جوئی کا غیر مشروط حق دیتی ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی عدالتی و قانونی تفریق روا نہیں رکھتی۔ عدالت و قضا کے جو آداب و ضوابط ایک شہری پر عائد ہوتے ہیں، ریاست کا حاکمِ اعلیٰ بھی ان کا اُسی طرح سے پابند ہے اور اس معاملے میں کوئی سیاسی مصلحت اور حکمت آڑے نہیں آسکتی۔ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ تفصیل سے. بیان کیا ہے کہ ایک بار انھوں نے حج کے موقع پر تمام عُمّال کو جمع کیا۔ مجمع کے اندر عام لوگ موجود تھے۔ آپ نے کھڑے ہو کر عام لوگوں سے دریافت کیا کہ تم میں سے کسی کو کسی عامل کے خلاف کوئی شکایت ہو تو وہ اُٹھ کر بیان کرے۔ راوی کا بیان ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے صرف ایک شخص اُٹھا اور اس نے شکایت کی کہ امیر المومنین! آپ کے عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُسے اجازت دی کہ وہ عامل سے اپنا بدلہ لے لے۔ یہ سُن کر حضرت عمروؓ بن العاص بولے، کہ امیر المومنین! اگر آپ نے حکّام کے خلاف یہ دروازہ کھول دیا تو ان کے لیے یہ چیز بہت ناگوار ہو گی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کی کوئی توجیہ قبول نہ کی اور فرمایا کہ میں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات کو قصاص کے لیے پیش فرماتے دیکھا ہے تو ان لوگوں سے کیونکر قصاص نہ دلواؤں۔ بالآخر مدّعی نے خود ہی دو سو دینار لے کر قصاص کو معاف کر دیا۔ ورنہ حضرت عمرؓ اُس کو قصاص لینے کا حق دے چکے تھے۔

خلافتِ راشدہ کے دَور میں اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ خود خلفاء عام شہریوں کے برابر عدالت کے کٹہرے میں حاضر ہوتے دیکھے گئے اور اُن پر عام شہریوں کی جانب سے دائر کردہ مقدمات قائم ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بالعموم کہا کرتے تھے کہ "جس پر

Marfat.com

کسی عامل نے ظلم کیا ہو وہ میرے پاس آئے تاکہ میں اُس کا بدلہ اُسے دلواؤں۔"

سفارش اور اقربا نوازی سے اجتناب

ملکی نظم و نسق کو تباہ و برباد کرنے میں سفارش اور اقربا نوازی سے بڑھ کر شاید ہی کوئی بیماری ہو۔ اسلام کارکنانِ حکومت کے اندر جن اعلیٰ صفات کو دیکھنے کا خواہش مند ہے، ان میں سے مقدّم صفات یہ ہیں کہ حکومت کے نظم و نسق کو سفارش کی دراندازی سے پاک رکھا جائے۔ اور سرکاری اموال سے خویش و اقارب کے ہاتھ رنگنے سے احتراز کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نے ایک بار حضرت عمرؓ سے سفارش کی کہ اپنے عراق کے عامل کے نام ایک سفارشی چٹھی لکھ دیں کہ فلاں اصحاب کی خاص طور پر مدارات کرے۔ حضرت عمرؓ نے اُسے جھڑکا اور کہا: "کیا تو لوگوں پر ظلم کا دروازہ کھولنا چاہتا ہے۔ عامل بھی مسلمانوں ہی کا ایک فرد ہے، اُسے بھی وہی کچھ میسّر ہے جو دوسروں کو میسّر ہے۔" حضرت علیؓ نے اشتر نخعی کو مصر کی ولایت پر مامور کرتے وقت نصیحت کی: "عمّال کی کارروائیوں پر کڑی نگاہ رکھنا۔ کسی عامل کو دوستی اور غرض مندی کی بنا پر مقرّر نہ کرنا، بلکہ امتحان اور آزمایش کے ذریعے سے اُس کا انتخاب کرنا۔" حضرت معاویہؓ کو اطلاع پہنچی کہ ان کا بھانجا عبدالرحمٰن بن ام الحکم، جو کوفہ پر عامل ہے، اپنی عملداری میں بدکرداری کر رہا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے اُس کو فوراً بیک بینی و دو گوش

Marfat.com

برطرف کر دیا۔ ہادی باللہ نے اپنے مختصر سے دورِ حکومت میں اپنی مال خیز ران کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ امورِ مملکت میں کوئی دخل نہ دے۔ اور اہلِ غرض کی مطلب برآریوں سے اسے معاف رکھے۔

رشوت ستانی سے احتراز

اسلام کا پاکیزہ اور خدا پرستانہ نظام اس چیز سے بہت بالا ہے کہ اس کے کارکن رشوت ستانی اور خیانت کی لعنت میں مبتلا ہوں۔ اور نہ صرف دنیا میں عبرتناک سزا کے مستحق ٹھہریں بلکہ عاقبت میں بھی ان کے لیے دوزخ کے سوا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

الراشیٰ والمرتشی کلاھما فی النار۔

رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم کا ایندھن ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رشوت لینے والے، رشوت دینے والے اور رشوت کی دلالی (الرائش) کرنے والے تینوں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لعنۃ اللہ علی الراشی والمرتشی فی الحکم۔

فیصلوں میں رشوت کا لین دین کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہے۔

رشوت ستانی کے ساتھ اسلام نے وہ "چور دروازے" بھی بند کر دیے ہیں جو اس ام الخبائث کے در آنے کے امکانات پیدا کرتے

Marfat.com

ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمّال اور حکّام کے لیے ہدایا کو بھی خیانت میں شمار کیا ہے (ہدایا العُمّال غلولٌ) ایک مشہور مقولہ ہے کہ "اِدھر دروازے سے ہدیہ داخل ہوا اور اُدھر کھڑکی سے امانت رخصت ہو گئی۔" صحاح کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو اللُتَبیہ نامی ایک شخص کو قبیلۂ ازد پر محصّل مقرر فرمایا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس آئے اور حساب دینے لگے تو کہا کہ "یہ بیت المال کا حصّہ ہے، اور یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔" یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر برافروختگی کے علامات طاری ہو گئے، اور آپؐ نے خطبہ دیا جس میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جو کام میرے سپرد فرمایا ہے، اس کے انتظام و انصرام کے لیے جب میں تم لوگوں کو کسی خدمت پر مقرر کرتا ہوں، تو بعض لوگ جب مدّت عمل پوری کر کے واپس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تمہارا (بیت المال) حصّہ ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ ملا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھے رہے کہ وہیں بیٹھے بیٹھے ان کے پاس ہدیے آجاتے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایسی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ آپ ایسے کارکنوں پر سخت گرفت کرتے رہے جو دورانِ خدمت خوشحال ہو جاتے تھے۔ آپ کی گرفت سے حضرت ابو ہریرہؓ، عمرو بن العاصؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ بھی نہیں بچ سکے۔

Marfat.com

دوسری طرف ہم اُس دور میں اسلامی حکومت کے ملازموں کے اندر بھی للّٰہیت اور اخلاص وخداترسی کی پاکیزہ روش کارفرما دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ریاست کی خدمت کو زینتِ دنیا اور عیش وتنعّم کی خاطر قبول نہیں کیا، بلکہ اسے عینِ عبادت سمجھا اور پوری بے لوثی اور شانِ استغناء کے ساتھ اُس سے عہدہ برآ ہوئے۔ اور جس پاک دامنی کے ساتھ وہ اس نازک مقام میں داخل ہوئے تھے اُسی پاک دامنی کے ساتھ اس سے نکلے۔ اور اللہ کی رضامندی اور رحمت ان کے شاملِ حال تھی۔

سیوطیؒ نے "حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرۃ" میں حضرت معاویہؓ کے مشہور سپہ سالار جنگ حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے ارمینیا کے ایک شہر پر چڑھائی کی۔ اسلامی فوجیں ہنوز راہ میں تھیں کہ اس شہر کے اسقف کا نمایندہ اور سربرآوردہ لوگ حبیب بن مسلمہ کے پاس آئے اور ہدایا وتحائف پیش کر کے صلح کی درخواست کی۔ حبیب بن مسلمہ نے صلح کی درخواست منظور کر لی اور اہلِ شہر کے نام نوشتہ لکھ دیا کہ "میں نے تمہارے تحائف قبول کر لیے اور انھیں تمہارے جزیہ میں محسوب کر لیا ہے۔"

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۸ء)

Marfat.com

Marfat.com

اسلام کا بلدیاتی نظام

پروفیسر لبیب السّعید ، قاھرہ ، مصر

اسلام بنیادی ضروریاتِ زندگی کا ضامن ہے

غذا ، لباس اور مکان انسان کی وہ بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں، جن پر انسانی زندگی کے قیام و بقا کا دارومدار ہے۔ جس طرح کسی انسانی معاشرے کے سعید ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد بنیادی ضروریات سے محروم نہ ہو، اسی طرح معاشرہ کے فاسد اور شقی ہونے کا پیمانہ یہ ہے کہ اس کے کچھ افراد اور اس کی عمارت کے کچھ اجزاء حوائجِ حیات سے تہی دست ہوں اور کوئی اُن کا ضامن یا پُرسانِ حال نہ ہو۔ اسلام معاشرتی انصاف کے جن اصولوں کا علمبردار ہے اُن میں سرِفہرست یہ اصول ہے کہ وہ انسان کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کی ضمانت دیتا ہے۔ اس فراہمی کے لیے وہ دو ذریعے اختیار کرتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنی برتر اخلاقی تعلیم اور پاکیزہ اجتماعی ماحول کی مدد سے عام شہریوں کے اندر یہ ذوق پروان چڑھاتا ہے کہ ان میں سے

Marfat.com

جو لوگ صاحبِ ثروت اور کشادہ دست ہوں وہ اپنے غریب اور نادار بھائیوں، حاجت مند رشتہ داروں اور بستی کے بے سہارا افراد کو حوائجِ زندگی سے محروم نہ رہنے دیں۔ اسلام کی ہدایت ہے کہ :
وفی اموالھم حق للسائل والمحروم (مالدار لوگوں کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے)۔ اور من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ (جو اپنے مسلمان بھائی کی حاجت برآری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حاجت برآری کرتا ہے)۔ اور دوسری طرف اسلام حکومت کے فرائض میں یہ بنیادی ذمہ داری شامل کرتا ہے کہ وہ ملک کے اغنیاء اور مال دار لوگوں سے زکوٰۃ و عشر وصول کر کے ملک کے حاجت مندوں اور مساکین و فقراء کی کفالت کا انتظام کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : خذ من اغنیاءھم و ترد الی فقراءھم (ریاست کے مالداروں سے لو اور فقراء اور ناداروں کو دو)۔ یہ ارشاد اسلامی حکومت کا شعار ہے جس کی تعمیل ازروئے دستور اس پر عاید ہوتی ہے۔ حاجتمند افراد کی کفالت کا دائرہ صرف روٹی اور کپڑا مہیا کر دینے تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کے لیے رہائشی مکانات کی فراہمی بھی اسی دائرے میں داخل ہے۔ ان مکانات کی نوعیت علامہ ابنِ حزم ظاہری رحمہ اللہ کے الفاظ میں یہ ہے :

تکنہم من المطر والصیف — یہ مکانات ایسے ہونے چاہئیں جو

Marfat.com

والشمس وعیون المارّۃ[1]۔ جو رہنے والوں کو بارش، گرمی اور دھوپ سے اور گزرنے والوں کی نگاہوں سے چھپائے رکھیں۔

مکانات کی فراہمی حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے۔

علاوہ ازیں عام شہریوں کو مکانات کی قلت سے بچانا اور اس بارے میں انہیں ہر ممکن سہولت بہم پہنچانا ایک ایسا تمدنی و معاشرتی فریضہ ہے جسے اسلامی حکومت محض ہنگامی حالات کے دباؤ سے سرانجام نہیں دیتی بلکہ اس کا ملکی قانون مستقل طور پر اسے اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ نے صدرِ حکومت کے دو فرائض بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ایک سیاسۃ الناس (ملک کا سیاسی انتظام) ہے۔ اور دوسرا عمارۃ الارض۔ عمارۃ الارض کی تشریح میں امام موصوف لکھتے ہیں کہ اس سے مراد ملک میں تمدن کے تقاضوں کی رعایت، زراعت کی توسیع، شاداب درختوں اور چمن زاروں کی آبیاری، شہروں کا قیام، آبادیوں اور مکانوں کی تعمیر و توفیر اور معاشی اصلاح و خوش حالی ہے[2]۔ اسی مقصد کے پیش نظر فقہائے اسلام نے از روئے شریعت یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ "کسی مالکِ مکان کو اپنا مکان منہدم

---

[1] المحلّٰی ج ۶ ص ۱۵۶۔

[2] الذریعہ الی مکارم الشریعۃ باب ۱۰ ص ۱۹۔

Marfat.com

کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر اس کے انہدام سے اہلِ محلہ کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہو (الّا یہ کہ وہ اُسے از سرِ نو بنانا چاہتا ہو)[1]

شریعتِ اسلامی میں طہارت و حفظانِ صحت کی اہمیت

عامۃ الناس کی سکونتی ضرورت کو پورا کرنے کے ساتھ شریعتِ اسلامی تعمیرِ مکانات اور آبادیوں کی نقشہ بندی میں حفظانِ صحت کے اصول کو بھی مدِّ نظر رکھتی ہے۔ یہ اصول طہارت و نظافت اور حفاظتِ جان و مال کے ان احکام و تعلیمات سے ماخوذ ہیں جن کی پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر ہدایت فرمائی ہے۔ خود پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو آغازِ نبوت میں اللہ تعالےٰ نے حکم دیا تھا کہ وثیابك فطهّر (اور اپنے کپڑے پاک کرلے)۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے: انّ اللہ یحبّ المتطهرین۔ (اللہ تعالیٰ پاک رہنے والوں سے محبّت کرتا ہے)۔ ارشادِ نبویؐ ہے: الطهور شطر الایمان (پاکیزگی نصف ایمان ہے)۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "ہمعات" میں معتدل اور متوازن معاشرے کی خصلتیں گنواتے ہوئے ایک خصلت "طہارت" بیان فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"مسلم معاشرے کی ایک خصلت طہارت ہے،

---

[1] فتاویٰ النقریۃ ج ۱ ص ۳۶۶۔

Marfat.com

اس کی حقیقت اور اس کی طرف میلان سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ یہاں یہ گمان نہ کر لینا چاہیے کہ طہارت سے مراد صرف وضو اور غسل ہے، بلکہ طہارت کا اصل مقصد وضو اور غسل کی روح اور اس کا نور ہے۔ جب آدمی نجاستوں میں آلودہ ہو، میل کچیل سے ملوّث ہو، بول و براز کا دباؤ ہو، تو لازماً آدمی انقباض اور حزن میں مبتلا ہو جائے گا، اور جب ماحول کو ستھرا رکھے گا، غسل کرے گا اور صاف لباس زیبِ تن کرے گا، تو اسے اپنے نفس میں انشراح اور سرور محسوس ہوگا۔ حاصل کلام یہ کہ طہارت ایک وجدانی کیفیت ہے جو نور سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ (اور اس وجدانی کیفیت میں جو باتیں خلل انداز ہوں ان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔)

تعمیرِ مکان میں اصولِ حفظانِ صحت کا لحاظ

طہارت اور پاکیزگی کا حکم صرف جسم اور لباس کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ ماحول اور **مکان** میں بھی اس کا پورا پورا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے مکانوں اور بستیوں کی تخطیط (پلاننگ) اور وضع و ساخت میں جن امور کا لحاظ ضروری ہے، ان کے متعلق علامہ ابن خلدون تصریح کرتے ہیں:

"شہروں اور آبادیوں کی تعمیر و ساخت کے بارے

Marfat.com

میں سب سے پہلے جس چیز کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ تازہ اور پاک ہوا ہے۔ تاکہ لوگ بیماریوں اور آفات سے محفوظ رہیں۔ اگر تازہ ہوا کا گزر اور گندی ہوا کا نکاس نہ ہو اور مکان کے اندر تعفن پیدا ہو جائے، یا آبادی گندے جوہڑوں، بدبودار چشموں اور سڑے ہوئے کھیتوں کے پاس ہو اور گندی ہوا مکانوں میں داخل ہوتی رہے، تو ان مکانوں میں رہنے والے لوگ یقیناً طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ جن شہروں اور بستیوں میں تازہ ہوا کے حصول کا اہتمام نہیں کیا جاتا وہ اکثر امراض و آلام کی زد میں رہتی ہیں[1]"

آگے چل کر علامہ ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ اگر کسی بستی کو رفاہِ عامہ کے ضمن میں پانی کا قرب اور مویشیوں کے لیے عمدہ چراگاہیں حاصل ہیں تو وہ بستی لازماً تکالیف و آفات سے نجات پائے گی اور آرام اور منافع سے بہرہ مند ہو گی[2]

اسلامی تاریخ میں حفظانِ صحت اور رفاہِ عامہ کا اہتمام

تاریخ کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سوسائٹی نے سکونت گاہوں

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۸۹۔

[2] ایضاً ص ۳۹۰۔

Marfat.com

اور آبادیوں کی تعمیر میں اسلامی روح کے تقاضے کے مطابق طہارت ونظافت اور حفظانِ صحت کی تدابیر پر بالالتزام عمل درآمد کیا ہے۔ بلکہ بعض جگہ طبعی حالات کی مساعدت سے مسلمانوں نے اس سلسلے میں حیرت انگیز اہتمام اور ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ حفظانِ صحت کی تدابیر میں صاف اور نظیف پانی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلم سوسائٹی نے اس کی اہمیت کو جس پیمانے سے ناپا ہے اس کا اندازہ ہم اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اموی دور میں دمشق میں ہر گھر کے اندر نہر بردی کا پانی پہنچتا تھا۔ مرحوم امیر علی نے مسلمانوں کے اس اہتمام وانصرام پر انگشت بدنداں ہو کر لکھا ہے:

"نہر بردی[1] اگرچہ شہر کو فراوانی سے پانی مہیا کرتی تھی، مگر اس کے باوجود اہلِ شہر نے عدیم المثال ذوق کا مظاہرہ کیا کہ ہر گھر کے اندر پانی کے لیے ٹینک بنا دیے جن سے نہایت صاف وشفاف پانی نکلتا تھا۔ بردی سے سات نہریں نکالیں جو شہر کے مختلف گوشوں میں بہتی تھیں اور بکثرت کاریزیں ان میں سے نکل کر گھروں کے اندر بنے

---

[1] شام کی مشہور نہر ہے، زبدانی سے نکلتی ہے اور دارالحکومت دمشق اور نواحی مقام غوطۂ دمشق کو سیراب کرتی ہوئی جھیل عُتیبہ میں جا گرتی ہے۔

Marfat.com

ہوئے ٹینکوں میں پانی پہنچاتی تھیں[1]۔"

ایرانی سیّاح ناصر خسرو (۱۰۰۳ - ۱۰۶۰) نے اپنے سفر نامہ میں مسجد اقصیٰ کی زیارت پر لکھا ہے کہ:

"مسجد میں جست کے بنے ہوئے نل ہیں جن میں سے پانی بہہ کر فرش مسجد کے نیچے چٹانوں میں ترشے ہوئے حوضوں میں جمع ہوتا ہے۔ ان حوضوں میں پانی کی گزرگاہیں بنی ہوئی ہیں جن میں سے پانی کاریزوں کے ذریعے سقایوں میں تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ کاریزیں سربستہ ہیں اس لیے کوڑا کرکٹ گرنے سے پانی گدلا یا متعفن نہیں ہونے پاتا۔"

مسلمانوں کے زیرِ حکومت دوسرے ملکوں میں بھی اس قسم کے رفاہِ عامہ کے کاموں پر غیر معمولی توجہ دی گئی ہے اور خوش ذوقی کا ثبوت دیا گیا ہے، جس سے عام شہریوں کو سہولت میسّر ہونے کے ساتھ حفظانِ صحت کا بھی مقصد حل ہو جاتا تھا۔ سیّاح ناصر خسرو نے میافارقین (ایران) کی خوش نما جامع مسجد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مسجد کی وضوگاہ کی جانب چالیس استنجا گاہ بنے

---

[1] مختصر تاریخ عرب و تمدن اسلامی۔

Marfat.com

ہوئے ہیں جن کے آگے اونچی اور نیچی بڑی بڑی پانی کی نالیاں بنی ہوئی ہیں۔ ایک اوپر کی جانب کھلی ہوئی ہے تاکہ اس کا پانی طہارت کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ اور دوسری زمین دوز ہے اور غلاظت کو بہانے کے لیے ہے۔"

یہی سیاح مسجد آمدؔ کی توصیف میں لکھتا ہے:

"اس کی وضو گاہ نہایت حسین و جمیل اور صنعت کاری کا بے مثال نمونہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی خوبصورت چیز دیکھنے میں نہیں آئی۔"

طرابلس الشام[1] کے ایک بازار کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتا ہے:

"بازار کے اندر پانی کی ایک بہت بڑی سبیل بنی ہوئی ہے، جس میں پانچ ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ ان سے اس قدر کثرت سے پانی نکلتا ہے کہ تمام لوگ بخوبی اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔"

عصام الدین ابن دُقماق نے مصر کے خاندانِ طولون کے ایک

---

[1] آج کل طرابلس الشام لبنان کا دوسرا بڑا شہر ہے، بندرگاہ ہے، عراق کی پٹرول پائپ لائن اسی شہر میں آ کر ختم ہوتی ہے۔

Marfat.com

وزیر کے متعلق لکھا ہے کہ "سنہ ۳۰۳ھ یا سنہ ۳۰۴ھ میں اُس کے پاس حرف محکمہ آب رسانی کی وزارت کا قلمدان تھا۔[1]"

حال ہی میں فُسطاط[2] کی کھدائیوں سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مصر کا یہ اولین اسلامی شہر بڑی فراوانی کے ساتھ صحت افزا وسائل سے بہرہ مند تھا۔ ان کھدائیوں کے نگران مشہور ماہرینِ آثار قدیمہ علی بک بہجت مرحوم اور موسیو البرٹ جبریل نے اپنے اکتشافی آرٹیکل میں لکھا ہے:

"فسطاط میں صحت افزا اشیاء اس قدر عمومیت اور کثرت سے برآمد ہوئی ہیں کہ ان سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس شہر میں مسلمانوں نے پبلک ہیلتھ پر غیر معمولی توجہ دی ہے۔ ہمیں کھدائیوں میں ایسا کوئی گھر نہیں ملا ہے جس میں غسل خانہ اور بیت الخلا کی مسقّف نالی نہ ہو۔ یہ نالی گھر کا تمام پانی جمع کر کے باہر حوضوں تک پہنچاتی ہے[3]۔"

---

[1] الانتصار لواسطۃ عقد الامصار ج ۴ ص ۵۶

[2] یہ مصر میں مسلمانوں کے سب سے پہلے آباد کردہ شہر کا نام ہے۔ اسے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص نے آباد کیا تھا۔ یہ قاہرہ اور قدیم مصر کے درمیان واقع ہے، آج کل اس کا نام البابہ ہے۔

[3] حفریات الفسطاط ص ۱۰۶۔

Marfat.com

ان ماہرین نے اپنے آرٹیکل میں پوری تفصیل کے ساتھ اس شہر کے لیٹرین سسٹم، اور غسل خانوں کے نظام کو بیان کیا ہے۔ شہر میں آب رسانی کے نظم ونسق پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے محفوظ کنوؤں، چھ بچوں، پائپ لائنوں، فوّاروں اور ہاتھ دھونے کے حوضوں کا ذکر کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حکمرانی کے ابتدائی دور میں ہی فنِ تعمیر اور انجینئرنگ نے ممتاز ترقی کر لی تھی۔ اس ترقی کا راز دراصل مسلمانوں کا ذوقِ نفاست وطہارت تھا جو اسلام کے پاکیزہ نظام نے ان کی فطرت میں ودیعت کر رکھا تھا۔

مذکورۂ بالا ماہرینِ آثار نے اپنے مضمون میں بیروت کی فرانسیسی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ایک مخطوطے سے فسطاط کے محکمۂ احتساب کا ایک انتباہی فرمان بھی نقل کیا ہے۔ یہ فرمان محکمہ کی جانب سے شہری عوام کے نام ہے۔ فرمان کا ملخص یہ ہے:

"ازروئے قانون کسی کو جائز نہیں ہے کہ وہ راستوں اور گذرگاہوں پر ایسی چیزیں بنائے جو راہگیروں کے لیے موجبِ اذیت ہوں۔ یا انہیں نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ جیسے گرمیوں کے زمانے میں سڑکوں کی جانب گندی نالیوں کا رُخ کر دینا۔ اسی طرح جو لوگ شہر کے باہر کوڑا کرکٹ اور کھاد کے ڈھیر لگانا چاہیں ان کو لازم ہے کہ وہ باہر گڑھے کھودلیں اور ان میں کوڑا کرکٹ ڈال کر اوپر سے

Marfat.com

ان کو بند کر دیں، تاکہ اُن کی بدبو سے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ اور بیماری کے جراثیم انڈے بچے نہ دینے لگیں۔ نیز ایسے گڑھے پانی کے گھاٹوں کے آس پاس نہ کھودے جائیں۔ اور نہ آب کشی کے نالایوں میں کوڑا کرکٹ اور کھاد ڈالی جائے[1]"

مسلمانوں کے ذوقِ نفاست کے بارے میں یہ مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ ورنہ تاریخ و آثار اور فقہاء کی کتابوں سے لاتعداد ایسی مثالیں دستیاب ہوتی ہیں جس سے اسلامی سوسائٹی کے اندر حفظانِ صحت کے اصول و قواعد کی مقبولیت اور پابندی کے حیرت انگیز ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔

تعمیرِ مکان میں ہمسائے کے حقوق کی رعایت

مکان کی تعمیر اور نقشہ بندی کے سلسلے میں شریعت نے لوگوں کو مطلق العنان نہیں چھوڑا ہے، بلکہ چند اخلاقی حدود کا پابند کیا ہے۔ پیچھے ہم علامہ ابن حزم سے یہ الفاظ نقل کر کے آئے ہیں کہ مکان ایسا کھلا اور بے پردہ نہیں ہونا چاہیے کہ گزرنے والوں کی نگاہیں اُس کے اندر بلا روک پڑتی رہیں۔ اسی طرح شریعت نے یہ پابندی بھی عائد کی ہے کہ مکان سے ہمسائے کو ضرر نہیں پہنچنا چاہیے۔ مکان کی اونچائی میں

---

[1] حضریات القسطاط ص ۱۰۶، ۱۱۱۔

Marfat.com

ہمسائے کی رضامندی کا شامل ہونا ضروری ہے۔ ایک بار صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ایک پڑوسی کے دوسرے پڑوسی پر کیا حقوق ہیں؟ آپؐ نے ہمسائے کے جو حقوق بیان فرمائے اُن میں سے ایک حق یہ بھی فرمایا: "ہمسائے کا یہ بھی حق ہے کہ تم اپنی عمارت کو ہمسائے کی خوشنودی اور منشاء کے بغیر اس کے مکان سے اونچا نہ لے جاؤ۔" شارع علیہ السلام کے اس ارشاد کا مدّعا یہ ہے کہ مکانات کی تعمیر میں اس امر کو بنیادی طور پہ ملحوظ رکھا جائے کہ اس کا نقشہ ایسا ہو کہ اس سے اردگرد کے گھروں کی پردہ دری ہونے کی نوبت نہ آنے پائے۔ مکان کے دروازوں اور دریچوں کے رُخ متعین کرنے میں بھی یہ اہتمام کرنا ضروری ہے۔

انسانی صحت اور راحت کے بارے میں فقہ کا نظریہ

موجودہ زمانے میں محکمۂ صحت و صفائی کی اصطلاح میں جن مکانوں کو "مُضرِ صحت" اور "مُخِلّ راحت" قرار دیا جاتا ہے، ان کے بارے میں اسلامی حکومت کا نظام بھی وہی سلوک اختیار کرتا ہے جو موجودہ بلدیاتی اداروں کے قواعد و ضوابط کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ موجودہ قواعد و ضوابط صرف تخریب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اسلام کے قواعد و ضوابط تخریب اور تعمیر دونوں پہلوؤں پر متوازی عمل درآمد کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ یعنی شریعتِ اسلامی کی رُو سے شہری نظم و نسق کا کوئی ادارہ اگر کسی عمارت کو مُضرِ صحت اور آرام میں خلل انداز

Marfat.com

.....قرار دیتا ہے تو اس کا فیصلہ صرف اسے گرا دینے یا
اُس میں کسی ترمیم و تبدیلی کے احکام جاری کر دینے تک نہیں ہوتا
بلکہ وہ ادارہ عمارت کے مالک کو متبادل جگہ دینے کا ذمہ دار ہو گا اور
اُسے نئے مکان میں آباد ہونے کے لیے مناسب امداد دینے کا
ضامن ہو گا۔ اب ہم آپ کے سامنے فتاویٰ القریہ[1] میں سے اس
طرح کے مکانوں کے بارے میں چند مثالیں نقل کرتے ہیں، جن
سے فقہ اسلامی کا رجحان معلوم ہو جاتا ہے۔ ان مثالوں میں اگرچہ
فقہاء کے مابین کچھ نہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے تاہم مجموعی طور پر ان سے
فقہ اسلامی کا عمرانی نقطۂ نگاہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

باغوں اور پارکوں میں (جنہیں قدیم اصطلاح میں حیطان کہا جاتا تھا
اور اس وقت ان کی حیثیت مراکزِ صحت و تفریح کی ہوتی تھی)۔ تنور
لگانا، بیکری کھولنا، آٹا پیسنے کی چکّی نصب کرنا، لوہا یا اور کوئی دھات
کوٹنے کے اڈے قائم کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص ریشم کے کیڑے
پالتا ہے اور ان سے ریشم حاصل کرنے کے لیے گھر میں مشین نصب
کرتا ہے۔ لیکن اردگرد کے ہمسائے دھوئیں سے اور کیڑوں کی بُو سے
تنگ ہیں تو اسے اپنے گھر میں اس کام سے روک دیا جائے گا۔
اگر کسی شخص نے اپنے گھر میں حمّام جاری کر رکھا ہے اور اس کا دھواں
ہمسایوں کے لیے وجہِ مصیبت بن گیا ہے تو ہمسایوں کو حق حاصل

---

[1] القریہ (ترکی) کے شیخ الاسلام محمد بن حسین کے فتاویٰ کا مجموعہ۔

Marfat.com

ہے کہ وہ اسے گھر میں حمّام گری سے منع کر دیں۔ لوہار اور سنار اگر عشاء کے بعد سے طلوعِ فجر کے درمیانی عرصہ تک دھات کوٹنے کا کام کرتے ہیں اور اس سے اہلِ محلّہ کی نیند خراب ہوتی ہے تو انہیں قانوناً روکا جا سکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے گھر باڑی لگا رکھی ہے، اور زمین شوریلی ہونے کی وجہ سے سیل کا اثر پڑوسیوں کے مکان کو گزند پہنچا رہا ہے۔ اور امکان ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو مکان کی بنیادیں ہل جائیں گی، تو اس شخص کو گھر باڑی سے منع کیا جائے گا۔ کوئی شخص پڑوسیوں کی اذیت اور تکلیف کی صورت میں اپنی دوکان کو اصطبل اور حمّام نہیں بنا سکتا۔ اور نہ کسی شخص کو یہ اجازت ہوگی کہ وہ کپڑے اور روئی کے بازار میں تنّور یا آتشیں مادّے کی دوکان کھولے [1]

شروع شروع میں مسلمان بڑی بڑی عمارتیں بنانے اور اُن پر مُسرفانہ خرچ کرنے کو ناپسند خیال کرتے تھے۔ لیکن بعد میں ضروریات کے تحت انہیں زمانے کے حالات کا ساتھ دینا پڑا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ میں عتبہ بن مروان اور ان کے ساتھیوں کے

---

[1] کپڑے اور روئی کے بازار میں آتشیں مادّے کی دوکان لگانے میں شریعت کی نگاہ میں جو قباحت پائی جاتی ہے اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے کراچی کے بوہری بازار کی آتش زدگی کا واقعہ سامنے رکھ لینا کافی ہے۔

Marfat.com

نام ایک خط لکھا اور ان کو پختہ اینٹ سے عمارت تعمیر کرنے کی اجازت دیتے ہوئے ہدایت کی: "پہلے میں تم لوگوں کے لیے اس طرح کی عمارتیں ناپسند کرتا تھا۔ لیکن اگر تم ایسی عمارتیں بنانے پر مُصر ہو، تو یہ خیال رکھو کہ ان کی دیواریں چوڑی اور اُونچی ہوں اور چھت کی لکڑیاں قریب قریب فاصلے پر ہوں"۔

گذرگاہوں اور راستوں کی حفاظت

گذرگاہوں اور راستوں کی صفائی اور توسیع پر فقہاء اسلامی خاص توجہ مبذول کرتی ہے۔ امام ابوالحسن ماوردی نے قاضی (مجسٹریٹ) کے اختیارات گنواتے ہوئے لکھا ہے کہ قاضی حکومت کے مصالح کا لحاظ رکھے، کسی شخص کو راستوں میں اور راستوں کے اردگرد کوئی عمارت وغیرہ نہ بنانے دے، اور بلا استحقاق نصب کیے ہوئے سائبان اور عمارتیں منہدم کرادے۔ اس سلسلے میں قاضی کسی مدعی کی نالش کے بغیر بھی بذات خود اس کا انتظام کرے۔ چونکہ یہ حقوق اللہ میں شامل ہے، اس لیے اس میں مستغیث اور غیر مستغیث دونوں برابر ہیں۔ (لہذا قاضی خود اس کا لحاظ رکھے)۔

علامہ ماوردی نے امور منکرہ کی ذیل میں شوارع عامہ کی نگہداشت محکمۂ احتساب کے کارکنوں کے فرائض میں شامل کی ہے، اور لکھا ہے

سلہ البیان والتبیین للجاحظ ج ۲ ص ۱۸۶۔

Marfat.com

کہ محتسب عام گذرگاہوں میں عمارت بنانے کی ممانعت کر دے۔ اگرچہ راستہ وسیع ہو۔ اور اگر کوئی کچھ بنائے تو اس کو منہدم کرا دے۔ چاہے وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ راستے آمد و رفت میں سہولت و آسائش کے لیے ہوتے ہیں، اس لیے نہیں ہوتے کہ لوگ سہولت عامہ کو نظر انداز کر کے ان میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں[1]

شریعتِ اسلامی نے شوارع عامہ سے جمہور کے حقِ انتفاع کو اس کے پورے لوازم کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسلامی قانون میں یہ بات صاف طور پر مذکور ہے کہ راستہ کی زمین کو نہ فروخت کیا جا سکتا ہے، نہ اسے مسدود کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو باہم تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ کسی کی شخصی ملکیّت ہو اور اس کے بنانے سنوارنے پر کافی رقم خرچ کی گئی ہو[2]۔ دوکانوں کے چبوترے شارع عام کی جانب بڑھا دینے کو راہگیروں کے حقوق پر دست درازی اور تعدّی قرار دیا گیا ہے، اور محکمۂ احتساب کے کارپردازوں پر لازم کیا گیا ہے، کہ وہ ایسے تجاوزات کو فوراً مسمار کر دیں اور آئندہ کے لیے لوگوں کو اس قسم کی دست درازی سے سختی کے ساتھ منع کر دیں[3]۔ فتاویٰ انقریہ میں

---

[1] الاحکام السلطانیہ ص ۲۴۴۔

[2] منیۃ المفتی لیوسف بن ابی سعید السجستانی (مسائل الطرق والابواب، ...)۔

[3] الشیرزی: کتاب نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبۃ ص ۱۱۔

Marfat.com

ہے کہ کوئی شخص راستہ کے درمیان ایسا چھتہ نہیں بنا سکتا جو راستہ کی سہولت میں خلل انداز ہوتا ہو۔ اور اگر عامۃ المسلمین میں سے کوئی شخص اٹھ کر چھتہ بنانے والے کو روکتا ہے اور اس سے جھگڑا کرتا ہے تو یہ قانوناً جائز ہے بلکہ اُسے چھتہ گرا دینے کا بھی حق حاصل ہے۔ فتاویٰ انقرویہ کی یہ عبارت بھی قابلِ ذکر ہے:

"تنگ راستوں میں جو شخص دوکان لگا کر بیٹھتا ہے اور آنے جانے والوں کو مزاحم ہوتا ہے، تو ایسے دوکان دار سے چیزیں خریدنا شرعاً ممنوع ہے۔ اس لیے کہ راستوں پر بلا عذر بیٹھنا مکروہ ہے۔ پس اگر ایسے دوکان دار سے ٹھوکر کھا کر کوئی راہگیر گر جاتا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے تو وہ اس کی ہلاکت کا ضامن ہوگا۔ ایسے آدمی سے اشیاء خریدنے کا مطلب یہ ہوگا کہ معصیت کے کام پر اس کی حوصلہ افزائی اور اعانت کی جا رہی ہے۔"

اسلامی حکومت کا محکمۂ احتساب منجملہ دوسرے فرائض کے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیام کے بارے میں اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ایسے فرائض بھی انجام دینے کا ذمہ دار ہے جو آج کل میونسپلٹیاں اور بلدیاتی مجالس انجام دیتی ہیں۔ اس محکمہ کے کارکن پورے شہر میں گشت کرتے رہتے ہیں اور جہاں کہیں شہری قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی دیکھتے ہیں اُس کا موقعہ پر انسداد کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر محتسب دیواروں اور

Marfat.com

مکانوں کی چھتوں کے اندر ایسے پرنالے لگے ہوئے پائے، جن سے گندے پانی کی چھینٹیں سڑک پر برستی ہوں اور راہگیروں کو ملوث کرتی ہوں، تو اسے چاہیے کہ وہ صاحبِ خانہ کو حکم دے کہ وہ پرنالوں کو مسقّف کرے اور یا انہیں دیوار کے اندر اس طرح سے کھود کر بنائے کہ ان کا پانی گزرگاہ پر غلاظت کی بارش نہ کرتا رہے۔

بازاروں اور گلیوں کی صفائی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ اماطة الاذی عن الطریق صدقة (راستے سے تکلیف دہ چیز کو دُور کرنا بھی صدقہ ہے)۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ اسلام کی ستّر سے اوپر شاخیں ہیں، ان میں سب سے چھوٹی شاخ راستوں سے اذیٰ کو زائل کرنا ہے۔ چنانچہ شارح علیہ السّلام کا ارشاد ہے کہ جو شخص پھل دار درخت کے نیچے یا گزرگاہ پر یا نہر کے کنارے قضائے حاجت کرتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت برستی ہے۔ چنانچہ ارشاد نبویؐ کی بناء پر اسلامی معاشرے کے ہر فرد کی یہ روش ہو گئی تھی کہ وہ لوگوں کو گزرگاہوں پر کوڑا کرکٹ پھینکنے یا بول و براز کرنے سے منع کرتے تھے۔ بستان العارفین کے مصنّف مشہور فقیہ امام ابواللیث سمرقندی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "کسی صاحبِ عقل کو یہ زیب نہیں دیتا کہ جہاں سے لوگ گزرتے ہوں، وہ وہاں تھوکے یا ناک صاف کرے، اور لوگوں کے پاؤں کو گندہ کرنے کا موجب بنے"۔ ناصر خسرو

Marfat.com

ایرانی سیّاح نے طرابلس الشّام کے گھروں اور بازاروں کی نظافت و نفاست سے متاثر ہو کر لکھا ہے کہ نو وارد کو گمان ہوتا ہے کہ طرابلس الشّام کا ہر گھر اور بازار آراستہ و پیراستہ محلّ ہے۔ یہ سیّاح جب طرابلس الشّام سے چل کر صیدا (لبنان کا ایک اور شہر) پہنچا تو وہاں کے بازاروں کی صفائی، ستھرائی اور آراستگی دیکھ کر اُسے وہم ہوا کہ اس غیر معمولی زیب و زینت کا اہتمام یا تو بادشاہ کی آمد کی خاطر کیا گیا ہے یا کوئی خوشی کی تقریب ہے۔ لیکن جب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ صفائی اور آراستگی اہلِ شہر کی طبیعت کا اقتضاء ہے، وہ اپنے شہر کو ہمیشہ اسی طرح آراستہ و پیراستہ رکھتے ہیں[1]۔

ٹریفک کے اصول

ٹریفک کے قواعد یہ ہیں کہ پیادہ راستے کے ایک جانب (فٹ پاتھ پر) چلے اور سوار راستے کے وسط میں۔ یہ پابندی شہر کے لیے ہے۔ اور اگر میدان یا صحرا ہو تو وسطِ شارع پیادہ کے لیے ہے اور دونوں کنارے سوار کے لیے۔ مستحب یہ ہے کہ پاپوش پہنے ہوئے شخص برہنہ پا کے لیے نرم اور صاف راستہ چھوڑ دے[2]۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامہ عجائب الاسفار میں لکھا ہے کہ دمشق کی گلیوں اور

---

[1] سفرنامہ ناصر خسرو۔

[2] بستان العارفین للامام ابواللیث سمرقندی ص ۱۲۱۔

Marfat.com

سڑکوں کے دو رویہ پٹڑیاں تھیں۔ پیدل چلنے والے پٹڑیوں پر چلتے تھے اور سوار و سطیں[1]۔

مقاماتِ عامہ کی حیثیت

شریعتِ اسلامی کی رُو سے پبلک مقامات، مثلاً پُل، سڑکیں، پارک، دروازے اور باغ کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کسی شہری کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان پر اپنی اجارہ داری قائم کرلے۔ اور دوسروں کو ان سے متمتع ہونے سے روک دے۔ یہ مقامات منفعت عامہ کے لیے مشترک رہنے ضروری ہیں[2]۔

دریاؤں کے ساحل اور نہروں کے کناروں کے بارے میں متقدمین کا اجماع ہے کہ ان پر کسی قسم کی شخصی عمارت بنانا ممنوع ہے۔ اس سے شریعت کا منشاء یہ ہے کہ صحت افزا اور تفریحی مقامات امیر و غریب تمام شہریوں کے لیے مشترک رہیں۔ مؤرخ ابن ایاس (متوفی: ۹۳۰ھ) نے تاریخ مصر "بدائع الزھور فی وقائع الدھور" میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جلال الدین سیوطی نے فتویٰ دیا تھا کہ دریائے نیل کے اندر جزیرۃ الروضہ کے ساحل پر کسی قسم کی عمارت تعمیر کرنا ناجائز ہے، اور امام شافعیؒ کے مسلک میں اس کا جو جواز منقول ہے وہ غلط ہے۔ کتبِ شافعیہ میں

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۶۰ ج ۱۔

[2] مرشد الحیران، قدری پاشا، ص ۴۔

Marfat.com

اس کی صحت کا مطلقاً کوئی ثبوت نہیں ملتا[1]۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل نیل کے تمام سواحل عیش پرست امراء اور اغنیاء کی شخصی ملکیت بن کر رہ گئے ہیں۔ اور ان کا وہ عمومی فائدہ جس سے تمام اہلِ شہر بہرہ ور تھے ان لوگوں کی اجارہ داری نے ختم کر دیا ہے۔

دیہاتی آبادی میں بستیوں کے اردگرد کی شاملاتِ اراضی، چوپال، پڑاؤ اور کھلیان لگانے کے مقامات اُسی حکم میں داخل ہیں جو شہری آبادی میں راستوں، باغوں اور پارکوں کا ہے۔ کیوں کہ دیہاتی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے اور افادۂ عام کے لحاظ سے ان کو وہی اہمیت حاصل ہے جو شہر کے تفریحی مقامات کی ہے۔ اس لیے گاؤں کی مذکورہ زمینوں پر مواتِ (غیر آباد اراضی) کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ یہ عامر (آباد اراضی) کے تحت شمار ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ دیہی آبادی کے رفاہِ عامہ کے مقامات میں داخل ہے[2]۔

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی طرزِ بود و باش

ان تفصیلات کے بعد یہ بیان کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے اوراق میں ہم نے اسلامی تاریخ کے جس دَور کا ذکر کیا ہے اور جس دَور کے مسلم معاشرے کی عمرانی اور تمدّنی حالات کا مختصراً جائزہ

---

[1] بدائع الزہور ج ۲ ص ۲۷۱۔

[2] اللباب شرح مختصر القدوری ص ۲۰۲۔

Marfat.com

لیا ہے عین اس دَور میں یورپ کی آبادیوں کا کیا حال تھا۔ چنانچہ ذیل میں ہم انگریز مؤرخ (Draper) کی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں اُس نے قرونِ وسطیٰ (جو مسلم تاریخ کا سنہری دور شمار ہوتا ہے) میں یورپ کے شہروں کی حالت بیان کی ہے۔ ڈریپر لکھتا ہے:

"پورا براعظم تقریباً گھنے جنگلوں میں گھرا ہوا تھا۔ گندے پانی کے جوہڑوں اور جھیلوں نے شہروں اور بستیوں کو گھیر رکھا تھا۔ جن سے بدبو کے بادل اٹھ اٹھ کر اوپر کو چڑھتے تھے اور لوگوں کے لیے موت کا پیغام لے کر نازل ہوتے تھے۔ پیرس اور لندن میں لوگ لکڑی، بھُس کے سنے ہوئے گارے اور بانسوں سے مکان بناتے تھے۔ جن میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں ہوتا تھا۔

فرش فروش سے کوئی واقف نہ تھا۔ لوگ زمین پر پھوس بچھا کر گزارہ کرتے تھے۔ مکان کے اندر دھوئیں کی چمنی لگانا کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ دھواں مکان کی چھت میں سے ایک سوراخ کے اندر سے اوپر نکلتا تھا۔ لیکن نکلنے سے پہلے مکان کے اندر پھیل کر مکینوں کو طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا

Marfat.com

کر دیتا تھا۔ عوام صفائی اور نظافت کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ جانوروں کی اوجھ، روڑے اور سبزیوں کے چھلکے گھروں کے سامنے پھینک دیتے تھے، اور وہ ایک ڈھیر کی شکل میں بدبو اور تعفن کا سٹور بنے رہتے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے ایک ہی کوٹھڑی میں سوتے تھے۔ اور اکثر اوقات اسی کوٹھڑی میں گھر کے ڈھور ڈنگر بھی بندھے ہوتے تھے۔ اس شور و غل اور پراگندگی میں شرم و حیا اور نفسیات کا پنپنا محال تھا۔[1]"

مؤلف حیات اجتماعی کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ بھی بتاتا ہے کہ آبادیوں میں پانی کے نالوں اور کھائیوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ لوگ گندگی کی بالٹیاں اور پانی کے برتن گھر کے اندر کھڑے ہوئے باہر انڈیل دیتے تھے اور اکثر راہگیر ان کی لپیٹ میں آتے رہتے تھے۔ سڑکیں اور راستے بالعموم کیچڑ سے اٹے ہوئے اور تنگ و تاریک ہوتے تھے۔[2]

ترجمان القرآن ۔ اپریل ۵۸ء

---

[1] Lescomptbics DE science

[2] ایضاً

Marfat.com

شیخ الازہر محمد محمود شلتوت :

شیخ مصر کے ضلع بحیرہ میں منیہ بن منصور کے مقام پر ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ حفظِ قرآن کے بعد اسکندریہ کی دینی درسگاہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں عالم کی امتیازی ڈگری حاصل کی اور پھر اسی درسگاہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں ازہر کی اعلیٰ جماعتوں کے استاذ منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں جب شیخ مصطفیٰ مراغی حنفی مرحوم نے ازہر کی اصلاح کی تحریک اٹھائی تو سب سے پہلے شیخ شلتوت کی جانب سے اس کی صدا بازگشت اٹھی۔ کچھ عرصہ کے بعد موصوف کو ازہر میں قانون اسلامی کے تخصص کی کلاس شروع کا مدرس مقرر کیا گیا۔ لیکن اس موقع پر موصوف کے انقلابی نظریات ازہر کی پالیسی سے متصادم ہو گئے اور وہ ۱۹۳۱ء کو اپنے ہم خیال ساتھیوں سمیت ازہر سے برطرف کر دیے گئے۔

ازہر سے برطرفی کے بعد شیخ شلتوت نے مجلات و جرائد کے ذریعہ اور خاص طور پر سعد پارٹی کے اخبار "السیاسۃ" کے صفحات پر ازہر کے جمود پر کڑی تنقید شروع کر دی اور ساتھ ہی وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ مگر حالات میں تبدیلی آنے کے بعد موصوف کو ۱۹۳۵ء میں دوبارہ ازہر میں بلا لیا گیا اور ازہر کے شریعت کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد موصوف شیخ الازہر مقرر ہونے تک ازہر کے مختلف شعبوں کے انچارج رہے ہیں۔

۱۹۳۷ء میں لاہور میں "قانون کے متقابل مطالعہ" کی کانفرنس میں ازہر

Marfat.com

کی نمایندگی کی۔ ۱۹۴۱ء میں علماء ازھر کی سپریم کونسل کی ممبر شپ حاصل کی۔ موصوف اس کونسل کے سب سے کم عمر رکن تھے۔ ۱۹۴۶ء میں مصر کی المجمع اللغوی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں اسلامی کانگرس قاہرہ کے مشیر مقرر ہوئے، اور یہی عہدہ اُن کے لیے ازھر کے ناظم اعلیٰ مقرر ہونے کی خوشخبری لے کر آیا۔

آج کل موصوف عرب دنیا کے علمی حلقوں میں شدید تنقید کا ھدف بنے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ موصوف کے بعض منفرد نظریات ہیں۔ دراصل ازھر کی شیخت پھ فائز ہونے کے بعد موصوف نے مصری حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے بعض ایسے فتاویٰ صادر کیے ہیں جو شریعتِ اسلامی کی نصوص سے متصادم ہیں۔ اور اسی لغزش نے آپ کی علمی شہرت و اعتماد کو مجروح کر دیا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل موصوف نہایت ہر دلعزیز اور وقیع الرائے تھے۔

Marfat.com

اسلام کے اصول معاہدات

دعوتِ اسلامی سے پہلے عالمِ انسانی پر جس چیز نے اپنا سکہ جاری کر رکھا تھا اسے اگر ہم ایک لفظ سے تعبیر کریں تو وہ "خودسری" تھی عقیدہ و فکر پر اسی کا تسلّط تھا، اجتماعی تعلقات میں اسی کی کارفرمائی تھی۔ نظامِ حکومت اسی کے زیرِ اثر تھا ــــ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حیوانی جذبات اور بہیمانہ جوش و جنوں ہی دراصل عالمِ انسانی کے کرتا دھرتا تھے۔ انہی کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار کی زمام تھی اور انہی کی منشاء کے مطابق تعلقات و روابط طے پاتے تھے۔

اب ظاہر ہے کہ حیوانی جذبات کی قلمرو میں فرد اور فرد کے مابین اور قوم اور قوم کے درمیان تعلقات کی نوعیت قوت اور کمزوری کے پیمانہ ہی سے ناپی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اُس وقت بھی یہی پیمانہ رائج تھا اور اسی کے نتیجے میں طاقتور کمزور کو کھا جاتا تھا۔ توانا ناتواں کا حق غصب کر لینے میں کوئی حرج نہ سمجھتا تھا، اور غالب مغلوب کا خون نچوڑ لینے کو پیدائشی حق تصوّر کرتا تھا۔ الغرض

Marfat.com

قوّت و قہر، جبروت و کبریائی اور سلب و نہب کی ہر سو فرمانروائی تھی۔

اسلام کی داخلی و خارجی سیاست کا سنگِ بنیاد

ان ہنگامہ ہائے رستاخیز اور غلغلہ ہائے دار و گیر کے عین شباب میں خورشیدِ اسلام مطلع عالم پر نمودار ہوا۔ اس کی عالمتاب شعاعوں کے ذریعے اللہ تعالےٰ نے انسانوں پر امن و سلامتی کی راہ کھولی اور کفر و سرکشی کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و رحمت کے نور کی جانب ان کی رہنمائی کی۔ چنانچہ اسلام نے اس سرکش اور جارح ماحول کے اندر انسانوں کو وحدتِ انسانیت کی دعوت دی۔ اس وحدت میں قومیّت اور رنگ و نسل کی بنا پر تفرقہ اندازی اور گروہ سازی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اسی طرح اسلام نے دوسرے جس اصول کا اعلان کیا وہ بے لوث عدل و انصاف تھا جو بیگانے اور بیگانے کے تصوّر سے پاک، دوست و دشمن کی تفریق سے ناآشنا، قوی و ضعیف کے امتیاز سے مبرّا — بلکہ مومن اور کافر کی تمیز تک سے بے لاگ تھا۔ اسی حقیقت کی جانب قرآن توجّہ دلاتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! اللہ
كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ	کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور
بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ	انصاف کی گواہی دینے والے بنو،
قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا	کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ

Marfat.com

هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ (المائدہ)

کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو: یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ (النساء: ۱۳۵)

اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار اور خدا کے واسطے (یعنی صرف خدا کی خوشنودی کی خاطر) گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین پر اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

ان دونوں اصولوں ـــــ وحدتِ انسانیت اور بے لاگ عدل ـــــ کی بنیاد پر اسلام نے اپنی ..... اجتماعی پالیسی کی عمارت قائم کی اور انہی کے تحت مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت متعین کی۔ اور انہی کی روشنی میں مسلمانوں اور غیر مسلم قوموں کے مابین اصولِ روابط وضع کیے۔ اور پھر مسلمانوں اور غیر قوموں کے درمیان جنگ اور صلح کی دونوں حالتوں میں اپنی اس پالیسی کی انتہائی پابندی کی۔ اور اس سلسلے میں یہاں تک اعتنا برتا کہ بین الاقوامی تعلقات کے ان تمام قواعد و ضوابط کو تفصیل سے بیان کر دیا جو قومی وجود کے تحفظ اور دنیا

Marfat.com

میں عدل و انصاف کا علمبردار بننے کے لیے ناگزیر ہیں۔

ہم یہاں ان تمام بین الاقوامی ضابطوں میں صرف معاہدات کو دو پہلوؤں سے بیان کریں گے۔ ایک یہ کہ وہ اصول کیا ہیں جنہیں اسلام کسی دوسرے شخص یا گروہ یا قوم سے معاہدہ استوار کرنے کی اساس قرار دیتا ہے، اور دوسرا یہ کہ معاہدے کے ایفاء اور معاہدے کے فسخ کے بارے میں اسلام کی کیا ہدایات ہمیں ملتی ہیں؟

توثیق معاہدہ کے بارے میں اسلام کی شرائط

پہلی شق یعنی توثیق معاہدہ کی اساس کے بارے میں اسلامی نقطۂ نگاہ کا ماحصل یہ ہے کہ:

(ا) اسلام کسی غیر قوم یا گروہ سے کوئی ایسا معاہدہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو اسلام کے اساسی اصول اور اس کی بنیادی تعلیمات پر اثر انداز ہوتا ہو۔

(ب) اسلام کی نگاہ میں صحیح اور قابلِ ایفاء وہی معاہدہ ہے جس کے طے کرنے میں دونوں فریقوں کی کامل رضامندی اور اطمینانِ قلب شامل ہو۔

(ج) یہ ضروری ہے کہ جو معاہدہ بھی کیا جائے اُسے ایک واضح اور غیر مبہم دستاویز کی صورت دی جائے جس میں دونوں فریقوں کے حقوق و فرائض اور شرائط و التزامات کو صاف صاف متعین کر دیا گیا ہو تاکہ کسی فریق کے لیے غلط تاویل و تعبیر کی گنجائش باقی نہ

Marfat.com

رہے۔

مذکورہ بالا تینوں اصولوں کے مطالعہ سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی نگاہ میں ایسا کوئی معاہدہ قابلِ قبول نہیں ہے جس میں کوئی ایسا جزء پایا جاتا ہو جو بالواسطہ یا بلاواسطہ خود بلادِ مسلمین کے اندر اسلام کی بے حرمتی کا باعث ہو۔ جیسے اللہ کے نازل کردہ قوانین کے خلاف فیصلوں کو جائز قرار دینا یا غیر مسلموں کو بلادِ مسلمین کے اندر ایسے حقوق عطا کر دینا جو مسلمانوں کے اقتدارِ حکومت کی نفی کرتے ہوں۔ اسی طرح اسلام کسی ایسے معاہدے کو بھی سندِ جواز نہیں دیتا جو تخویف و تہدید، قہر و غلبہ اور حالات کا دباؤ ڈال کر منعقد کیا گیا ہو۔ اور نہ اسلام کسی ایسے معاہدے کو تسلیم کرتا ہے جو الفاظ کی حد تک تو معاہدہ ہو۔ لیکن یہ الفاظ صرف شاطرانہ فریب کاری کے لیے ہوں اور فی الحقیقت یہ معاہدہ فریقِ ثانی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور اُس کی دولت و ثروت کو ہضم کرنے کے لیے بطور حربہ اختیار کیا گیا ہو۔

مذکورہ قواعد کے دلائل

مذکورہ بالا قواعد و ضوابط کا ایک عام ماخذ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک ہے کہ کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل (جو شرط کتاب اللہ میں نہیں ہے وہ باطل ہے) لیکن ہمیں اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی واضح نصوص بھی ملتی ہیں، مثلاً معاہدات کو فریب کاری کا ہتھیار بنانے کی ممانعت میں قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

Marfat.com

تتخذون ایمانکم دخلا بینکم ان تکون امة ھی اربی من امة۔ انما یبلوکم اللہ بہ۔ (النحل)

تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تا کہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے، حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔

ولا تتخذوا ایمانکم دخلا بینکم فتزل قدم بعد ثبوتھا۔ (النحل)

(اور اے مسلمانو!) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بناؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے۔

ان آیات میں قسموں سے مراد وہ حلف ہیں جو توثیقِ معاہدات کے وقت اٹھائے جاتے ہیں یا وہ قول و قرار ہیں جن کی اطاعت کا عہد ایک دوسرے سے کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ دخل کے معنی فریب کاری، منافقت، جعل سازی اور ریشہ دوانی کے ہیں۔ موجودہ ڈپلومیسی میں جس فریب کاری کو عین دانش مندی اور فتح تصور کیا جاتا ہے، اسلام کی نگاہ میں توثیقِ معاہدہ کے بعد اس قسم کی فریب کاری سخت ملعون اور قابلِ مذمت ہے۔

اسلام کے ان اصولِ معاہدات کو آپ ایک جانب رکھیں اور دوسری جانب ان معاہدات کو رکھیں جو دورِ حاضر میں ترقی یافتہ اقوام

Marfat.com

کی طرف سے طے کیے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے موازنہ سے یہ بات ایک کھلی حقیقت کی طرح آپ کے سامنے آجائے گی کہ ان اقوام کے معاہدات کمزور قوموں کی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ اُنہیں اپنا لقمہ بنانے کے لیے ہیں، امن و سلامتی کی پناہ گاہ نہیں بلکہ شرّ و فساد کا سرچشمہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان معاہدات نے پوری دنیا کو سعادت و فلاح سے بہرہ ور کرنے کے بجائے شقاوت و نکبت کے جہنم میں جھونک رکھا ہے۔

معاہدہ کے ایفاء و نقض کے بارے میں اسلامی احکام

اسلام اس امر کا علمبردار ہے کہ جب کوئی معاہدہ سابقہ اصولوں کی روشنی میں صحت مندانہ طریقے سے طے پا جائے تو جب تک وہ معاہدہ قائم ہے اُس کی ہر لحاظ سے ظاہراً و باطناً وفاداری اور پابندی کی جائے۔ اور اس کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی کرنے یا کسی تقاضے کو پامال کرنے کی قطعاً اجازت نہ دی جائے۔ قرآنِ کریم نے اس بارے میں نہایت صریح اور مُحکم ہدایت کر دی ہے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔

عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو پوری جواب دہی کرنی ہوگی۔ (بنی اسرائیل)

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ

اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے کوئی عہد اس سے باندھا ہو، اور اپنی قسمیں

Marfat.com

بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا۔ (النحل) پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو۔

ان دونوں آیتوں میں محض اخلاقی ہدایت ہی نہیں دی گئی ہے، بلکہ ان کو اسلامی حکومت کی داخلی وخارجی سیاست کا سنگِ بنیاد بتایا گیا ہے۔

نقضِ معاہدہ کے لیے اسلام نے صرف دو ہی صورتیں قرار دی ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو فریقِ ثانی سے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے یا وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا۔ اسی صورت میں اسلامی حکومت کو یہ اجازت ہے کہ وہ خود اقدام کر کے معاہدے کو فسخ کر دے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وہ صرف اپنی جگہ پر فسخِ معاہدہ کا فیصلہ کر کے نہ بیٹھ رہے بلکہ اپنے اس فیصلے سے فریقِ ثانی کو فوراً مطلع کر دے۔ سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے اسی صورت کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے:

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۔[1]

اور اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا غدشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

---

[1] یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کی تشریح میں صاحبِ تفہیم القرآن نے جو نوٹ رقم فرمایا ہے، اُس کا مطالعہ بھی کر لیا جائے:۔ (مترجم)

Marfat.com

دوسری صورت یہ ہے کہ معاہدہ پہلے خاص حالات کے تحت

---

(۳) :-

"اس آیت کی رُو سے ہمارے لیے کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ یا ملک سے ہمارا معاہدہ ہو اور ہمیں اس کے طرزِ عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے، یا یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا، تو ہم اپنی جگہ خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان معاہدہ نہیں رہا اور یکایک اس کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کرنا شروع کر دیں جو معاہدہ نہ ہونے کی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہو۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو ہم کوئی مخالفانہ کارروائی کرنے سے پہلے فریقِ ثانی کو صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا۔ تاکہ فسخِ معاہدہ کا جیسا علم ہم کو ہے ویسا ہی اُس کو بھی ہو جائے اور وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ معاہدہ اب بھی باقی ہے۔ اِسی فرمانِ الٰہی کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول قرار دیا تھا کہ: "من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلن عقدہ حتی ینقضی امدھا او ینبذ الیھم علی سواء"۔ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اسے چاہیے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے۔ یہ نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

طے کیا گیا ہو، بعد میں وہ حالات بدل گئے ہوں اور اب اسلامی حکومت

(بقیہ صـ ۲۶۱):-

ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔" پھر اسی قاعدے کو آپ نے اور زیادہ پھیلا کر تمام معاملات میں عام اصول یہ قائم کیا تھا کہ "لاتخن من خانك" "جو تیری خیانت کرے تو اس کی خیانت نہ کر۔" اور یہ اصول صرف وعظوں میں بیان کرنے اور کتابوں کی زینت بننے کے لیے نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب امیر معاویہؓ نے اپنے عہد بادشاہی میں سرحدِ روم پر فوجوں کا اجتماع اس غرض سے کرنا شروع کیا کہ معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی یکایک رومی علاقہ پر حملہ کر دیا جائے تو ان کی اس کارروائی پر عمرو بن عنبسہ صحابی نے سخت احتجاج کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حدیث سُنا کر کہا کہ معاہدہ کی مدت کے اندر یہ معاندانہ طرزِ عمل اختیار کرنا غداری ہے۔ آخر کار امیر معاویہ کو اس اصول کے آگے سر جھکا دینا پڑا، اور سرحد پر اجتماع فوج روک دیا گیا۔

یک طرفہ فسخِ معاہدہ اور اعلانِ جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جاہلیت میں بھی تھا اور زمانۂ حال کی مہذب جاہلیت میں بھی اس کا رواج موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں جنگِ عظیم ثانی میں روس پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف روس و برطانیہ کی فوجی کارروائی میں دیکھی گئی ہیں۔ عموماً اس کارروائی کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملہ سے پہلے

(۴)

Marfat.com

کے اربابِ حل و عقد کی رائے میں اس معاہدے کا قائم و بحال رہنا

---

(۴) :-

مطلع کر دینے سے دوسرا فریق ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرتا۔ یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو ہمارا دشمن فائدہ اٹھا لیتا۔ لیکن اس قسم کے بہانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کو ساقط کر دینے کے لیے کافی ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بہانے نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہر چور، ہر ڈاکو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعلساز اپنے جرائم کے لیے ایسی ہی کوئی مصلحت بیان کر سکتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کے لیے اُن بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جب کہ ان کا ارتکاب قومی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلامی قانون صرف ایک صورت میں بلا اطلاع حملہ کر دینے کو جائز رکھتا ہے، اور وہ صورت یہ ہے کہ فریقِ ثانی علی الاعلان معاہدہ کو توڑ چکا ہو اور اس نے صریح طور پر ہمارے خلاف معاندانہ کارروائی کی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہم اسے آیت مذکورہ بالا کے مطابق فسخِ معاہدہ کا نوٹس دیں۔ بلکہ ہمیں اس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کارروائی کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ فقہائے اسلام نے یہ استثنائی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے نکالا ہے کہ قریش نے جب بنی خزاعہ کے معاملہ میں صلح حدیبیہ کو علانیہ توڑ دیا تو آپؐ نے پھر انہیں

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

قوم کے لیے نقصان دِہ ہے، اور اس کے ذریعے سے جو تحفظات اور

(بقیہ صفحہ گذشتہ):-

فسخِ معاہدہ کا نوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی، بلکہ بلا اطلاع مکّہ پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اگر کسی موقع پر ہم اس قاعدۂ استثناء سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو لازم ہے کہ وہ تمام حالات ہمارے پیشِ نظر رہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کارروائی کی تھی، تاکہ پیروی ہو تو آپؐ کے پورے طرزِ عمل کی ہو نہ کہ اس کے کسی ایک مقید مطلب جزء کی۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ:

اوّلاً، قریش کی خلاف ورزیٔ عہد ایسی صریح تھی کہ اس کے نقضِ عہد ہونے میں کسی کلام کا موقع نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے معترف تھے کہ واقعی معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ انہوں نے خود ابوسفیان کو تجدیدِ عہد کے لیے مدینہ بھیجا تھا جس کے صاف معنی یہی تھے کہ ان کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناقضِ عہد قوم کو خود بھی اپنے نقضِ عہد کا اعتراف ہو۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ نقضِ عہد بالکل صریح اور غیر مشتبہ ہو۔

ثانیاً، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحۃً یا اشارۃً یا کنایۃً ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ایماء نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپؐ ابھی تک اُن کو ایک

(۲)

Marfat.com

منافع حاصل ہو رہے ہوں، اُن سے بدرجہا زیادہ اُن سے مفاسد

---

(۳) :-

معاہد قوم سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ آپؐ کے معاہدانہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابو سفیان نے مدینہ آ کر تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو آپؐ نے اُسے قبول نہیں کیا۔

ثالثاً، قریش کی جنگی کارروائی آپؐ نے خود کی اور کھُلم کھُلا کی۔ کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپؐ کے طرزِ عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپؐ نے بظاہر صلح اور بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال فرمایا ہو۔

یہ اس معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے، لہذا آیت مذکورہ بالا کے حکمِ عام سے ہٹ کر اگر کوئی کارروائی کی جا سکتی ہے تو ویسے ہی مخصوص حالات میں کی جا سکتی ہے اور اسی سیدھے سیدھے شریفانہ طریقہ سے کی جا سکتی ہے جو حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا۔

مزید برآں اگر کسی معاہد قوم سے کسی معاملہ میں ہماری نزاع ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ گفت و شنید یا بین الاقوامی ثالثی کے ذریعے سے وہ نزاع طے نہیں ہوتی، یا یہ کہ فریقِ ثانی اس کو بزور طے کرنے پر تُلا ہُوا ہے تو ہمارے لیے یہ بالکل جائز ہے کہ ہم اس کو طے کرنے میں طاقت استعمال کریں۔ لیکن آیت مذکورۂ بالا ہم پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ہمارا یہ استعمالِ طاقت صاف صاف اعلان کے بعد ہونا چاہیے اور کھُلم کھُلا ہونا

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

مضرات پیدا ہو رہے ہوں۔ اس صورت میں اسلامی حکومت پر واجب ہے کہ وہ معاہدہ کو فسخ کر دے اور اس کی اطلاع معاہد قوم تک پہنچا دے۔ ذیل کی آیت سے اس امر کی رہنمائی ملتی ہے:

واذان من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بریٔ من المشرکین ورسولہ۔ (التوبہ)	اطلاع عام ہے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔

(معاہدات کی منسوخی کا یہ اعلانِ عام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اُن تمام قبائل کے خلاف کیا گیا جو عہد و پیمان کے باوجود ہمیشہ اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اور موقع پاتے ہی پاسِ عہد کو بالائے طاق رکھ کر دشمنی

(بقیہ صـ۲۶۵) :-

چاہیے۔ چوری چھپے ایسی جنگی کارروائیاں کرنا جن کا علانیہ اقرار کر لینے کے لیے ہم تیار نہ ہوں، ایک بداخلاقی ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو نہیں دی ہے۔"

(تفہیم القرآن جلد دوم صـ۱۵۵ نوٹ ۳۱)

Marfat.com

پر اُنز آتے تھے)۔

البتہ دوسری صورت میں اس امر کا لحاظ کیا جا سکتا ہے کہ اگر معاہدہ مدّتِ معیّنہ کے ساتھ مقیّد ہو تو مدّت پوری ہونے تک اس کی پابندی کی جائے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِلَّا الَّذِیْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْـًٔا وَّلَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ۔ (التوبہ)	بجز اُن مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی۔ اور نہ تمہارے خلاف کسی کی امداد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدتِ معاہدہ تک وفا کرو۔

یہ استثناء اسی مذکورۂ بالا اطلاعِ عام سے ہے۔ اور اسے جس شرط سے مشروط کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ معاہد قوم نے مسلمانوں کے خلاف کھلّم کھلاّ کارروائی نہ کی ہو، بلکہ عہد کا پاس رکھا ہو۔ لیکن مجموعی طور پر مسلمانوں کو ان کے ساتھ بقائے معاہدہ میں فائدے سے زیادہ نقصان ہو، اس لیے معاہدہ کو درمیان میں منسوخ کر دینے کے بجائے اختتامِ مدّت کا انتظار کیا جائے۔

معاہدات کے عقد و فسخ کے بارے میں اسلام کی یہ پالیسی اور

Marfat.com

اصول وضوابط بین الاقوامی خیر سگالی اور امن و سلامتی کی فضا قائم رکھنے کی جو قوت اپنے اندر مضمر رکھتے ہیں، وہ کسی منصف مزاج شخص سے مخفی نہیں ہے۔ اگر مغربی تہذیب کے شیدائی ان اصول وضوابط کا مطالعہ کریں اور اپنی پالیسیوں کو ان کے مطابق ڈھالیں تو بلاشبہ حرص و ہوا اور جوع الارض کے ہلاکت خیز طوفانوں اور ظلم و جور اور مکر و فریب سے بھرپور ڈپلومیسیوں کی وجہ سے دنیائے انسانیت پر جو پے در پے نکبت و ہلاکت کے دور پڑ رہے ہیں ان سے دنیا کو نجات مل سکتی ہے۔ اور ہر قوم اپنے طبعی حقوق سے متمتع ہونے کا موقع پا سکتی ہے۔ بلکہ اس سے خود علمبردارانِ تہذیبِ جدید کے دعاوی امن و فلاح بھی خلقِ خدا کی نگاہ میں اطمینان و یقین کا باعث ہو سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن: ستمبر ۵۸ء)

Marfat.com

ڈاکٹر عبدالغنی حسن :

مصری ہیں۔ اسلامی علوم اور مغربی علوم پر یکساں نگاہ رکھتے ہیں۔ اپنے پختہ فکر، شُستہ اسلوب نگارش، فنّی دستگاہ، اصابت رائے کی وجہ سے مصر کے صف اوّل کے اہلِ قلم شمار ہوتے ہیں اور ہمیشہ چوٹی کے رسائل وجرائد میں جگہ پاتے ہیں۔ اسلامی تاریخ اور سیر و رجال کے باب میں اختصاصی مقام رکھتے ہیں۔ سیر و رجال پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور اس موضوع کی متعدد قدیم کتابوں کو نئی ترتیب و تنقیح کے ساتھ اہلِ علم کی نذر کر چکے ہیں۔

جہاں طٰہٰ حسین، مصطفیٰ امین، توفیق الحکیم اور اس گروہ کے دوسرے لوگ نئی نسل کو قدیم اسلامی ورثے سے بیزار کرنے کا کام سرانجام دے رہے ہیں اور اُسے مشرق کے بجائے مغرب سے وابستہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہاں ڈاکٹر عبدالغنی اُسے طبقاتِ فقہاء و محدثین، اربابِ سیر و مغازی اور علمائے

Marfat.com

نحو ولغت کے تراجم وسوانح سے متعارف کرانے میں لگے ہوئے ہیں ؎

وللناس فیما یعشقون مذاھب

اس سلسلہ میں موصوف کی سب سے نفیس ترین تالیف ۔ التراجم والسیر ہے ۔ ادب عربی کا بھی نہایت شستہ ذوق رکھتے ہیں ۔ ابن الرومی پر تحقیقی کام کر کے ادبی حلقوں میں امتیازی مقام حاصل کر چکے ہیں ۔

Marfat.com

اسلام کا بین الاقوامی قانون

اسلام کے بین الاقوامی قانون پر سب سے پہلی کتاب اور اس کا سببِ تالیف

اسلام کے بین الاقوامی قانون پر سب سے پہلی جو کتاب عالمِ وجود میں آئی ہے۔ وہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کی "السیر الکبیر" ہے۔ اس کتاب کا ظہور دراصل "طیش" کا شرمندۂ احسان ہے۔ طیش بلاشبہ ایک ناپسندیدہ صفت ہے۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالےٰ ناپسندیدہ چیز کے بطن سے خیر کثیر برآمد کرتا ہے۔ خیال فرمائیے، ایک مسلمان فقیہ دوسرے مسلمان فقیہ کے ایسے الفاظ پر طیش میں آجاتا ہے جو مؤخر الذکر کی طرف سے اوّل الذکر کے حق میں تنقیص کے انداز میں کہے جاتے ہیں۔ لیکن یہ طیش یا گرمیٔ جذبات اس کے اندر ذاتی کینہ یا حسد یا اسی قبیل کے دیگر سفلی جذبات مشتعل نہیں کرتی بلکہ اس کے اندر عمل بالخیر کا داعیہ تیز تر کر دیتی ہے اور اسے ایک ایسی مضبوط اور ٹھوس کتاب کی تصنیف پر لگا دیتی ہے جس سے وہ عالمِ مذکور کو اپنے الفاظ واپس لینے پر مجبور کر سکے۔ چنانچہ وہ اس کتاب کی تصنیف میں ہمہ تن منہمک ہو جاتا ہے اور آخر کار جامعیت و خوبی کے

Marfat.com

ہر ممکن تصور کے ساتھ یہ کتاب منظرِ عام پر آجاتی ہے جس میں اسلامی نقطۂ نظر کے تحت اسلام کے فلسفۂ جنگ اور تعلقاتِ خارجہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس موضوع کی ہر گرہ کو خوش اسلوبی سے سلجھایا جاتا ہے۔ ایک طرف یہ تمام بحث اسلامی حدود کے اندر پوری آزادیٔ فکر و نظر پر مبنی ہوتی ہے اور دوسری طرف ہر بات کا استناد اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنّت سے کیا جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ حسنِ تدبّر، وسعتِ نظر، وفورِ علم اور عمقِ تفقہ کا بے کراں بحر مصروفِ تلاطم ہے۔

دراصل "السّیر الکبیر" سے پہلے امام محمدؒ نے "السّیر الصغیر" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی، جس میں مختصراً تعلّقاتِ خارجہ، جنگ اور صلح و امان کے بارے میں اسلامی احکام بیان کیے تھے۔ یہ کتابچہ (الصغیر) جب شام کے نامور محدّث امام اوزاعیؒ کے ہاتھ لگا تو امام موصوف نے دریافت فرمایا: "یہ کس کی تصنیف ہے؟" لوگوں نے بتایا: "یہ محمد بن حسنؒ عراقی کا نتیجۂ فکر ہے۔" اس پر امام اوزاعیؒ نے کہا: "اہلِ عراق کو اس موضوع سے کیا واسطہ؟ ان کو سیر (جنگ کے مسائل) کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے غزوات کا رُخ شام و حجاز کی طرف رہا ہے، عراق کی طرف نہیں تھا۔ یہ ملک بعد میں فتح ہُوا ہے۔" امام اوزاعیؒ کے یہ الفاظ جب امام محمدؒ بن حسن عراقی کے کانوں تک پہنچے تو آپ بہت متاثر ہوئے اور سیَر کے موضوع پر ایک مفصّل اور جامع کتاب لکھنے کا عزم کر لیا۔ اور

Marfat.com

جب تک اس کتاب سے فارغ نہیں ہو گئے اور کسی شغل کی طرف دھیان نہیں دیا۔ "السیر الکبیر" آپ کی اسی دوسری کاوش کا نام ہے۔

"السیر الکبیر" کا بھی ایک نسخہ امام اوزاعی رحمہ اللہ تک پہنچ گیا۔ امام محترم نے جب اس کا مطالعہ کیا اور اس کے تمام مسائل کا جائزہ لیا تو مصنف کی جہد عظیم اور طبعِ رسا پر انگشت بدنداں رہ گئے اور فرمایا: "اگر کتاب میں جا بجا احادیث سے استناد نہ کیا گیا ہوتا تو میں کہہ اٹھتا، کہ مصنف اس علم (بین الاقوامی قانون) کا خود واضع ہے۔ اللہ تعالےٰ نے مصنف کی نگاہ کو سمتِ حق پر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ فوق کل ذی علم علیم (ہر ذی علم پر ایک بالاتر صاحبِ علم ہے)"۔

رومی قانون دانوں پر سبقت

امام محمد بن حسن شیبانیؒ دوسری صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ کے نامور شاگردوں میں سے ہیں۔ چار سال تک اپنے استاذ امام کی صحبت میں رہے ہیں اور پھر امام ابو یوسفؒ سے انہوں نے فقہ کی تکمیل کی ہے۔ امام محمدؒ کی یہ کتاب بلا اختلاف اسلام کے قانون صلح و جنگ اور تعلقاتِ خارجہ کا مایۂ ناز مرجع سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ یہ اپنے موضوع پر دنیا میں سب سے پہلی تصنیف شمار ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بین الاقوامی قانون پر کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ رومی

Marfat.com

مصنفین، جنہیں قانون کا استاذ سمجھا جاتا ہے، ان کی فہرستِ تصانیف بھی اس موضوع سے خالی ہے۔ درحقیقت سترھویں صدی سے قبل فرنگی قانون سازوں کو اس موضوع کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا۔ سترھویں صدی میں یعنی امام محمد بن حسن شیبانی کے کئی صدی بعد، گروٹیوس نے بین الاقوامی قانون پر ایک کتاب لکھی جسے اہلِ مغرب کے نزدیک دنیائے قانون میں بین الاقوامی قانون کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔

السیر الکبیر کی شرح

"السیر الکبیر" کو عالمِ وجود میں آئے ہوئے جب تقریباً تین صدیاں گزر گئیں، تو اس کتاب کی عزت و توقیر میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملتِ اسلامیہ کے ایک جلیل القدر عالم نے اس کی شرح املاء کی۔ یہ عالم شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی ہیں۔ جو اپنی اہم تصنیف "المبسوط" کی وجہ سے غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ شمس الائمہ سرخسی نے السیر الکبیر کی یہ شرح کسی دارالعلوم یا کسی کتب خانہ میں بیٹھ کر نہیں لکھی ہے بلکہ یہ انہوں نے محض اپنے حافظہ کی مدد سے قید خانے کی تاریکیوں میں املاء کرائی تھی۔

شارح کی داستان عزیمت و ابتلاء

السیر الکبیر کی شرح کا تعارف اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک شارح — شمس الائمہ سرخسی — کے حوالۂ زنداں ہونے کا پس منظر نہ معلوم ہو جائے۔ پانچویں صدی ہجری میں ماوراء النہر میں

Marfat.com

خاقان کی حکومت تھی۔ خاقان نے ایک آزاد شدہ لونڈی سے عدّت کی مدّت ختم ہونے سے پہلے ہی نکاح کر لیا۔ خاقان اس پر غیر معمولی حد تک فریفتہ ہو چکا تھا، اس لیے اسے زمانۂ عدّت کا انتظار شاق گزر رہا تھا۔ شمس الائمہ کو جب ایک شرعی حکم کی پامالی کی خبر پہنچی تو انہوں نے سلطان کی اس حرکت پر سخت گرفت کی اور اسے شریعت کی خلاف ورزی پر محمول کیا۔ خاقان نے اگر اتباع ہوٰی کا مظاہرہ کیا تھا تو ایک غیّور عالم اسے کیوں کر برداشت کر سکتا ہے۔ شمس الائمہ نے بلا خوفِ ملامت اس نکاح کے از روئے شریعت حرام ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ ہوا پرست حکمران کی طرف سے اس جرأت کا جواب یہ تھا کہ فقہ اسلامی کے اس رکن رکین اور علم و فضل کے اس بحر ذخّار کو ۱۵ سال کے لیے اوزجند کے اندھے کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔[۱] لیکن تشنگانِ علم کا رجوع امامِ موصوف کی طرف برابر جاری رہا۔ شاگردوں

---

[۱] بعض کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ خاقان نے کچھ ظالمانہ ٹیکس عوام پر عائد کر دیے تھے۔ جو ان کی استطاعت سے بڑھ کر تھے۔ شمس الائمہ سرخسی نے ان ظالمانہ ٹیکسوں کے خلاف فتویٰ دے دیا۔ جبر کی پیشانی پر شکن آ گئے۔ اور ہمدردیٔ عوام کی پاداش میں شمس الائمہ کی زندگی کا طویل اور اہم حصہ ایک حبسِ عمیق کی نذر کر دیا۔ یہ دونوں واقعات بجائے خود ثقہ روایات پر مبنی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شمس الائمہ نے یہ دونوں "جرم" کیے تھے۔ (مترجم)

Marfat.com

کا حلقہ کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ جاتا اور اندر سے امام محترم کے علم و عرفان کا بحر بے کراں موجزن ہو جاتا ہے اور جو کچھ وہ بولتے جاتے، اسے شاگرد لکھتے جاتے۔ فقہ حنفی کی جلیل القدر کتاب "المبسوط" کی پندرہ جلدیں اور السیر الکبیر کی مفصل و جامع شرح اسی قید کے زمانے کی تصنیفات ہیں۔ اللہ تعالےٰ مصنف اور شارح دونوں کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

اس لحاظ سے "السیر الکبیر" صرف جہاد بالسیف کا مضمون ہی پیش نہیں کرتی بلکہ یہ کتاب اپنے پس منظر میں جہاد بالنفس، جہاد بالعلم اور جہاد بالحق کی متعدد داستانیں بھی رکھتی ہے۔ کتاب کے الفاظ تو صرف یہ بتاتے ہیں کہ اسلامی حکومت کو بیرونی ممالک سے اور غیر مسلم رعایا سے تعلقات استوار کرنے کے لیے کن کن اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ مگر ایک طرف صاحب کتاب کی روح بین السطور میں یہ پیغام دے رہی ہے کہ جذبات کی گرمی کو آلۂ شر بنانے کے بجائے آلۂ خیر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اور دوسری طرف شارح کتاب کا زندۂ جاوید کارنامہ علمائے حق کو یہ درس دے رہا ہے کہ ایک علم بردار شریعت کی شان یہ ہونی چاہیے کہ اگر اربابِ اقتدار اللہ کی شریعت کو اپنی اھواء و خواہشات پر قربان کر رہے ہوں تو منقار زیر پر رہنے کے بجائے، حق بات کو کھلم کھلا بیان کر دینا چاہیے، خواہ اس کی پاداش میں اندھے کنوؤں کی نذر ہونا پڑے، خواہ تختۂ دار پر کھنچ جانا پڑے ؎

Marfat.com

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
حق گوئی و بے باکی اے ہمتِ مردانہ

کتاب کا قبولِ عام

"السیر الکبیر" اور اس کی شرح ہر دور میں ملتِ اسلامی کے اہتمام و شغف کا مرکز رہی ہے۔ "السیر الکبیر" جب لکھی گئی تھی تو ہارون الرشید نے اسے دیکھ کر نہ صرف اظہارِ مسرت کیا بلکہ اسے اپنے عہد کا قابلِ فخر تحفہ قرار دیا اور اپنے دونوں لڑکوں (امین اور مامون) کو اس کتاب کے سماع کے لیے امام محمدؒ کی مجلس میں حاضر ہوتے رہنے کا حکم دیا۔ بعد میں اس کتاب کو دولتِ عثمانیہ کے خلفاء نے سلطان محمود کے عہد سے ممالکِ یورپ کے خلاف اپنی طویل جنگوں میں احکامِ جہاد کی اساس اور مرجع قرار دیے رکھا اور امان و صلح کے تمام معاملات اسی کتاب کی روشنی میں طے ہوتے رہے۔ السیر الکبیر پر کچھ عرصہ ایسا بھی گزرا ہے جب کہ یہ ملتِ اسلامی کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو حیاتِ ثانیہ بخشی اور ایک مسلمان فقیہ عبدالحمید بدوی کو اس طرف راغب کیا۔ موصوف نے اس کا صحیح ترین نسخہ تلاش کرنے کے بعد اس کی اشاعت کا اہتمام کیا[1]۔ چنانچہ

---

[1] اس سے پہلے حیدرآباد کا دائرۃ المعارف اسے چار جلدوں میں چھاپ چکا ہے۔ عبدالحمید بدوی کی کوشش اس کے کئی سال بعد کی ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

اس کوشش کے نتیجے میں بین الاقوامی قانون سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ مغرب کی ایک جماعت نے بھی اپنی توجہات کو اس پر مرکوز کیا اور اس کتاب کے مطالعہ و تحقیق کے لیے گوٹنگن (جرمنی) میں مصنفِ کتاب کی نسبت سے ایک انجمن وجود میں آ گئی۔ جس کا نام "انجمن شیبانی برائے انٹرنیشنل لا" رکھا گیا اور ڈاکٹر عبدالحمید بدوی اس انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ اب عرب لیگ کے شعبہ مخطوطات کے ڈائرکٹر جناب صلاح الدین المنجد کی کوششوں سے یہ کتاب تحقیق و ترتیب کے نئے لباس میں ملبوس ہو کر اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

اس نئے ایڈیشن کی خوبی یہ ہے کہ اس کا موازنہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے مخطوطے سے بھی کر لیا گیا ہے جو اس کی شرح کا قدیم ترین مخطوطہ ہے۔ شمس الائمہ کی وفات ۴۹۰ھ میں ہوئی ہے اور مذکورہ مخطوطہ ۶۳۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ عرب لیگ اور اس کے فاضل ڈائرکٹر دونوں اس قابلِ قدر خدمت پر پوری ملتِ اسلامی کی طرف سے شکر گزاری کے مستحق ہیں۔

کتاب کے مباحث

"السیر الکبیر" میں امام محمدؒ نے جہاد و غزا، سرحدی تحفظات، امان، معاہداتِ صلح، فسخِ معاہدات کے احکام، اموالِ غنائم، جنگی قیدیوں کے احکام، مفتوح ملاقوں کے احکام، ثالثی ٹریبونل، اسلحۂ جنگ کے بارے میں شرعی ہدایات، جہاد اسلامی کے حدود و آداب اور اسی قبیل کے

Marfat.com

دوسرے سینکڑوں مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور انہیں بڑی قانونی حکمت
دقتِ نظر اور معنی خیز ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قرآن و حدیث
کے دائرے میں رہتے ہوئے فقہ کے نقطۂ نظر کو اسی اسلوب اور
مزاج کے ساتھ واضح کیا ہے جو عراقی اسکول کی خصوصیات میں سے
ہے۔

شہادت اور حقوق العباد

آغاز کتاب میں سب سے پہلے قاری جانثار راہِ حق کی
قدر و منزلت سے آگاہ ہوگا اور اسے حضرت ابو قتادہؓ کی یہ روایت
ملے گی کہ:

"ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد
فرمایا۔ اللہ کی حمد و ثناء کے بعد جہاد کا ذکر کیا اور اس میں آپؐ
نے فرائض کے ماسوا کسی چیز کو جہاد سے افضل نہ بتایا۔
ایک آدمی نے اٹھ کر عرض کی: یا رسول اللہ! اگر شخص
اللہ کی راہ میں مارا جاتا ہے کیا یہ اس کے گناہوں کا کفارہ
ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر تک
خاموش رہے۔ ہمیں خیال ہوا کہ آپؐ پر وحی نازل ہو
رہی ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "ہاں! جو شخص اللہ کی
راہ میں اس حال میں مارا گیا کہ وہ خالص اللہ کی خوشنودی
کے لیے نکلا تھا اور اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا

Marfat.com

اللہ نہ (بہ نیتِ فرار) پشت دکھائی بلکہ آگے بڑھتا رہا۔ تو اس کی شہادت تمام گناہوں کے لیے کفارہ ہو گی۔ بجز قرض کے، کیوں کہ قرض کے معاملے میں اس سے بہرحال باز پرس ہو گی۔"

شارح کتاب امام سرخسی نے مذکورہ حدیث کی، ایک دوسری مشہور حدیث سے توثیق کر دی ہے: السیف محاء للذنوب الا الدین (تلوار گناہوں کو بالکل صاف کر دیتی ہے بجز قرض کے) شریعتِ اسلامی میں حقوق العباد کی جو اہمیت اور تاکید پائی جاتی ہے، شارح ممدوح نے ایک فقیہ کے نقطۂ نظر سے اس کو مزید نمایاں کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ "شہید اتنا بڑا درجہ حاصل کرنے کے بعد بھی قرض کے متعلق اللہ کی باز پرس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت بندوں کے معاملات کو درست کرنے میں کس قدر اعتناء برتتی ہے۔"

بحری جنگ کی افضلیت

امام محمدؒ بحری جنگ کے متعلق توضیح کرتے ہیں: "دوسرے غزوات کی بہ نسبت بحری جنگ میں زیادہ اجر و ثواب پایا جاتا ہے۔" اس پر شارح رقم فرماتے ہیں: "بہ نیتِ جہاد جہاز یا کشتی پر سوار ہو جانا ہی بڑا افضل عمل ہے۔ کیوں کہ جہاد کی یہ نوعیت زیادہ کٹھن اور زیادہ خطرناک ہے۔ اس صورت میں مجاہد سمندر میں داخل ہوتے ہی اپنی

Marfat.com

جان کو مرضی الٰہی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس لیے گناہوں کے کفارہ میں شہید کو جو درجہ حاصل ہوتا ہے وہ بحری مجاہد کو محض سمندر میں داخل ہونے سے مل جاتا ہے۔" چونکہ جہاد کی خاطر بحری سفر کا جواز ثابت ہے۔ اس لیے شارح حج اور تجارت کی خاطر بھی اس سفر کو جائز قرار دیتے ہیں۔

جنگ میں معمّر لوگوں کے ساتھ سلوک کی نوعیت

جنگ میں معمّر لوگوں کو قتل کرنے کے متعلق امام محمدؒ یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ اگر وہ خود برسرِ پیکار نہ ہوں یا وہ جنگ کے بارے میں اپنی فکر و رائے سے مدد نہ دیتے ہوں تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اگر وہ خود تلوار لے کر نکلیں یا جنگ میں مددگار ہوں تو انہیں قتل کیا جائیگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درید بن صمّہ کے ساتھ یہی برتاؤ کیا تھا۔ یہ شخص بوڑھا کھوسٹ تھا، لیکن جنگ کا پرزور حامی تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کر دینے کا حکم دے دیا تھا۔

دراصل محاربِ دشمن کی طویل العمری اور اس کے حق میں رحم طلب جذبات سے قطع نظر شریعت نے اسلام اور مسلمانوں کی مجموعی مصلحت کو مقدّم رکھا ہے۔ ظاہر ہے "اسلامی ریاست" کی بہبود و فلاح ہر دوسری چیز پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس لیے فقہ اسلامی کے عراقی اسکول کی نگاہ میں مصلحت عامہ کو مصلحت خاصہ پر ترجیح حاصل ہے۔ امام محمد نے اپنی مذکورہ بالا رائے میں اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔ دشمن کے کھیتوں،

Marfat.com

نخلستانوں اور تاکستانوں کو کاٹنے کے بارے میں بھی عراقی اسکول یہ رائے رکھتا ہے۔ اس سے اس اسکول کی فقہی بصیرت کے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ مثلاً امام اوزاعی، جو اصحاب ظواہر میں سے ہیں۔ نص ظاہری سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے دارالحرب کے اندر کوئی ایسا کام کرنا جائز نہیں ہے جو تخریب کی تعریف میں آتا ہو۔ اس لیے کہ تخریب فساد ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن عراقی اسکول کے جلیل القدر نمائندے امام سرخسی اسے جائز قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: جب اسلام نے دشمنوں کا زور توڑنے کے لیے قتل نفوس تک کی اجازت دی ہے، حالانکہ نفوسِ انسانی سے بڑھ کر کوئی چیز محترم نہیں ہے۔ تو اُن سے کمتر اشیاء مثلاً عمارات کو مسمار کرنا اور درختوں کو اکھاڑنا تو بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

جنگ کے آداب و احکام

اسلام نے مصلحتِ عمومی کے تحت ہی دورانِ جنگ بآواز بلند پکارنا مکروہ قرار دیا ہے الّا یہ کہ بلند آہنگی خود لشکرِ اسلام کے لیے مفید اور ولولہ انگیز ثابت ہو رہی ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مواقع پر آواز بلند کرنے کو ناپسند فرمایا ہے: ایک تلاوتِ قرآن کے وقت، دوسرے جنائز میں اور تیسرے دشمن پر حملہ کرتے وقت۔ لیکن بایں ہمہ آپؐ خود مقابلۂ دشمن کے وقت حضرت ابودجانہ کو برانگیختہ کیا کرتے تھے کہ وہ اپنی گرجدار اور پُرہیبت آواز کو بلند کریں۔ آپؐ فرمایا کرتے

Marfat.com

لکھتے : "جنگ میں ابودجانہ کی آواز پورے دستے کا کام دیتی ہے"

امام محمد جنگ کے دوران "قتلِ خطا" اور "قتلِ خطانما" کا نہایت باریک اور لطیف فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں : اگر رات کے وقت مسلمان فوج کے دو دستے باہم متصادم ہو گئے۔ دونوں میں سے ہر ایک نے فریقِ مقابل کو مشرکوں کا دستہ سمجھا، چنانچہ انہوں نے آپس میں تلوار چلائی اور کچھ لوگ قتل ہو گئے۔ پھر انہیں حقیقتِ حال کا علم ہو گیا تو ایسی صورت میں مقتولین کے سلسلہ میں ان پر کوئی دیت اور کفارہ نہ ہوگا۔ امام موصوف نے اپنی اس رائے کی بنیاد حضرت جابر بن عبداللہ کی اس روایت پر قائم کی ہے :

"غزوۂ خندق میں ایک مرتبہ رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر میں سے دو دستے گردش کے لیے نکلے اور رات کی تاریکی میں دونوں کی آپس میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان میں سے ایک دوسرے کو بالکل نہ پہچان سکا بلکہ ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ فریقِ مقابل دشمن گروہ میں سے ہے۔ اس تصادم میں کچھ زخمی ہو گئے اور کچھ مارے گئے۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے اسلامی شعار کا نعرہ مارا تو دونوں فریق یکایک لڑائی سے رک گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا :

Marfat.com

"تمہارے زخم اللہ کی راہ میں ہیں اور جو تم میں سے مارے گئے وہ شہید ہیں۔"

البتہ اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ مشرکین سے برسرِ پیکار تھا اور ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو مشرک سمجھ کر قتل کر دیا، یا اس نے تیر پھینکا مگر وہ مشرک کو نہ لگا بلکہ کسی مسلمان کو جا پیوست ہوا اور وہ مر گیا تو اس صورت میں اس شخص پر دیت بھی ہوگی اور کفارہ بھی۔ ان دونوں حالتوں میں نہایت باریک فرق ہے۔ امام سرخسی اسی باریک فرق کو یوں بے نقاب کرتے ہیں کہ پہلی حالت میں "مسلمانوں کے دونوں دستوں میں سے ہر ایک نے اپنی جائز مدافعت کی۔ بیشک ان میں سے ہر ایک دستہ دوسرے دستے کو حملہ آور سمجھتا تھا اور خود اپنی مدافعت میں لڑ رہا تھا۔ اس مدافعت کا وہ شرعاً مکلف ہے۔ لہذا یہ مدافعانہ کارروائی موجبِ دیت و کفارہ نہ ہوگی۔ دوسری حالت میں یہ قتل خطاء کی واضح صورت ہے۔ اور قتلِ خطا میں دیت و کفارہ بروئے نص واجب ہے۔"

مسلمان مجاہدین کو میدانِ جنگ میں بعض ایسی مشکلات پیش آجاتی ہیں جن کے بارے میں اس جامع کتاب کے اندر اطمینان بخش حل اور واضح جواب مل جاتا ہے۔ مسلمان سپاہی دشمن فوج کے متقتولین کے سر کاٹ کر اپنے افسروں اور حکمرانوں کے پاس اگر لائیں تو کیا شرعاً یہ درست ہوگا؟ امام محمدؒ نے اس قضیہ پر روشنی ڈالتے

Marfat.com

ہوئے عقبہ بن عامر جُہنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ذکر کیا ہے۔ عقبہ بن عامر ایک غزوے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس "نیاق البطریق" کا سر کاٹ لائے۔ آپ نے اسے سخت ناپسند کیا۔ عرض کیا گیا کہ: "اے خلیفۂ رسول! یہ لوگ ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے ہیں۔" خلیفۂ اوّل نے فرمایا: "کیا ہم بھی فارس و روم کے ڈگر پر چلنا شروع کر دیں؟ آئندہ میرے پاس کسی کا سر نہ لایا جائے۔ صرف خط لکھ دینا اور خبر بھیج دینا کافی ہے۔" دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "یہ تم لوگوں نے زیادتی کی ہے اور اپنی حد سے صریح تجاوز کیا ہے۔" شارح ممدوح اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ "بعض علماء نے خلیفہ اوّل کے ظاہری الفاظ سے تمسک کیا ہے اور کہا ہے کہ دشمنوں کے سر کاٹ کر حکّام کو پیش کرنا حلال نہیں ہے۔ کیونکہ یہ مُثلہ ہے اور میت کو سڑاند سے بچانے کے لیے فوراً دفن کر دینا چاہیے۔ نیز سروں کا کاٹنا مُثلہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے مُثلہ سے منع فرمایا ہے خواہ وہ باؤلے کتّے کی لاش ہی کیوں نہ ہو۔ نیز حضرت ابوبکرؓ کی وضاحت سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ یہ جاہلیّت کا فعل ہے اور فارس و روم کے طریقہ کی پیروی ہے۔" لیکن شارح ممدوح خود اپنی اور اپنے ہم مسلک علماء کی رائے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ہمارے اکثر مشائخ رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مقتول مشرکین کا کوئی بڑا سرغنہ ہو یا ان کا کوئی سرکردہ جنگ آزما ہو

Marfat.com

اور اس کا سر کاٹ کر لانے میں مشرکین کو آتشِ غیظ میں جلانا یا اہلِ اسلام کے دلوں کو ٹھنڈا کرنا مقصود ہو تو ایسی صورت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام سرخسی اس مسلک کا استدلال ابوجہل کے واقعہ سے کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود غزوۂ بدر میں اس ہٹ دھرم مشرک کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور آپؐ کے سامنے لاکر ڈال دیا اور عرض کیا: یہ آپؐ کے دشمن ابوجہل کا سر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: "اللہ اکبر، یہ میرا فرعون اور میری امت کا فرعون تھا۔ اس کی شر انگیزی مجھ پر اور میری امت پر موسیٰؑ اور ان کی امت پر فرعونِ مصر کی شر انگیزی سے زیادہ تھی۔" الغرض آپؐ نے نہ اس فعل سے منع فرمایا اور نہ ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

جنگی تدابیر

اسلحہ اور شہسواری کے باب میں امام محمد اور امام سرخسی نے ایسا کوئی پہلو ترک نہیں کیا جو اس موضوع سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں حضرات نے اس موضوع کو زیادہ سے زیادہ جامع اور کامل بنانے کی کوشش کی ہے۔ صاحب "السیر الکبیر" روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اہلِ لشکر کو لکھا کہ "دشمن کی سرزمین میں اپنے ناخنوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھاؤ۔ یہ بھی ایک ہتھیار ہے۔ اگرچہ ناخن ان روانا سنِ فطرت میں سے ہے لیکن دارالحرب

Marfat.com

میں مجاہدین کے لیے ان کا بڑھانا مستحب ہے۔" شارح سرخسی نے جنگ میں ناخن بڑھانے کی حکمت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے: "جب کسی مسلمان سپاہی کے ہاتھ سے ہتھیار گر جائے اور دشمن سر پر آپہنچے تو مسلمان سپاہی ناخنوں کی مدد سے اپنی مدافعت کر سکتا ہے۔ یہ وہی صورت ہے جو مونچھوں کے بارے میں اختیار کی جاتی ہے۔ مونچھیں کترانا سنت ہے لیکن غازی کے لیے دارالحرب میں مونچھوں کو بڑھانا مستحب ہے تاکہ دشمن کے دل اس سے خوفزدہ ہوں اور مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو۔" موجودہ دور میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور میدانِ جنگ کے اندر ہر ملک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے سپاہی ایسی ہیئت میں نمودار ہوں کہ انہیں دیکھ کر دشمن کے دل مرعوب و مغلوب ہوں۔ لیکن فوج کے وہ یونٹ جو برسرِ جنگ نہیں ہوتے ان میں یہ تدبیر اختیار نہیں کی جاتی بلکہ انہیں نفاست اور صفائی کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔ امام محمد اور امام سرخسی کے بیانات سے ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ ہر وہ اسلحہ جو جنگ میں فوج کے لیے باعثِ نصرت ہو سکتا ہو اس کا استعمال ضروری ہے خواہ وہ فطری ذوق کے خلاف ہو۔ ناخن کاٹنا فطرتِ سلیم کا تقاضا ہے لیکن جنگی استعمال کے لیے ان کو بڑھانا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

جنگ میں وہ امور بھی جائز ہو جاتے ہیں جو عام حالات میں جائز نہیں ہوتے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے:

Marfat.com

"جنگ ایک چال ہے" امام سرخسی نے اس ارشاد نبوی ؐ پر مفصل کلام کیا ہے۔ موصوف اس سے استدلال کرتے ہیں کہ "مجاہد اگر ہنگام قتال اپنے حریف کو دھوکہ دیتا ہے تو اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اور نہ ایسی کوئی چال غدّاری شمار ہوگی۔ بعض علماء مذکورہ حدیث کے ظاہری الفاظ کی بنا پر کہتے ہیں: قتال میں جھوٹ بولنے کی بھی اجازت ہے۔ ان کا مزید استدلال یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جھوٹ بولنا درست نہیں ہے مگر تین صورتوں میں: دو آدمیوں میں صلح کرانے کے لیے، قتال کے وقت اور مرد کو اپنی بیوی کو راضی کرنے کے لیے۔" لیکن ہمارا مسلک یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کذب سے مراد کذب محض نہیں ہے۔ کیونکہ کذب محض کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے بلکہ آپ ؐ کی مراد توریہ (ذو معنی کلام کا استعمال) ہے۔ اس کی نظیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کذبات ثلاثہ والی حدیث میں ملتی ہے۔ اس حدیث میں بھی کذبات سے مراد توریہ ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کذب محض کے ارتکاب سے پاک ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ ذو معنی کلام سے انسان کذب محض کے ارتکاب سے بچ جاتا ہے۔"

امام محمد نے جنگی چالوں کا مفصل جائزہ لیتے وقت اپنے حیرت انگیز تخلیقی ذہن کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً وہ بتاتے ہیں کہ ایک جنگی چال

Marfat.com

یہ بھی ہے کہ مجاہد اپنے مبارز سے کسی ایسی بات کا ذکر کرے جو امر واقع نہ ہو۔ یعنی زبان پہ کچھ اور ہو اور دل میں کچھ اور۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غزوۂ خندق میں کیا تھا۔ حضرت علیؓ کو جب عمرو بن عبدوُدّ نے دعوتِ مبارزت دی تو حضرت علیؓ نے کہا: کیا تو نے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تو میرے مقابلے کے لیے اپنے سوا کسی اور سے مدد طلب نہیں کرے گا؟ یہ کون لوگ ہیں جنھیں تو بُلا لایا ہے؟" عمرو بن عبدوُدّ نے حیران ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو حضرت علیؓ نے یکایک اس کی پنڈلیوں پر تلوار کا وار کیا اور اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ کر رکھ دیں۔ حضرت علیؓ کی یہ نہایت کامیاب چال تھی۔ اور اُسی قبیل سے تھی جو جنگوں کے اندر جائز ہُوا کرتی ہے۔ امام محمد نے اس نوعیت کی مثالوں کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ مرتب کر دیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "یہ جنگی حربے ہیں ان کے استعمال میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔"

مخادعت اور دھوکہ دہی کا طریقہ دورانِ جنگ میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور خاتمہ پر بھی۔ لیکن اگر معاملہ امان تک پہنچ جائے تو مسلمان سپاہ اپنے معاہدے پر کاربند رہنے کی مکلّف ہے۔ اور اگر امام مسلمین کسی دشمن قوم کو امان دے دیتا ہے اور پھر اُسے امان منسوخ کر دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ دشمن کو اطلاع دے کر ہی امان کو منسوخ کر سکتا ہے۔ نیز اگر امان کی مہلت گزر جائے تو مسلمانوں کو اختیار ہے چاہے وہ اس کی تجدید کر دیں اور چاہے منسوخ کر دیں۔

Marfat.com

مصنف رحمہ اللہ نے امان کے باب میں جن طرفہ واقعات کو بیان کیا ہے ان میں سے ایک ہرمزان فارسی جسے مسلمانوں نے گرفتار کر لیا تھا، کا مکالمہ ہے۔ ہرمزان کو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تو حضرت عمرؓ نے ہرمزان سے کہا: "اب کہو کیا کہتے ہو"۔ ہرمزان نے پوچھا: "کیا زندہ انسان کی سی بات چیت کروں یا مردہ کی سی؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "زندوں کی سی بات چیت کرو"۔ ہرمزان بولا: "ہم اور تم دونوں جاہلیت کی گود میں تھے۔ نہ ہمارا کوئی دین تھا اور نہ تمہارا۔ ہم لوگ تم عربوں کو کتوں کے برابر سمجھا کرتے تھے۔ جب اللہ نے تمہیں دین سے سرفراز کیا اور تمہارے اندر ایک رسول کو مبعوث کیا تو ہم نے تمہاری اطاعت سے انکار کیا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا: "کیا تو ہمارے ہاتھوں میں اسیر ہو کر بھی ایسی باتیں کرتا ہے؟" پھر آپ نے حکم دیا: "اس کی گردن اڑا دو"۔ ہرمزان بول اٹھا: "کیا تمہارے نبیؐ کی یہی تعلیم ہے کہ تم پہلے ایک اسیر کو پناہ دے دو اور پھر اس کو قتل کر ڈالو؟" حضرت عمرؓ نے کہا: "میں نے کب تجھے امان دی ہے؟" ہرمزان نے بتایا: "آپ نے مجھے کہا کہ زندہ انسان کی طرح بات چیت کرو۔ مگر جسے جان کی امان نہ ہو وہ تو زندوں میں شمار ہی نہیں ہوتا"۔ اس پر حضرت عمرؓ فوراً متنبہ ہوئے اور کہنے لگے: "اس پر خدا کی مار، اس نے ہم سے امان حاصل کر لی اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوئی"۔

Marfat.com

علیٰ ہذا القیاس یہ کتاب تمام بین الاقوامی مسائل و قوانین کا ایک نہایت جامع اور حکمت آمیز دفتر ہے۔ اس کا تازہ ایڈیشن ان تمام اغلاط سے پاک ہے جو آج سے ۴۴ سال قبل حیدر آباد سے شائع ہونے والے ایڈیشن میں پائی جاتی ہیں۔

(ترجمان القرآن: اگست ۶۲ء)



Marfat.com

ہے
چیت
ہوتا۔" اس
خدا کی مار، اس
نہیں ہوئی۔"

Marfat.com

استاذ مصطفیٰ احمد زرقاء :

شام کے ممتاز عالم ہیں۔ اسلامی قانون وفقہ کا نہایت گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ آپ نے علوم شریعت کی تکمیل ازہر سے کی۔ فواد یونیورسٹی (مصر) سے الٰہیات اور کلاسیکل لٹریچر میں ڈپلوما حاصل کیا۔ عثمانی دور کے سول لا میں درجۂ اختصاص حاصل ہے، بلکہ اس میدان میں دنیائے اسلام کی واحد مثال ہیں۔

آج کل آپ شام یونیورسٹی کے لا کالج اور شریعت کالج میں اسلامی قانون اور سول لا کے پروفیسر ہیں۔

زرقاء کئی مرتبہ شام پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہو چکے ہیں اور بارہا وزارت قانون اوراوقاف پر فائز ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کی یہ مصروفیات تعلیمی وتدریسی فرائض میں حائل نہیں ہوئیں۔

۱۹۸۰ء میں پیرس یونیورسٹی میں انٹرنیشنل اکیڈیمی آف لا کے زیر اہتمام "ہفتہ قانون اسلامی" کے نام سے جو مذاکرہ

Marfat.com

منعقد ہوا تھا، موصوف اس میں شام یونیورسٹی کے نمایندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں امریکہ کے اسلامی کلوکیم اور ۱۹۵۸ء میں لاہور کے بین الاقوامی اسلامی کلوکیم میں شریک ہوئے اور اسلامی محاذ کی پُرزور نمایندگی کی۔

اسلامی قانون پر آپ نے غیر معمولی تحقیقی کام کیا ہے۔ اور بڑی جانفشانی سے اسلامی قانون کو جدید قانونی نظام کے سانچے میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی مندرجہ تصانیف دنیائے اسلام میں بڑی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں:

۱۔ المدخل الفقہی العام، ۲ اجزاء

۲۔ المدخل الی نظریۃ الالتزام فی الفقہ الاسلامی

۳۔ العقود فی الفقہ الاسلامی

۴۔ احکام الاوقاف

۵۔ شرح القانون المدنی السوری (نظریۃ الالتزام العامہ)

۶۔ شرح القانون المدنی السوری (نظریۃ العقد)

Marfat.com

اسلام کا نظامِ تعزیر

تعزیر کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

لغوی لحاظ سے تعزیر کے معنی ہیں: باز رکھنا۔ تہذیب و شرافت سے بہرہ مند کرنا۔ یہ لفظ مدد اور نصرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (جو لوگ رسول پر ایمان لائے اور اس کی مدد و نصرت کی اور اس نور کی اتباع کی جو اس پر نازل کیا گیا ہے۔ یہی لوگ درحقیقت فلاح پانے والے ہیں۔) تعزیر میں مدد اور نصرت کا مفہوم بھی اس لیے شامل ہے کہ اس میں دشمن کے انسداد اور استیصال کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اصطلاحِ فقہ میں تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جو قانون میں بلحاظ مقدار و نوعیت بالکل مقرر نہ کر دی گئی ہو، بلکہ جس میں عدالت حالاتِ مقدمہ کے لحاظ سے کمی بیشی کر سکتی ہو۔

یہ سزا حدود و قصاص کے مقدمات کے ماسوا تمام ایسے جرائم اور افعالِ ممنوعہ کے ارتکاب پر دی جا سکتی ہے، جو مرتکب جرم کو زجر و توبیخ

Marfat.com

کرنے اور آئندہ اُسے جرم سے باز رکھنے کا تقاضا کرتے ہوں۔

تعزیر کو اختیاری سزا بنانے کی مصلحت

تعزیر کی نوعیت و مقدار کا تعین اربابِ قضا کو سونپ دینے میں مصلحتِ شرعی یہ ہے کہ جرائم اپنی اشکال و اقسام کے لحاظ سے غیر محدود ہیں۔ اور بسا اوقات ان کی ایسی نرالی قسمیں سامنے آتی رہتی ہیں جن کا پہلے وجود نہیں ہوتا بلکہ کبھی ایک ہی جرم نو بہ نو لبادے اوڑھ کر اور گوناگوں ہتھکنڈے اختیار کر کے سامنے آتا ہے، جس کے انسداد اور بیخ کنی کے لیے ایک ہی نوعیت کی تدابیر کارگر نہیں ہو سکتیں بلکہ دوسرے مؤثر طریقوں کو بھی بروئے عمل لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ شریعتِ اسلامی نے اپنی گہری حکمتِ عملی کے پیشِ نظر معروف اور نمایاں جرائم کی دو اقسام، جو براہِ راست اسلام کے اہتمامی نظام کی بنیادوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ازروئے نص متعین کر کے ان کی سزائیں مقرر کر دی ہیں۔ اور ان کے علاوہ تمام جرائم کے استیصال و بندش کے لیے سزاؤں کی نوعیت اور مقدار کے اختیارات عام اربابِ امر کو تفویض کر دیے ہیں تاکہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق زمان و مکان کے اختلاف، افراد کی حیثیات اور معاشرے کی تہذیبی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر جرم کی مناسب سزا مقرر کرنے میں آزاد رہیں۔ بعض لوگوں کو معمولی گوشمالی اور انتباہ ہی راہِ راست پر لے آتا ہے۔ اور بعض موٹی کھال کے مجرم شدید عقوبت کا مزہ چکھے بغیر جرم سے دست کش ہونے پر رضامند نہیں

Marfat.com

ہوتے۔ طبیعتوں کے اسی تفاوت اور اثر پذیری کے فرق کی بنا پر شریعت حاکم کو اس امر کا مجاز ٹھہراتی ہے کہ وہ ایک ہی نوعیت کے فعل پر مختلف سزائیں نافذ کر سکتا ہے۔

حاکم اور قاضی مجرم کے لیے تعزیر کی جو صورت بھی تجویز کریں، اُس میں اپنے سامنے یہ اصول رکھیں کہ وہ شرعی سزاؤں سے مناسبت رکھتی ہو۔ یعنی ان میں انسانوں کو عذاب دینے اور وحشیانہ ایذا پہنچانے کا تصور نہ شامل ہو۔ بلکہ محض ان کو مؤدب و مہذب بنانے اور ان کی سرکشی کو روکنے کا مقصد پیشِ نظر ہو۔ جیسے تازیانے لگانا، قید کر دینا، جلا وطن کر دینا، مالی جرمانہ عائد کر دینا[1]، حتیٰ کہ اگر قاضی جرم کی شدت کے پیشِ نظر موت

---

[1] مالی تاوان عائد کرنے کی سزا پر فقہاء میں شروع سے اختلاف چلا آتا ہے کیوں کہ اس سزا میں اس امر کا شدید اندیشہ ہے کہ ظالم حکام لوگوں کے اموال پر دست درازیاں شروع کر دیں اور جرمانوں کے نام سے لوگوں کے مال وصول کر کے خود ہڑپ کرنے لگیں۔

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ جرمانے کی سزا کو جائز ٹھہراتے ہیں۔

فقہائے شافعیہ میں سے محمد بن محمد القرشی المعروف بابن الاخوۃ نے امام شافعیؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک بعض بُرے افعال کے ارتکاب پر معیّن مالی جرمانہ واجب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اونٹوں کی زکوٰۃ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ چالیس

(باقی صفحہ ۲۹۸ پر دیکھیے)

Marfat.com

کی سزا بھی دینا چاہے تو اُسے اختیار حاصل ہے۔

(بقیہ ص ۲۹۷) :-

اونٹوں پر ایک بنتِ لبون یعنی اونٹ کا پورے دو سال کا مادہ بچہ دیا جائے۔ جو شخص یہ حق رضامندی سے ادا کر دے اُسے اللہ کے ہاں اجر ملے گا اور جو اس حق کو روکے گا، اس سے بیں وصول کر کے چھوڑوں گا (اور اس وصولی کی شکل یہ ہوگی کہ) اُس کے مال کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جائے گا اور (جرمانہ کے طور پر) اس کے اچھے حصّے سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ یہ ہمارے پروردگار ہی کا فیصلہ ہے۔ محمدؐ کی اولاد کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔"

امام شافعیؒ کا یہ مسلک ابن الاخوۃ نے اپنی کتاب "معالم القربتہ فی احکام الحسبتہ" میں بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر جتنی کتابیں تالیف کی گئی ہیں ان سب میں جامع کتاب یہی ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ نے اسے ستر ابواب میں منقسم کیا ہے۔ اس کتاب کو حال ہی میں مستشرق روبن لیس نے کیمرج کے مطبع دارالفنون سے طبع کرا کر شائع کیا ہے۔ اور انگریزی زبان میں اس پر ایک نفیس اور پُر مغز مقدمہ بھی لکھا ہے۔

اس سلسلے میں میرا (یعنی مقالہ نگار کا) خیال یہ ہے کہ فقہائے متقدمین نے جس اندیشہ کی بنا پر مالی جرمانے عائد کرنے میں اپنے اختلافات کا اظہار کیا ہے وہ اندیشہ اب باقی نہیں رہا ہے۔ آج کل عدالتوں میں ایسے جرمانوں کا باقاعدہ سرکاری کاغذات میں اندراج ہوتا ہے۔ ارباب قضا کے ہاتھ میں

(۳۰)

Marfat.com

تعزیر کے مراتب

فقہائے حنفیہ کے نزدیک تعزیر کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ قاضی یا حاکم مجرم کی طرف ایک بار غضب آلود نگاہوں سے دیکھ لے۔ یا اُسے مخاطب ہو کر یہ کہے: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو نے فلاں حرکت کی ہے۔" یہ سزا اُس وقت اختیار کی جائے گی جب کہ جرم معمولی درجے کی لغزش شمار ہوتا ہو اور اس کا مرتکب، شرفاء اور اہلِ مروّت طبقے سے تعلق رکھتا ہو کیوں کہ ایسے لوگوں کے لیے اتنی سی سزا بھی کافی اثر رکھتی ہے۔ تعزیر کا آخری درجہ سزائے موت ہے۔ جب کہ جرم نہایت سنگین ہو، قومی و اجتماعی پہلو سے گہرے اثرات رکھتا ہو اور سوسائٹی کے اندر سے اُس کے رواج کو روکنا زیادہ سے زیادہ شدت کا مقتضی ہو۔ فقہائے حنفیہ کا یہی مسلک معمول بہ چلا آرہا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک بار فرمایا تھا: "لوگوں میں جس قدر قباحتیں اور برائیاں رونما ہوں گی اُسی قدر فیصلوں کی نئی نئی شکلیں پیدا ہوتی رہیں گی۔"[1] اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے

---

(۲) جانے کے بجائے وہ براہ راست سرکاری خزانے میں جمع ہوتے ہیں اور پھر اُن کا متواتر سرکاری آڈٹ ہوتا رہتا ہے۔

[1] حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول علاؤالدین طرابلسی حنفی نے اپنی مشہور کتاب "معین الحکام" جزء سوم ص ۲۱۰ میں نقل کیا ہے۔ اسی سے ملتے جلتے الفاظ زیادہ سے بھی اُس کے ایک خطبے میں ماثور ہیں۔

Marfat.com

اپنے دورِ خلافت میں مجرموں کو قید میں رکھنے کے لیے جیلوں کا نظام جاری کیا تھا۔

امام ابوالحسن الماوردی الشافعی نے "الاحکام السلطانیہ" میں بعض مجتہدین اور اصحابِ مذہب کے اقوال و آراء نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ اجتہاد نے بعض جرائم میں اُن کی نرمی اور سنگینی کے لحاظ سے سزاؤں کی مقداریں اور درجے متعین کیے ہیں۔ امام ماوردی نے ان تمام اقوال و مسالک کو بیان کر کے تصریح کر دی ہے کہ "اگرچہ بظاہر سزاؤں کی تعیین اور ترتیب مستحسن معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی بنیاد کسی دلیل پر قائم نہیں ہے"۔ یعنی فقہاء اور مجتہدین کی طرف سے بعض تعزیرات کی مقدار اور نوعیت کا تعین کر دینا واجب الاختیار نہیں ہے اور نہ یہ کسی اصل شرعی سے ماخوذ ہے۔ بلکہ اس کا حد سے حد اگر کوئی فائدہ ہے تو صرف یہ ہے کہ اس سے حکام اور اربابِ قضا کو رہنمائی مل سکتی ہے۔ باقی رہا سزاؤں کی تجدید و ترتیب کا حق، تو وہ شریعت نے کسی ایک شخص یا اشخاص کے لیے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ یہ علی الاطلاق اربابِ امر کو حاصل ہے اور وہ اس میں وقتی و ملکی مصالح کے مطابق حسبِ ضرورت اضافہ و ترمیم کے مجاز ہیں۔

البتہ تازیانہ لگانے کی آخری سزا شریعت نے متعیّن کر دی ہے۔ اس سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ فقہاء کا فیصلہ ہے کہ تازیانے لگانے میں اس مقدار تک پہنچ جانا جائز نہیں جو اقل الحدود (چھوٹی سے

Marfat.com

چھوٹی حد) کے برابر ہو جائے۔ بلکہ ایک دو کوڑوں کی کمی رکھنا بہتر ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی حد چالیس کوڑے ہے جو غلام پر قذف یا شراب نوشی کے جرم میں نافذ ہوتی ہے اور آزاد کی نصف سزا کے برابر ہے۔ فقہاء کے اس خیال کا ماخذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ: من بلغ حدًا فی غیر حد، فھو من المعتدین (جس نے حد مارنے کے جرموں کے علاوہ کسی دوسرے جرم میں اتنی سزا دی کہ وہ حد تک پہنچ گئی، تو وہ زیادتی کرنے والوں میں سے ہے)۔ تازیانہ کی سزا کو اگر سنگین کرنا مقصود ہو تو اسے کوڑوں میں اضافہ کرنے کے بجائے دوسری سزاؤں مثلاً حبس اور جرمانے کی سزا سے شدید کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ تعزیر کو حد سے بڑھا دینے اور شدید کر دینے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں بشرطیکہ ضرورت، مجرم کی سخت سرکوبی اور استیصال کا تقاضا کر رہی ہو۔ اس بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا استدلال معن بن زائدہ والی روایت سے ہے، جس میں آتا ہے کہ معن بن زائدہ نے بیت المال کی جعلی مہر بنا کر بیت المال کے محافظ سے کچھ مال وصول کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے معن بن زائدہ کو سو کوڑے مارے اور قید کی سزا دی۔ اس نے دوسری بار پھر یہی حرکت کی۔ حضرت عمرؓ نے پھر اسے سو کوڑے کی سزا دی۔ تیسری بار پھر وہ اسی جرم میں ملوث ہوا تو حضرت عمرؓ نے اسے سو کوڑوں کی سزا کے علاوہ ملک بدر کر دیا۔

Marfat.com

مستوجبِ تعزیر ہونے کا ضابطہ

بلاشبہ تعزیر بہ تقاضائے مصلحت حکام وقضاۃ کی صوابدید پر موقوف کردی گئی ہے، اور اس میں از روئے نص کوئی مقدار یا نوعیت ثابت نہیں ہے۔ لیکن سببِ سزا کی تحدید یعنی کیفیتِ جرم کی تشخیص جو کسی فرد کو مستوجبِ تعزیر ٹھہراتی ہے، لازمی ہے۔ فقہائے امت نے اس بارے میں پوری چھان بین اور غور و فکر کے بعد ایک عام ضابطہ مقرر کر دیا ہے جو ذیل میں درج ہے:

الضابط ان کل من ارتکب منکرًا او اذیٰ غیرہ بغیر حق بقول او فعل او اشارۃ یلزمہ التعزیر۔

اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ جو شخص فعلِ منکر کا مرتکب ہوتا ہے یا کسی دوسرے کو ناحق اپنی زبان سے یا عمل سے یا اشارہ و کنایہ سے ایذا دیتا ہے، اُس پر تعزیر لازم ہے۔

اسی عمومی ضابطے کے تحت وہ تمام جرائم آجاتے ہیں جو ملکی نظام میں اور پُرامن سوسائٹی میں رخنہ اندازی اور فساد انگیزی کا موجب ہوتے ہیں۔ خواہ وہ انسانوں کی باہم ایک دوسرے کی جانوں اور مالوں پر تعدّی ہو، اور مار پیٹ، سب و شتم، دہشت انگیزی، ڈرانا دھمکانا، فریب دہی، جعل سازی، جھوٹی گواہی، اشیاء میں ملاوٹ کا کاروبار، غلّ و غش اور چالبازی اور نوسر بازی کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہوں۔ خواہ وہ مذہبی شعائر کی توہین اور علانیہ ارتکابِ معصیت، اور اشاعتِ منکرات ہو جیسے رمضان

Marfat.com

المبارک میں سرِ بازار خورد و نوش کی جسارت، مذہب کا مذاق اور زندقہ و فجور کی ترغیب اور شہری آداب و قواعد (Public Morality) کی خلاف ورزی اور بے حرمتی وغیرہ۔

مذہبی فرائض سے بے پروائی اور تغافل برتنا، بالخصوص تعلیم و تعلّم میں کوتاہی کا ارتکاب کرنا بھی افعالِ منکرہ کی فہرست میں داخل ہے۔ اگر کوئی صاحبِ علم دوسروں کو علم سکھانے کا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے یا بے علم دینی علم کی ضروری مقدار کے حصول میں بھی تکاسل برتتا ہے تو یہ دونوں شریعت کی نگاہ میں مستحقِ تعزیر ہیں[1]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: "طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلمٍ"۔ علم حاصل کرنا

---

[1] حافظ منذریؒ مؤلف مختصر سنن ابی داؤد نے "الترغیب والترہیب" میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا۔ اس میں آپؐ نے پہلے مسلمانوں کے ایک گروہ کی ستائش کی اور پھر دوسرے گروہ کو مخاطب ہو کر فرمایا: "ان لوگوں پر کیا افتاد پڑی ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کو نہ دینی امور کی تعلیم دیتے ہیں، نہ وعظ و نصیحت کرتے ہیں، نہ ان کو نیکیوں کی تلقین کرتے ہیں نہ برائیوں سے ٹوکتے ہیں۔ اور نہ خود ہمسایوں کو یہ خیال آتا ہے کہ وہ از خود اپنے عالم ہمسایوں کی طرف رجوع کریں۔ ان سے علم سیکھیں، دین میں تفقہ حاصل کریں۔ وعظ و نصیحت سنیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ لوگوں کو اپنے ہمسایوں کو دین سکھانا چاہیے، دینی امور میں انہیں تفقہ سے بہرہ مند کرنا چاہیے۔ امر بالمعروف

(باقی صفحہ ۳۰۴ پر دیکھیے)

Marfat.com

ہر مسلمان پر فرض ہے۔)

(بقیہ صـ۳۰۳) :-

اور نہی عن المنکر کرتے رہنا چاہیے - اور اُدھر خود لوگوں کو بھی اپنے ہمسایوں سے علم حاصل کرنا چاہیے اور اپنے اندر فہم و فقاہت پیدا کرنا چاہیے۔ اگر ان باتوں کی پابندی نہ کی گئی تو میں ان سب کو دنیا میں بہت جلد سزا دوں گا۔" آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو سُن کر کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور پوچھنے لگے: یا رسول اللہ! آپ کے مخاطب کون لوگ ہیں؟ صحابہ ہی میں سے کچھ لوگوں نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے سخن اشعری قبیلہ کی طرف ہے۔ اس قبیلے کے لوگ خود تو صاحب علم و بصیرت ہیں مگر اُن کے پڑوسی اُسی طرح بدّو اور کندہ ناتراش ہیں۔ اشعریوں کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبے کی خبر ملی تو وہ فوراً آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ نے دوسرے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے اور ہماری مذمت کی ہے، ہم سے کیا سرزد ہوا ہے۔ جواب میں آپؐ نے اپنی سابقہ تہدید کا اعادہ فرمایا۔ وہ کہنے لگے: کیا ہم اپنے سے علاوہ لوگوں کو بھی سوجھ بوجھ والا بنا دیں۔ آپؐ نے پھر اپنے کلمات کو دُہرایا۔ اُنہوں نے پھر یہی کہا کہ کیا ہم غیروں کے اندر بھی سوجھ بوجھ پیدا کر دیں۔ اس پر آپؐ نے پھر اپنی وعید کو دُہرایا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا یا رسول اللہ! آپؐ ہمیں ایک سال کی مہلت عنایت فرما دیں۔ چنانچہ آپؐ نے ان لوگوں کو تعلیمِ ہمسایہ کے لیے ایک سال کی مہلت

(۴)

Marfat.com

تعزیر معاف کی جا سکتی ہے؟

اگر موجبِ تعزیر جرم شہریوں کی باہم تعدّی اور ضرر رسانی کی قبیل سے نہ ہو بلکہ صرف مذہبی شعائر کی بے حرمتی اور ارتکابِ معصیت کی بنا پر ہو تو یہ تعزیر خالص شریعت کا حق شمار ہوگی۔ لیکن اگر جرم کسی کو مار پیٹ کرنے، سب و شتم کرنے یا دوسروں کو کسی نوعیت سے ایذا پہنچانے کا ہو تو مجرم پر تعزیر کا حق بیک وقت دو طرف سے عائد ہوگا۔ ایک اس شخص کی داد خواہی کا حق جس کو مجرم کے ہاتھوں تکلیف پہنچی ہے اور دوسرا شریعت کا حق جو اُسے سوسائٹی کو پُرامن رکھنے اور شہریوں کی تادیب و اصلاح کے بارے میں اصولی طور پر حاصل ہے۔ دوسری صورت میں یعنی جب کہ تعزیر کسی مظلوم شخص کے حق کی بناء پر قائم ہوا اور وہ شخص انتقام لینے کا مطالبہ کر رہا ہو تو عدالت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ مجرم کی سزا کو معاف کر دے یا منسوخ کر دے۔ یہ انسانی حقوق کی صریح پامالی ہے اور عدالت کو انسانوں کے حقوق ساقط کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

---

(۴) دے دی اور پھر قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۔ (بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

البتہ اگر مستغیث اپنی رضامندی سے ملزم کو معاف کردے یا تعزیری سزا خالص شرعی حق کے تحت کسی مقدمے میں نافذ کی جارہی ہو تو اس صورت میں بھی قاضی پر لازم ہے کہ صاحب حق کی طرف سے عفو و درگزر کے باوجود شرعی حق کو قائم کرتے ہوئے مجرم کو سزا دے۔ فقہاء کی صراحت کے مطابق قاضی یا حاکم محض اپنے حق کو معاف کرنے کا مجاز ہے۔ لیکن شہریوں کی تہذیب و اصلاح اور انسدادِ مفاسد کے سلسلے میں ریاست کو جو حقوق حاصل ہیں اُسے وہ معاف نہیں کر سکتا۔[1] اسی بنا پر فقہاء کا یہ فیصلہ بھی ہے کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کو مارتا ہے اور وہ دوسرا شخص جواب میں ضارب کو مارتا ہے تو دونوں مستوجب تعزیر ہوں گے۔

طبری نے تاریخ الامم والملوک میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک بار حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے راستے میں جاتے ہوئے کسی فریادی

(بقیہ صفحہ گذشتہ):-

کرنے لگے تھے، انہوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بُرا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا (المائدہ - ۷۸)۔ تعلیم و تعلم میں کوتاہی کو اجتماعی جرم قرار دینا فی الواقع ایسا حیرت انگیز موقف ہے جو ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یا بعد تاریخ کے کسی دور میں بھی اختیار نہیں کیا گیا ہے۔

[1] الاحکام السلطانیہ از ابوالحسن ماوردی باب التعزیر۔

Marfat.com

کی پکار سُنی، آپ اُس کی طرف لپکے اور فرمایا: "مددگار حاضر ہے"۔ چنانچہ آپ نے قضیے کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مستغیث نے ایک شخص کے ہاتھ سات درہم میں ایک کپڑا فروخت کیا۔ ان میں سے ایک درہم ناقص تھا۔ بیچنے والے نے اُسے واپس کرنا چاہا مگر خریدار نے لینے سے انکار کر دیا۔ جب کپڑے والے نے اُسے واپس لے لینے پر اصرار کیا تو خریدار نے اُس کے ایک گھونسا رسید کر دیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اس واقعہ کا گواہ طلب کیا۔ گواہ نے اس واقعہ کی تائید کی حضرت علیؓ نے گاہک کو زمین پر بٹھا دیا اور کپڑے والے کو قصاص لینے کا حکم دیا۔ اُس نے کہا: "امیر المومنین! میں نے اسے معاف کر دیا۔" امیر المؤمنینؓ نے کہا: "تو نے محض حق وصول کرنے میں احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے"۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے خود آگے بڑھ کر کپڑے والے کو سات دُرّے مارے اور فرمایا: "ھٰذا حق السلطان" (یہ ریاست کا حق تھا) طبری جلد ۶ صفحہ ۶۰۔

اگر ستم رسیدہ بطور خود مجرم کا فعل معاف کر دے یا تعزیر کا نفاذ کسی ایسے مقدمے میں ہو رہا ہو جو حقِ شرعی کے تحت قائم کیا گیا ہو تو قاضی کو اگر یہ یقین ہو جائے کہ ارتکابِ جرم کرنے والا قبل از وقت راہِ راست پر آ چکا ہے اور قاضی کا یہ خیال بھی ہو کہ درگزر کر دینا اس کے لیے مزید باعثِ اصلاح ہوگا تو اس استثنائی صورت میں وہ مجرم کو معافی دے سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شریعت،

Marfat.com

کا اربابِ عدل و قضاء کو یہ حق دے دینا کہ وہ مقدماتِ تعزیر میں (جس کی صورت اوپر گذر چکی ہے) سزا دیے بغیر مجرم کو معاف کر دینے کے مجاز ہیں، حق جمہور میں دراندازی کے مترادف نہیں ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، اربابِ عدل و قضا کو یہ اختیارات بلا شرط اور علی الاطلاق حاصل نہیں ہیں بلکہ صرف مصالح خصوصی کے پیشِ نظر ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم جدید فوجداری اور تعزیری قوانین اور تصوراتِ قانون کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جدید قوانین و دساتیر جو ہمارے ملکوں میں رائج ہیں یا دیگر ترقی یافتہ ممالک میں نافذ ہیں، صدرِ ریاست کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ قتل اور ڈکیتی کے بڑے سے بڑے جرائم میں مجرموں کو معافی دے سکتا ہے۔ صدرِ ریاست کا یہ حق عفو (Mercy Appeal) عدالتِ عالیہ کے فیصلے پر بھی بالاتری رکھتا ہے اور وہ جب بھی کسی قضیے میں "مصلحت" دیکھتا ہے اسے بلا تامل استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ اور اس سب پر مستزاد یہ ہے کہ اس عفو و درگزر کو حقِ جمہور میں دست درازی کے مترادف نہیں گردانا جاتا۔

مذکورۂ بالا بیان سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اسلام میں تعزیری قوانین عام ملکی تعزیرات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ یہ انہیں کے تحت آتے ہیں۔ تعزیری قوانین میں تغیر پذیری کی خصوصیات موجود ہیں، اور وہ زمان و مکان کی قیود میں محصور نہیں ہیں، بلکہ ان میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم

Marfat.com

پائی جاتی ہے کہ وہ عصری تقاضوں کے مطابق نوعیت و مقدار کے ہر سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔ انہی خصائص کی وجہ سے اربابِ فقہ و قانون نے تعزیرات کو "مصلحتِ شرعی" کے دائرے میں شمار کیا ہے۔ مصلحتِ شرعی ان کے نزدیک "حکومتِ اسلامی کا وہ عمل ہے جو اس نے مصلحتِ وقت اور مفادِ عامہ کے تحت کیا ہو اور خواہ اس فعل کے جواز میں کوئی مخصوص شرعی دلیل نہ وارد ہوئی ہو۔" اس تعریف کی رُو سے مصلحتِ شرعی دراصل مصالحِ مرسلہ یا استصلاح الحال ہی کی ایک قسم ہے۔ بلکہ فقہاء نے یہاں تک فرمادیا ہے کہ: کتابِ قانون کا بابِ تعزیر ہی فی الحقیقت شرعی مصلحت کے احکام کا نگران اور انہیں کامیاب و نتیجہ خیز بنانے کا کفیل ہے۔

تعزیری قوانین کی تدوین ہو سکتی ہے۔

اس مقام پر قانون کے طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر شریعت نے تعزیر کی تعیینِ نوعیت و مقدار کو حکام و قضاۃ کی رائے پر چھوڑ دیا ہے تو کیا یہ تفویضی اختیارات مختلف النوع جرائم کے لیے مختلف سزائیں مقرر کرنے اور انہیں قانونی شکل میں مدوّن کرنے میں حائل نہیں ہوتے اور اس کی نفی نہیں کرتے ہیں جیسا کہ موجودہ دور میں قانونِ عقوبات (Penal Code) میں یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ وقتی و ملکی داعیات کے تحت مختلف سزاؤں کا مجلّۂ احکام وضع کیا جاتا ہے اور انہیں عدلیہ کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اس

Marfat.com

کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ قانون سازی اور سزاؤں کے احکام کی تدوین کا عمل خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت نے یہ معاملہ اربابِ امر کو تفویض کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ قانون سازی اور حد بندی آزادیٔ رائے کو ختم نہیں کرتی بلکہ آزادیٔ رائے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں فوجداری قوانین کی بہت بڑی تعداد اسلامی نقطۂ نظر سے جائز تعزیرات کے حدود میں داخل ہے، بجز اس کے کہ حدود کے نفاذ میں بے اعتنائی برتی جاتی ہے یا قصاص کے مقدمات میں بعض صورتوں میں شریعت سے ہٹ کر قانون سازی کی گئی ہے۔ اسی طرح موجودہ قانون ساز ادارے فوجداری قوانین کی تدوین کے ضمن میں کسی جرم کی سزا کے لیے اس کی صرف ابتدائی اور آخری حدود کی تصریح کرتے ہیں اور باقی تمام جزئیات اور درمیانی مقداریں اربابِ عدل و قضاء پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بات بھی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ لیجسلیچر نے اربابِ عدل و قضا پر اعتماد کیا ہے اور ہر جرم کی موزوں سزا کی مقدار انہی کو تفویض کر دی گئی ہے۔ شریعتِ اسلامی نے ان تفویضی اختیارات کو بنیاد بنا کر سزاؤں کی تحدید کو ہر زمانے کے صاحبِ امر اداروں پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ زمان و مکان کے مطابق ان میں تصرف کرتے رہیں۔ فوجداری اور تعزیراتی قانون سازی کے وقت اربابِ امر کا سزاؤں کی تعیین و تحدید کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے قانونی اختیارات (Legal Authority) کو روبعمل لاتے ہوئے

Marfat.com

گویا ان سزاؤں کو بالقوۃ نافذ کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ نفاذِ سزا وقوعِ جرم سے قبل ہوا ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہے کہ مجرم اقدامِ جرم سے قبل ہی اپنی سزا کی نوعیت و مقدار سے آگاہ رہے گا۔ اب یہ بدیہی امر ہے کہ قبل از وقوعِ جرم سزا کا معین کر دینا بھی انہی اختیارات کے اندر ہے جو تعینِ سزا کے باب میں شریعت نے اربابِ امر کو ہمہ وقتی سونپ رکھے ہیں۔

تعزیر ذریعۂ اصلاح ہے

خاتمۂ بحث پر ہم بیروت کے مشہور محقق ڈاکٹر صبحی محمصانی ایڈوکیٹ کی کتاب "النظریۃ العامۃ للموجبات والعقود" کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جو ڈاکٹر موصوف نے اصولِ تعزیر کی بحث میں ایک نوٹ کی صورت میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

"آپ نے اس سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ شریعتِ اسلامی میں تعزیر ایک ایسا لچکدار وسیلۂ عدل ہے جو صاحبِ امر کے میدانِ عمل کو وسیع کرتا ہے اور اُسے یہ مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ عمومی مصلحت کے تحت فساد انگیز عنصر کی اصلاح کر سکے۔ من جملہ دوسرے دلائل کے یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ شریعت اسلامی جمود اور ٹھہراؤ کے اس اتہام سے بری ہے جو بعض لوگ اس پر دیدہ دلیری سے لگاتے ہیں۔ بلکہ یہ عصری مصالح کے مطابق ایک تغیّر پذیر اور وقتی ضروریات

Marfat.com

کو بدرجۂ کامل بروئے کار لانے والی شریعت ہے۔ اسی طرح منجملہ دوسرے وسائل کے تعزیر بھی ایک ایسا وسیلہ ہے جو قاضی کو فوجداری احکام کی تنفیذ میں ہر واقعہ کے مطابق اور ہر مجرم کے حسبِ حال پوری آزادی سے بہرہ مند کرتا ہے تاکہ وہ سزا کی اصل غرض و غایت تک پہنچ سکے۔ اور سزا کی غرض و غایت یہ ہے کہ مجرم خود بھی اپنے جرم سے باز آجائے اور اُس کے ہم جنس اس کی تقلید سے دامن کش ہو جائیں۔"

(ترجمان القرآن: فروری ۱۹۵۸ء)

Marfat.com

ڈاکٹر محمد ناصر:

انڈونیشیا کے مقبول ترین لیڈر ہیں۔ موصوف انڈونیشیا کی سب سے بڑی جماعت "ماشومی" (مجلسِ شوریٰ مسلمین انڈونیشیا) کے صدر ہیں۔ اسلامی نظام کے داعی ہیں۔ انگریزی، ولندیزی، عربی اور انڈونیشی زبانوں کے فاضل ہیں۔ شغف مطالعہ اور تحریکی زندگی کی بدولت وسیع معلومات اور مسائل جدیدہ میں گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ فلسفۂ اسلام کے اچھے عالم ہیں۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب "اسلامی ثقافت" ہے۔

جولائی ۱۹۰۸ء میں، مغربی سماٹرا کے قصبہ "آلاھان پنجگ" میں ایک متوسط علمی و دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر ایک ایجوکیشن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہو گئے۔ نشر کو مغربی اثرات سے بچانے کے لیے ۱۹۳۲ء میں بنڈونگ میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جس کے تحت متعدد

Marfat.com

ابتدائی اور ثانوی مدارس اور ٹریننگ سنٹر جاری کیے۔ جاپانی استعمار نے انہیں "خطرناک اڈے" قرار دے کر توڑ دیا۔ بنڈونگ ہی میں ڈائرکٹر آف تعلیمات لگ گئے۔ مگر اسلامی مزاج کو یہ ملازمت راس نہ آئی۔ مستعفی ہو گئے۔ آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے "مجلسِ اعلیٰ" کا قیام (۱۹۳۷ء) عمل میں آیا تو اس کے مؤسسین میں شامل ہوئے۔ اس کی تحلیل کے بعد متحدہ اسلامی جماعتوں کے اتحاد سے "ماشومی" (۱۹۴۵ء) کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ماشومی کا قیام بھی موصوف کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ جاپان سے آزادی کے بعد (۱۹۴۵ء) انڈونیشیا کی پہلی عارضی پارلیمنٹ میں "اتحاد اسلامی" کی طرف سے نمایندے منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں وزیر اطلاعات مقرر ہوئے۔ ہالینڈ کے دوبارہ تسلط کے بعد ایک سپاہی کی طرح آزادی کامل کی خاطر جنگ لڑی۔ اور ولندیزی فوج کے ہاتھوں شدید مصائب برداشت کیے۔ ۱۹۴۹ء میں استقلالِ ملک کے سلسلے میں ہالینڈ سے بات چیت کرنے کے لیے لاہائی کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ مگر بنیادی اختلاف کی وجہ سے نمایندگی سے دستبردار ہو کر واپس آ گئے۔ اور جب آزادی کے بعد "ولایاتِ متحدہ انڈونیشیا" کی پہلی وزارت بنی تو اس میں بھی اصولی اختلاف

Marfat.com

کی بنا پر شرکت سے انکار کر دیا۔ ۱۸ ماہ کے بعد جب دوسری وزارت کی تشکیل ہوئی اور "جمہوریہ انڈونیشیا" کا وجود عمل میں آیا تو اس کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ مگر صدر سوکارنو کی آزاد خیالی اور ڈاکٹر ناصر کی اسلام پسندی زیادہ عرصہ تک ہمدوش نہ چل سکیں۔ ڈاکٹر ناصر وزارتِ عظمیٰ سے دستبردار ہو گئے اور عوامی میدان میں کام کے لیے اُتر پڑے۔ اور سکارنو کے باطل نظریات پر کھلم کھلا تنقید کی۔ یہ اختلاف آج تک قائم ہے، اور نوبت خانہ جنگی تک پہنچ گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد ناصر جس قسم کے نظامِ حکومت کے خواہش مند ہیں وہ زیرِ نظر مقالے سے واضح ہو جائیں گے۔ یہ مقالہ مجلسِ دستور ساز میں ان کی تقریروں پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

دین، یا لادینیت

(دونوں راستوں میں سے ایک کا انتخاب کیجئے)

[زیرِ نظر مضمون ڈاکٹر محمد ناصر کی ایک تقریر پر مشتمل ہے جو انھوں نے انڈونیشیا کی مجلسِ دستور ساز میں، اسلامی دستور کی حمایت میں کی۔]

صدرِ محترم! میں سب سے پہلے دستور کمیشن کی اس کامیاب کوشش کا اعتراف کرتا ہوں، جو اس نے ریاست کی بنیادوں کے موضوع ـــــ ایک نہایت نازک زیرِ بحث موضوع ـــــ سے متعلق اُن تمام افکار و نظریات اور رجحانات کا جائزہ لینے اور ان کا لبِّ لُباب پیش کرنے کے سلسلے میں، سرانجام دی ہے، جو دستور ساز اسمبلی کے اندر اور پورے ملک کے اندر پائے جاتے ہیں۔ بلا شبہ یہ رپورٹ زیرِ تدوین دستور کی بنیادوں پر بحث و تمحیص کرنے کے سلسلے میں ہمارے لیے بہت مددگار ثابت ہو گی۔

بحث کی آزادی

پرسوں، جب کہ ہم دستور ساز اسمبلی کا یومِ تشکیل منا رہے تھے، صدرِ

Marfat.com

مجلس مسٹر ولبو نے دورانِ گفتگو کہا تھا کہ اسمبلی کا یہ فرض ہے کہ موجودہ عارضی دستور کے بجائے وہ ایک مستقل اور پائدار دستور وضع کرے۔ اسمبلی اپنے اس فرض منصبی سے اسی صورت میں سبکدوش ہو سکتی ہے کہ اس کے سامنے انڈونیشی معاشرے کے اندر پائے جانے والے مختلف افکار و نظریات کا جائزہ لینے، اور ان پر بحث و مباحثہ کرنے، اور ان کا باہم موازنہ کرنے کا دروازہ کھلا ہوا ہو۔ دوسرے الفاظ میں مجلس کا کام یہ غور کرنا ہے کہ اپنی موجودہ اور آیندہ نسل سے متعلق اپنی ذمہ داری کو کیوں کر ادا کر سکتے ہیں۔ اس مہم کی کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ ہم کھلے دل سے تمام افکار و نظریات کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں اور ان پر سیر حاصل بحث و تمحیص کریں۔

بحث کے لیے رواداری کی ضرورت۔

مجھے ان تمام اپیلوں سے اتفاق ہے جو دستور ساز اسمبلی کے اجلاسوں میں بارہا سُنی گئی ہیں، اور جن میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بحث و مذاکرہ کے دوران ہمیں "رواداری" کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جناب صدر! اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ مطلوبہ "رواداری" اس وقت ہمارے لیے نافع نہیں ہو سکتی جب تک ہم آغازِ کار ہی میں ان تمام نظریات کو واضح طور پر نہ سمجھ لیں جو ابتدائی کمیٹی کی جانب سے ہمارے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ کیوں کہ جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ہم کس چیز میں موازنہ کرنا چاہتے ہیں اور کس چیز میں اتحاد کی بنیادیں تلاش

Marfat.com

کر رہے ہیں۔ اس وقت تک ہم نہ صحیح طور پر مختلف نظریات کا موازنہ کر سکتے ہیں اور نہ اُن میں اتحاد کی بنیادوں کا سُراغ پا سکتے ہیں۔ یا بالفاظِ دیگر ہمیں وہ "نقطۂ مصالحت" ہاتھ نہیں آسکتا جس کا چرچا اکثر ہم سنتے رہتے ہیں۔ بنا بریں میں کہوں گا کہ "دستوری بنیادوں" پر ہماری تمام بحثیں اسوقت شدید خطرے میں گھری ہوئی ہیں جب تک زیرِ بحث افکار و نظریات پر ابہام و اجمال کا پردہ پڑا ہُوا ہے۔ بلکہ مجھے یہ بھی خدشہ ہے کہ یہاں ایسے حالات نہ پیدا ہو جائیں ـــــ مجلسِ دستور ساز کے اندر بھی اور باہر بھی ـــــ جن کے پس پردہ یہ مقصد کارفرما ہو کہ ہم اپنے دوست اور دشمن میں تمیز نہ کر سکیں اور آیندہ زیرِ بحث آنے والے افکار و نظریات کو خوش اسلوبی سے جامۂ تدوین نہ پہنا سکیں[1]

جنابِ صدر! 'رواداری' جسے ہم میں سے ہر شخص استعمال کرنے کا شوق رکھتا ہے، کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو موقع دیا جائے کہ اپنے خیالات و افکار کو صاف صاف بیان کر سکے۔ یہ 'رواداری' جس طرح سابقہ کمیٹیوں کے اجلاسوں میں برتی گئی ہے، مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی اسمبلی کے عام

---

[1] موصوف کا یہ خدشہ بالکل درست ثابت ہُوا۔ اسی اجلاس کے بعد وہ حالات پیدا ہو گئے جنھوں نے پائیدار دستوری حکومت کے امکانات کو ختم کر کے ملک کو مستقل آمریت کے چنگل میں دے دیا۔

(مرتب)

Marfat.com

اجلاسوں میں اسے باقی رکھا جائے گا۔ ہم اس "رواداری" کو رواداری کا نام نہیں دے سکتے جس کے پیچھے بحث و تمحیص کا دروازہ نہ کھلا ہو۔ ایسی رواداری اختیار کرنے کا مطلب مسئلہ زیرِ بحث کے ساتھ مذاق و استہزا ہو گا۔ اور اس طرح سے دستور کی تدوین نہیں ہو گی، بلکہ "رواداری" کی تدوین ہو گی۔

ہمیں اس وقت جس بات کی ضرورت ہے، وہ ہے: رواداری کی فضا میں بے لاگ بحث و تمحیص — تاکہ ہم مختلف نظریات اور متضاد افکار کے ہجوم کے اندر سے اس امرِ حق تک پہنچ جائیں جس کی ہمیں تلاش ہے۔ چنانچہ مجھے توقع ہے کہ اس مجلس میں جس نوعیت کی رواداری کو فروغ دیا جائے گا۔ وہ بحث و تمحیص کا دروازہ بند کرنے کے لیے نہیں ہو گی بلکہ آزادانہ جرح و تنقید کا موقع مہیا کرنے والی ہو گی۔

میں اپنی گزارش کا پھر اعادہ کروں گا کہ ایک شورائی تنظیم ہونے کی حیثیت سے دستور ساز اسمبلی کا یہ فرض ہے کہ وہ ان مستقل اور پائیدار بنیادی امور کی بغور چھان بین کرے اور اُن پر کھلی بحث کرے اور اُن کی صحت و سقم کا مکمل جائزہ لے جن پر آیندہ دستور کی عمارت اٹھائی جانے والی ہے۔

دستور ساز اسمبلی کی پوزیشن

صدر مجلس جناب ویلوبوئے نے ہمیں اس فرض کی جانب توجہ دلاتے ہوئے اپیل کی ہے کہ ہم میں سے ہر فرد اس نازک اور کٹھن ذمہ داری

Marfat.com

کا پورا پورا احساس رکھے۔ دستور ساز اسمبلی کے ارکان ہونے کی حیثیت سے صرف ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ کسی چیز کا قطعی فیصلہ کریں اور پھر اس فیصلے کی ذمہ داری اپنے سر اٹھائیں۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر ایک عارضی دستور ختم کر کے ایک دوسرا عارضی دستور مہیا کرنا نہیں ہے، بلکہ ہم امکانی حد تک جدوجہد کریں گے کہ ایک ایسا دستور تیار کریں جس کی بنیادیں نہایت مضبوط ہوں اور جو آنے والی نسلوں کے لیے بھی قابلِ قبول ہو۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس وقت ہمیں موجودہ دستور کے تمام مسائل کو زیرِ بحث لانا چاہیے اور ان کا بے لاگ محاکمہ کرنا چاہیے۔ خواہ وہ ریاست کے ڈھانچے اور اس کی موجودہ پوزیشن سے متعلق ہیں اور خواہ ریاست کی نظریاتی بنیادوں سے متعلق ہیں۔ اور پھر اس بحث و محاکمہ کے ذریعہ نئی تجاویز سامنے لائی جائیں جو ان تمام امور سے کلی طور پر مختلف ہوں جنھیں اب طے شدہ اور مستقل امور سمجھا جا رہا ہے۔ جنابِ صدر! کیا اتحاد و مصالحت کا یہی مدعا نہیں ہے؟ پھر جب یہ تجاویز سامنے آجائیں اور ان پر پوری بحث و تمحیص کے بعد یہ طے کر لیا جائے کہ ریاست کا ڈھانچہ کیا ہو۔ کنفیڈریشن ہو یا فیڈریشن؟ ریاست کی آئیڈیالوجی کیا ہو؟ اسلام ہو یا اکنامک سوشلزم ہو یا پنچ شیلا[1] ہو، جن پر اب ملک چل رہا ہے۔

---

[1] پنچ شیلا، سیکولر ذہن کا اختراع کیا ہوا نیا دین ہے۔ اس سے مراد یہ پانچ اصول ہیں۔ (۱) خدا کا اقرار (۲) نیشنلزم (۳) ڈیموکریسی (۴) انسان دوستی۔ (۵) معاشرتی انصاف ۔۔۔ انڈونیشیا کا عارضی دستور اسی بنیاد پر قائم ہے۔

Marfat.com

تو اس سے بعد کسی کو یہ حق نہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان تجاویز سے سرتابی کرے۔ ان پر چیں بجبیں ہو، یا اضطراب و قلق کا اظہار کرے۔ نیز یہ بات بھی نہایت غلط ہوگی کہ جب اسمبلی میں مذکورہ بالا نوعیت کی تجاویز پر بحث ہو رہی ہو، اور ان پر اظہارِ خیال کیا جا رہا ہو تو ایک شخص اُٹھے اور بلا سوچے سمجھے اپنے مخالف فریق پر یہ الزام دھرنا شروع کر دے کہ یہ غائن ہے یا یہ انڈو نیشین ری پبلک کا باغی ہے۔ تجاویز پر بحث و مباحثہ کرنا اور ان میں سے کچھ کو انتخاب کرنا اور پھر اُن پر آخری فیصلہ صادر کرنا، یہ سب کام بہر حال اس مجلس کے ارکان کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔ ان پر کوئی شخص قدغن لگانے کا مجاز نہیں ہے۔

ہماری دستور ساز اسمبلی ایک جزیرہ نما کی صورت میں ہے جسے ہر طرف سے سیاسی کشمکش کی متلاطم موجوں نے گھیر رکھا ہے۔ چنانچہ ہم امید رکھتے ہیں کہ یہ اسمبلی ایسی پناہ گاہ ہو جسے مختلف افکار و نظریات کے اتحاد کا پُر امن پلیٹ فارم بنایا جا سکے۔ جنابِ صدر! یہ اسمبلی قوم و وطن کے حق میں اُسی وقت تک مفید رہ سکتی ہے جب تک اس اسمبلی میں اظہار رائے کی آزادی کی فضا چھائی رہے گی۔ اور کسی نوعیت کا دباؤ اور تشدد نہیں برتا جائے گا۔

ریاست کسے کہتے ہیں؟

قبل اس کے کہ ہم یہ بحث چھیڑیں کہ "ریاست کی بنیاد کیا ہو؟" مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال سے بحث کا آغاز کریں کہ: "ریاست کسے

Marfat.com

کہتے ہیں؟"

اس سوال کے جواب میں ہم ریاست کے نقطۂ آغاز اور ریاست کے مستقبل کے موضوع پر روشنی نہیں ڈالیں گے۔ یہ واضح ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہم اس اصول کے قائل ہیں کہ جب تک پشتِ زمین پر انسان بستے ہیں، نظامِ ریاست کو برقرار رکھا جائے اور انتشار و انارکی کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ مگر ہمارے برعکس کمیونسٹ جب اپنے آخری مقاصد تک پہنچ جاتے ہیں تو وہ ریاست کو زوال کا شکار دیکھنا چاہتے ہیں اور نہلسٹ جلد از جلد نظامِ ریاست کا تیا پانچہ کر دینا چاہتے ہیں۔

ریاست، جسے انگریزی میں (State) کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، پر بحث کرنے سے ہمارا یہ مدعا بھی نہیں کہ چند الفاظ میں اس کی تعریف کی جائے۔ کیونکہ ایسی تعریف اس کی حقیقت کو اجاگر نہیں کر سکتی۔ بالخصوص جب کہ علمائے سیاست نے ریاست کا مفہوم متعین کرنے میں گوناگوں آراء کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ابن خلدون، بلنچلے، ہیگل، مارکس، آدم سمتھ، رابرٹ اون، اور اسی طرح افلاطون، اوگسٹینس، ہابس اور روسو وغیرہ نے اپنے اپنے خیال کے مطابق ریاست کی تعریفات کی ہیں، مگر ان میں سے ہر ایک کی رائے دوسرے سے نہیں ملتی۔ چنانچہ اختلافِ آراء کی وجہ سے ہم ریاست کی تفصیلات سے متعارف ہونے کے لیے ان اوصاف اور عناصر پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے ریاست متشکل ہوتی ہے۔

Marfat.com

ریاست دراصل ایک ادارہ (Institution) ہوتا ہے جو متعین حقوق و فرائض اور متعین مقاصد کا حامل ہوتا ہے ۔۔۔ خود ادارہ اپنے وسیع مفہوم میں ایک ایسی اجتماعی ہیئت اور تنظیم سے عبارت ہے، جو مخصوص اغراض رکھتا ہو، جیسے مادی وسائل اور مخصوص نظام چلیا ہو اور جسے معاشرہ تسلیم کرتا ہو ۔۔۔ چنانچہ ریاست، بحیثیت ہیئت اجتماعیہ، مندرجہ ذیل عناصر کی محتاج ہے:

(۱) تنظیمی ڈھانچہ

(۲) نظام

(۳) حکومت

(۴) اقتدار

(۵) دستور (یا کوئی اور ماخذ قانون) و اقتدار جو تغیر و ترمیم کا نشانہ نہ بنتا ہو۔)

لہٰذا ایک ریاست کے لیے ضروری ہے کہ:

(۱) وہ معاشرے کے تمام طبقات اور تمام اداروں پر مشتمل ہو۔

(۲) ان تمام اداروں کو ایک قانونی نظام میں منسلک رکھے۔

(۳) معاشرے کے تمام اجزاء کو منظم و ہم آہنگ رکھے۔

(۴) وہ اقتدار سے بہرہ مند ہو جس کی بدولت اپنے تمام اجزاء کو قانون کی قوت سے آگے بڑھ رکھے۔

(۵) معاشرے کی تربیت اور اس کی حاجات کو پورا کرنا اس کا

Marfat.com

مطمح نظر ہو۔

اجزائے ریاست کا نقطۂ ماسکہ

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لازم ہے کہ ریاست کی جڑیں معاشرے کے اندر پیوست ہوں اور اس کی اساس واضح اور جاندار آئیڈیالوجی پر استوار ہو۔ یہ آئیڈیالوجی اجزائے ریاست کا نقطۂ ماسکہ ہوگی۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ریاست کا وظیفہ افراد اور جماعتوں کی تنظیم اور ان کے حقوق کی تعیین ہوتا ہے۔

ہم اس وقت ایک ریاست کی تشکیل پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اس ریاست کا ایک ایسا دستور وضع کرنے کے لیے جو اس کی مطلوبہ اغراض کو پورا کرتا ہو، ہمیں لازم ہے کہ ہم اس مسلّم حقیقت سے آغازِ گفتگو کریں۔ کہ کامیاب دستور وہ ہوتا ہے جس کی بدولت حکومت اور معاشرے کے مابین مضبوط و مستحکم رابطہ وجود میں آئے۔ یا واضح الفاظ میں دستور کی جڑیں ہوائیں نہ ہوں بلکہ افراد معاشرہ کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیوست ہوں، اور اس کے ریشے افراد کے رجحانات، احساسات، عقائد اور فلسفۂ زندگی میں اترے ہوئے ہوں۔ جو دستور ریاست کو یہ مقام نہیں دیتا اس کے منبع فساد و وجہ اضطراب ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دستور کبھی مستحکم اور دیرپا دستور نہیں ہو سکتا۔

انڈونیشیا کے دستوری رجحانات

"دستوری بنیادوں" کے سلسلہ میں دستور کمیشن کی کوششوں کا حاصل

Marfat.com

بتاتا ہے کہ ملک کے اندر جتنے مذاہب اور نظریات پائے جاتے ہیں وہ سب اس امر پر متفق ہیں کہ یہاں جمہوری اسٹیٹ کا قیام عمل میں لایا جائے ——— یہ صورتِ حال اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ جمہوریت کی روح اور جمہوریت کے فروغ کی خواہش قوم کے دل و دماغ میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ہمیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لانا چاہیے۔

صدرِ محترم! دستور کمیشن کی رپورٹ سے یہ عیاں ہے کہ ہمارے ملک کے اندر نظامِ ریاست کے لیے تین طرح کی بنیادیں تجویز کی جا رہی ہیں: (۱) پنج شیلا (۲) اسلام (۳) اکناک سوشلزم۔ اب میری اور میرے ساتھیوں کی یہ کوشش ہوگی کہ جس طرح ہم نے پیشتر ازیں دستور کمیشن کے سامنے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے، آپ کے سامنے بھی مزید شرح و بسط کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر بیان کر دیں۔ ہمارے نقطۂ نظر کا ھدف ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ یعنی ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ انڈونیشیا کو ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیے۔

پنج شیلا کے علمبرداروں کا متضاد رویّہ

قبل اس کے کہ میں اپنے نقطۂ نظر کی توضیح کروں، میں گزارش کروں گا کہ صدرِ محترم مجھے اجازت دیں کہ میں پہلے ان خیالات اور دلائل کا سامنا کروں جو ہم سے اختلاف رکھنے والے حلقوں کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں۔ ان حلقوں سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو پنج شیلا کی اساسات پر ریاست کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔

Marfat.com

اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ پنچ شیلا کے حامی جس بنیاد پر پنچ شیلا کے نفاذ کی دعوت دیتے ہیں وہ جمہوریت ہے۔ لیکن اپنے نظریے کے حق میں جو وہ دلائل دیتے ہیں جب ہم اُن دلائل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پنچ شیلا کے جمہوریت پسند حامیوں کو خود جمہوری اصولوں کا مخالف پاتے ہیں۔ اور ہمارے سامنے ایک متضاد صورتِ حال آجاتی ہے۔ اس حقیقت کو ہم آپ کے سامنے مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔

جمہوریت کا اصول ہے کہ حکمران گروہ کو اکثریت کی تائید حاصل ہو اور اکثریت کے نظریات سے اختلاف رکھنے والی اقلیت معاشرے کے اندر بنیادی حقوق سے پوری طرح بہرہ مند ہو۔ اس اصول سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر اصولِ جمہوریت کو ریاست کی تعمیر و تاسیس میں کارفرمائی حاصل ہو تو یہ ریاست لازماً معاشرے کے ہر فرد کی نمائندہ ہوگی اور خاص طور پر قوم کا غالب حصہ جس فلسفۂ زندگی پر ایمان رکھتا ہو اس فلسفۂ زندگی کی ترجمان ہوگی۔ اسی طرح یہ اصول اقلیت کو بھی زندگی کی پوری سہولتیں فراہم کرنے کا متقاضی ہے۔ یہ دونوں جمہوری اصول باہم گہرا ربط رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اگر ان اصولوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو پھر جمہوریت کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ وہ جمہوریت نہیں ہوگی بلکہ آمریت اور استبداد ہوگا۔

لیکن ——— صدرِ محترم! ——— یہاں عجیب صورتِ حال مشاہدے

Marfat.com

میں آرہی ہے۔ ہم جب اسلام کو نظامِ ریاست کی حیثیت سے قبول کرنے کی دعوت پیش کرتے ہیں تو (پنج شیلا کے حامیوں میں سے) کچھ لوگ جھٹ یہ وعظ فرمانا شروع کر دیتے ہیں کہ "اسلام کو ریاست کی اساس قرار نہ دو، اسلام ایک مخصوص طرزِ زندگی ہے جسے ایک مخصوص فرقے نے اپنایا ہوا ہے، اور یہاں دوسرے بھی بہت سے فرقے موجود ہیں" ——— بس یہ ہے وہ دلیل یا وجہ جواز جسے پنج شیلا کے علمبردار اسلام کو خارج از ریاست ٹھیرانے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ یعنی اسلام کے ترک والنکار کی بنا یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں نے اس کے نقائص کا اندازہ لگا لیا ہے، اور نہ اس بنیاد پر ہے کہ یہ اکثریت کا دین نہیں ہے۔ بلکہ بنائے انکار محض یہ ہے کہ یہ صرف ایک فرقے کا نظریہ ہے، تمام فرقوں کا نظریہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ترکِ اسلام کے یہ دلائل اصولِ جمہوریت کی رُو سے قطعاً قابلِ التفات نہیں ہیں۔ ورنہ خود ان لوگوں کا کچھ کیا جواب ہوگا اگر مسلمان فرقہ ——— جس کے نظریات کو یہ لوگ صرف اس بنا پر رد کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ ایک مخصوص فرقے سے تعلق رکھتے ہیں ——— ان کی رائے کو دلیل پر اٹھا کر مارے اور یہ کہے: "پنج شیلا کا نظریہ ہم پر کس دلیل کی بنا پر ٹھونسا جا رہا ہے جب کہ یہ نظریہ تمام فرقوں کا نہیں بلکہ صرف ایک فرقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور ہمارے نظریات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے؟" ظاہر ہے کہ یہ طرزِ استدلال لاتناہی جھگڑے کی

Marfat.com

بنا ڈال دے گا اور ہم غایت مطلوبہ تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے اس جھگڑے سے ہم اس وقت تک نجات نہیں پا سکیں گے جب تک ہم ہر نظریہ حیات اور ہر نظام فکر و عمل پر اصولی اور علمی بحث سے پہلوتہی کرتے رہیں گے۔

پنج شیلا اور منکرینِ خدا

اسی طرح یہ حضرات "پنج شیلا" کو اس لیے بھی ریاست کی بنیاد تجویز کرتے ہیں کہ ان کا یہ خیال ہے کہ یہ اصول تمام افکار و نظریات کو متحد کرنے کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ جس چیز کو یہ حضرات "اتحاد کی بنیاد" کہتے ہیں، تعین کے ساتھ بتایا جائے کہ وہ ہے کیا؟ اس تعین و تشخیص کی ضرورت اس لیے ہے کہ ہم اس وقت کسی محدود مدت کے لیے ریاست کی بنیادیں نہیں وضع کر رہے ہیں بلکہ ہمیں ایک ایسی مستحکم عمارت تعمیر کرنا ہے جس کی کشادہ فضاؤں میں آئندہ کی نسلیں بھی پیہم مسرت زندگی بسر کر سکیں۔

اب میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ: کیا یہ حقیقت نہیں کہ "اتحاد کی بنیاد" محض پنج شیلا کی ظاہری شکل و صورت ہے۔ اور صرف الفاظ کی حد تک انہیں اساسِ اتحاد سمجھا جاتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو براہ کرم یہ بتایا جائے کہ کیا پنج شیلا کے پلیٹ فارم پر مجتمع ہونے والوں پر یہ لازم ہوگا کہ وہ پانچوں کے پانچوں اصولوں کو صدقِ دل سے تسلیم کریں یا ان میں سے ہر ایک کو اجازت ہوگی کہ وہ جس اصول کو گوارا سمجھے

Marfat.com

قبول کرلے اور جسے چاہے ترک کردے؟ اس سوال کی مجھے اس لیے ضرورت پیش آئی ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو "اقرار خدا" کے اصول کو مسترد کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا اور بایں ہمہ وہ "پنج شیلا" کے پلیٹ فارم پر متحد ہونے کے لیے تیار ہے۔

اگر مسلمان فرقہ اپنے خالص فکری اور نظریاتی وجوہ کے تحت "پنج شیلا" کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو یہ حضرات فی الفور اس پر یہ الزام لگانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ فرقہ اتحاد و اتفاق کا دشمن ہے۔ اس لیے صدر محترم! مجھے خطرہ ہے کہ پنج شیلا کو اساسِ اتحاد قرار دینا نہ صرف جمہوری اصولوں کے خون پر منتج ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ ہم اُن تمام اقدار کو نیست و نابود کر دیں گے جو انسان اور خدا کے مابین رشتہ استوار رکھنے کی ضامن ہیں اور اُن تمام قابلِ قدر معیارات سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جو افراد اور جماعتوں کے درمیان تعلقات کو پاکیزہ بنیادوں پر منظم کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارا ان لوگوں سے کوئی جوڑ نہیں ہو سکتا، جو اتنے عظیم نقصان کو پرکاہ کی حیثیت نہیں دیتے اور مسلمانوں سے اس نقصان کو برداشت کر لینے کی توقع رکھتے ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے نظریۂ زندگی سے دستبردار ہو جائیں۔ حالانکہ یہ نظریہ ان کے رگ و ریشے میں سمایا ہوا ہے اور اُن کے وجود اور ان کی طاقت کا اصل چشمہ ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہم اپنے ایسے مستحکم نظریہ زندگی

Marfat.com

کو تج کر چند بے حقیقت اصولوں کے مجموعہ کو اختیار کر لیں۔ جن کی ہر شخص جو چاہتا ہے تعبیر کر لیتا ہے۔ حالانکہ اگر مسلمان پنج شیلا کا اپنے مقدس نظریہ زندگی کے پیش کردہ اصول وضوابط سے جو صدیوں سے ان کا چشمہ حیات بنے ہوئے ہیں، موازنہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بے ربط افکار کا یہ مجموعہ ان کی روح کو اپیل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ ہر صاحب نظر یہ شخص ہمارے ان احساسات کی صحیح قدر و قیمت سمجھے گا۔ محض چند افکار و رجحانات کے اجتماع سے کوئی آئیڈیالوجی وجود پذیر نہیں ہوتی۔ بلکہ آئیڈیالوجی تو ایک بہت بالا چیز کا نام ہے۔ آئیڈیالوجی کے اجزائے ترکیبی اُس اساسی قوت سے ماخوذ ہوتے ہیں جو تقاضائے عقل اور جذبات قلب کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ آئیڈیالوجی عقل اور جذبات سے تشکیل پاتی ہے۔ فکر اور روح کی آمیزش سے تیار ہوتی ہے۔ یہ آمیزش جس قدر معتدل ہوگی اُسی قدر آئیڈیالوجی کی جڑیں گہری اور اُس کے اثرات دیرپا اور دُور رس ہوں گے۔

اس وضاحت کے بعد اندازہ لگائیں کہ وہ لوگ کس قدر غلط اندیشی سے کام لے رہے ہیں، بلکہ کس قدر ستم ڈھا رہے ہیں، جو اسلامی نظریہ کے حامیوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے متعصب اور بڑے جامد ہیں۔ حالانکہ ان طعنہ زنوں کو خوب معلوم ہے کہ اسلام ان کے دلوں اور دماغوں میں رچا ہوا ہے اور اسلام کے ماسوا وہ کسی بھی نظام کو اپنی زندگی کے لیے مفید اور موزون نہیں سمجھتے۔

Marfat.com

اسلام کو اساسِ ریاست بنانے کی وجہ

صدرِ محترم! جب ہم اسلام کو اساسِ ریاست قرار دینے کی دعوت دیتے ہیں تو اس کا محرک صرف یہ نہیں ہوتا کہ انڈونیشیا کی غالب اکثریت اسلام کی پیرو ہے ـــــ اگرچہ بذاتِ خود یہ ایک قابلِ احترام جمہوری اصول ہے ـــــ بلکہ اس دعوت کا بڑا محرک ہمارا یہ پختہ ایمان ہے کہ نظامِ جماعت اور نظامِ ریاست کے بارے میں اسلامی شریعت کے قوانین ہی فی الحقیقت ہمیں وہ بنیاد فراہم کر سکتے ہیں جو ریاست کے اندر بسنے والے تمام عناصر کے حقوق کے تحفظ و رعایت پر استوار ہو ـــــ

یہ ہے ہماری دعوت کا اصل پہلو۔ میں اور میرے رفقاء اس اجلاس میں بھی اور آئندہ اجلاسوں میں بھی کوشش کریں گے کہ اس پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

صدرِ محترم! قبل اس کے کہ میں اور میرے رفقاء اگلی بحث کا آغاز کریں، مجھے اجازت دیجئے کہ میں چند تمہیدی باتیں عرض کروں۔

ریاست کی بنیاد کے بارے میں دو نظریے

تاریخ کے آخری ادوار میں دنیا کے مختلف ممالک میں نظامِ ریاست کے لیے دو طرح کے راستے اختیار کیے گئے ہیں۔ ایک دین کا اور دوسرے لادینیت کا۔

لادینیت (سیکولرازم) سے مراد وہ نظریہ حیات ہے جو دنیوی زندگی کے مقاصد و مسائل میں ماوراء الطبیعی امور سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

Marfat.com

ان مسائل کے حل کے لیے وہ خدا اور آسمانی تعلیم سے بے نیاز ہے۔ اور حیات بعد الممات کے تصور کی وہ کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہے۔ لادینی نظریہ کے حامیوں کے نزدیک روزمرہ زندگی کے مسائل میں فرد اور خدا کے مابین رشتہ برقرار رکھنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ وہ مسائل خواہ اخلاق و معاملات سے تعلق رکھتے ہوں اور خواہ وہ ان روحانی روابط کو شامل ہو جو عبادات و اذکار کی صورت میں انجام دیے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر اگرچہ ایسا عنصر بھی پایا جاتا ہے جو خدا کے وجود کا قائل ہے۔

لادینیت پسند وحی کو عقیدہ و علم کا ماخذ تسلیم نہیں کرتا۔ ہم جس چیز کو عقیدہ اور اخلاقی اقدار کہتے ہیں وہ اس کے نزدیک خرافات ہیں جنھیں معاشرے نے اختراع کیا ہے۔ یا وہ محض تاریخی افسانے ہیں۔ یا وہ ان حیوانی آثار کا نتیجہ ہیں جو انسان کے اندر شروع سے پائے جاتے ہیں۔ اور اب بشری ارتقاء کے بعد موجودہ صورت اختیار کر گئے ہیں۔

روزمرہ زندگی پر لادینی نظریہ اور دینی نظریہ کے اثرات کا فرق

لادینی نظریہ کے حقیقی اثرات معلوم کرنے کے لیے ہم بطور مثال شادی کے مسئلہ کو لیتے ہیں۔ جس میں دین اور لادینیت، دونوں کی اصل حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔

فرض کیجیے ایک مذہب پر پرورش پذیر ایک لادین شخص سے رشتہ ازدواج قائم کر لیتی ہے۔ شادی کی جو رسوم کلیسا میں سرانجام دی

Marfat.com

گئی ہیں، عورت کی نظر میں گہری حقیقت کی حامل ہیں۔ ان رسوم کے زیرِ اثر عورت کے اندر یہ احساس موجزن ہے کہ زندگی نے ایک نیا تعلق استوار کیا ہے۔ خدا اس تعلق کو بابرکت بنائے۔ عورت کا یہ احساس اُس کے اندر ایک گونہ ایمانی حرارت اور فروتنی و خشوع کو بیدار کر دیتا ہے۔ لیکن خاوند کے نقطۂ نظر میں یہ ایک قانونی کارروائی سے زائد کچھ چیز نہیں ہے۔ اس کی تہ میں کوئی حقیقت پنہاں نہیں ہے۔ اس قانون کی حیثیت بھی اُس کی نگاہ میں دوسرے قوانین سے بالا نہیں ہے۔ وہ اس قانونی کارروائی کو اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتا جتنی وہ عام قانونی کارروائیوں کو دیتا ہے۔ مثلاً گاڑی میں سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ خریدنا۔ اس کے قلب پر اس کے ماسوا کوئی احساس و اثر مرتب نہیں ہوتا کہ اس نے بھی قانون کی اطاعت کی ہے جس طرح اکثر لوگوں کو اُس نے قانون کی اطاعت کرتے دیکھا ہے۔

چند سال کے بعد جب ان کے ہاں اولاد ہو جاتی ہے تو بیوی اولاد کے وجود کو محض ایک عورت کے بشری تقاضوں کا نتیجہ نہیں قرار دیتی۔ بلکہ وہ کوشش کرتی ہے کہ اس نئے فرد اور نئی جماعت کی تہذیب و تربیت کو افکار و خیالات کے اُن سانچوں میں ڈھالے جو نئے فرد اور نئی جماعت کے بارے میں یہ توقع پوری کر سکیں کہ وہ مستقبل میں ہدایت الٰہی کے مطابق انسانیت کی خدمت کریں گے۔ رہا خاوند، تو اولاد کے بارے میں اس کے احساسات کا دائرہ صرف اسی حد تک ہے، جس

Marfat.com

حد تک ہر انسان کا حصول اولاد کی آرزو اور خواہش کے لیے ہوتا ہے۔ پھر جب اولاد جوانی کی حدود میں قدم رکھتی ہے اور معاشرے اور ریاست کے اندر وہ نمایاں مناصب پر متمکن ہو جاتی ہے تو عورت کی نگاہ میں یہ مناصب منتہائے طمع اور آماجگاہِ نفس نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ فرائض و واجبات ہوتے ہیں۔ اور یہ وہ زینے ہوتے ہیں جن کی مدد سے بلند تر اور پاکیزہ تر مقاصد تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں لادینیت پسند خاوند کے بارے میں اگر ہم یہ نہ بھی کہیں کہ وہ ان مناصب کو مقصودِ زندگی سمجھتا ہے تو یہی کیا کم ہے کہ وہ انہیں تعیّش کا ذریعہ بناتا ہے جس کو باقی اور محفوظ رکھنے کے لیے محنت و کوشش ناگزیر ہوتی ہے۔ اس طرح ہمیں افراد کی زندگی میں لادینیت کے اثرات نمایاں طور پر واضح ہو جاتے ہیں۔

مذہب و علم میں تفریق کے نتائج

علم کے میدان میں ہم لادینیت کے علمبرداروں کو اس بات پر مُصر دیکھتے ہیں کہ علم کو مذہب اور اخلاقی و روحانی اقدار سے جُدا رکھا جائے۔ چنانچہ اسی وجہ سے یہ نظریہ وجود میں آیا ہے کہ معاشرتی علوم کو ادبی اقدار سے اور اخلاق کو علم النفس اور فلسفہ و قانون سے الگ رکھا جانا چاہیے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ علوم اور اخلاقی اقدار میں تفریق کسی حد تک علمی فوائد رکھتی ہے، لیکن یہاں کچھ اور بھی پابندیاں اور رکاوٹیں موجود ہیں جن کے تحت ہم معاشرتی علوم کو ادبی و اخلاقی اقدار سے بالا نہیں رکھ

Marfat.com

سکتے۔

سائنس نے ایٹمی توانائی دریافت کی ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ جن لوگوں نے ایٹم بم ایجاد کیا ہے کیا وہ اس کے استعمال کی ذمہ داری میں بھی شریک ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں جو لوگ سائنس کو اخلاقی اقدار سے بیگانہ رکھنے کے قائل ہیں، بآسانی اپنے آپ کو ایٹم بم کے استعمال کی ذمہ داری سے بری کر سکتے ہیں۔ اور پھر یہاں بھی ہمیں لادینیت کے اثرات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ سائنس کو ایک مستقل موضوع قرار دے کر اسے انسان کو اخلاقی ذمہ داریوں سے بالکل کر دیتی ہے۔

زندگی کے پیچیدہ مسائل میں لادینی نظریہ کی بے بسی

فرد اور جماعت کے تعلقات کے متعلق بھی لادینی نظریہ واضح بنیادیں پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لادینی نظریہ کسی ایک معیار کا پابند نہیں ہے، بلکہ مختلف مواقع پر مختلف معیارات کو استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ لادینیت پسندوں میں وہ لوگ بھی ملیں گے جو ازدواجی رشتہ کے بغیر مرد اور عورت کی خلوت کو حدودِ ادب سے تجاوز سمجھتے ہیں، اور وہ لوگ بھی ملیں گے جو اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ ایک ہی سوسائٹی کے افراد فرد اور جماعت کے تعلقات کی تعیین و توضیح عرف نوعیت کا تعین انتہائی اہم ہوتا ہے۔ ان تعلقات کی تعیین و توضیح عرف ہی کر سکتا ہے۔

Marfat.com

سرمایہ دار اور مزدور کے باہمی حقوق و فرائض کی تحدید کا کام یا دوسرے الفاظ میں انصاف و خوشحالی کو فروغ دینے کا کام بھی اسلام پوری طرح سرانجام دے چکا ہے مگر لادینی نظریے کے حامی اللہ تعالےٰ کو، یا اسلام کو قانون کا ماخذ تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھر ہم مجبور ہیں کہ ان امور کا ماخذ تلاش کرنے کے لیے عہدِ قدیم سے انسانی سوسائٹی جن جن مراحل سے گزری ہے، ان سب مراحل کا جائزہ لیں (جیسا کہ اس نظریے کے حامیوں کا فلسفہ ہے)۔ لیکن اس چھان بین سے بھی ہم کسی واضح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیوں کہ دنیا کے اندر ہزاروں سوسائٹیوں کا وجود ملتا ہے۔ جنھوں نے اپنے لیے طرح طرح کے اخلاقی اصول اختیار کیے۔ مثلاً "سنو دکشی" کو لیجئے۔ ایک معاشرے کے اندر ہم اسے حرام پاتے ہیں، مگر دوسرے معاشرے کے اندر اسے جائز بلکہ مستحسن دیکھتے ہیں۔ اب ہم ان دونوں میں سے کس اصول کا انتخاب کریں؟ —— بہرحال ریاست کے لیے افراد کے حقوق کا تعین ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس مسئلہ کے بارے میں ریاست جو قوانین بنائے گی اُسے کوئی ایک ماخذ قبول کرنا ہوگا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ لادینیت اس مسئلہ پر واضح روشنی ڈالنے سے عاجز ہے۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ "انسانی زندگی کی کیا حقیقت ہے؟" تو اس سوال کا جواب لادینیت پسندوں کے پاس کچھ نہ ہوگا، بلکہ وہ اس سوال کا جواب دینا ہی غیر اہم سمجھیں گے۔ مگر ظاہر ہے کہ جو شخص

Marfat.com

انسانی زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہے وہ لازماً روحانی انحطاط کا شکار ہوگا۔

لادینی نظریہ انفرادی زندگی میں طرح طرح کی نفسیاتی اور روحانی بیماریوں کے پھیلنے میں مددگار عامل کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے ایک ٹھوس اور مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جونہی یہ سہارا مفقود ہو جاتا ہے، انسان شدید نفسیاتی عقدوں میں الجھ جاتا ہے۔ انفرادی زندگی کو ایسے حالات سے دوچار کر دینا لادینیت کا طبعی تقاضا ہے۔ لیکن انسانی نفس اور انسانی روح کی سلامتی اور صحت مندی کے لیے دین جو اہم خدمات بسر انجام دیتا ہے اُن کا اعتراف جدید علم النفس بھی کر چکا ہے۔

سیکولر ریاست میں اقتصادی، تنظیمی، تعلیمی اور اجتماعی معاملات کی زمامِ کار انسان کے مادی مصالح کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں روحانی مصالح بھی ان معاملات میں دخیل ہوتے ہیں لیکن صرف ان حدود تک جو انسان ان کے لیے مقرر کر دیتا ہے۔

لادینیت کا سب سے خطرناک پہلو

لادینیت کے اثرات کی ایک اور قسم دیکھنے میں آتی ہے۔ جو ان سب سے زیادہ خطرناک ہے جن کا ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ لادینیت انسانی اقدار کا ماخذ خدا سے چھین کر انسان کے

Marfat.com

ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ لہٰذا جو تعلیم انسانی جان کے قتل کو حرام قرار دیتی ہے اور باہمی الفت و محبت کو لازم ٹھیراتی ہے۔ لادینیت پسند شخص کی نظر میں اس تعلیم کا ماخذ وحی الٰہی نہیں ہے، بلکہ یہ محض معاشرتی زندگی کا ایک تقاضا ہے۔ ادوارِ گزشتہ میں ہمارے آباؤ اجداد کو جب یہ محسوس ہوا کہ پُرامن زندگی بسر کرنے اور امدادِ باہمی کا اصول اختیار کرنے میں تمام انسانوں کا بھلا ہے تو لادینیت پسند کی رائے کے مطابق اسی احساس نے اس تعلیم کو جنم دیا جو جنگ و جدال اور کشت و خون کو ناپسندیدہ ٹھیراتی ہے۔ اس نظریے کے خطرناک اثرات کا ہمیں اُسی وقت اندازہ ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ تمام انسانی اقدار کو، آداب و اخلاق کو اور عقائد و افکار کو بالا سطح سے گرا کر انسانی ایجادات کے دائرے میں لاکر رکھ دیتا ہے اور انہیں طبقاتی کشمکش کے نتائج گردانتا ہے۔ ان اثرات کو قبول کرنے کے بعد انسان کی نگاہ میں یہ تمام مقدس اقدار بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ خود اُس کی ذات ان اقدار سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ لہٰذا ہم جن چیزوں کو بنگاہِ تقدس و احترام دیکھتے ہیں، لادینیت پسند کے نزدیک وہ قطعاً قابلِ اعتبار و قابلِ احترام نہیں ہیں، بلکہ وہ انہیں ایک ایسا لوہے کا پُرزہ سمجھتا ہے جسے انسان نے ایجاد کیا تھا۔ (اور جسے ناکارہ ہو جانے پر پھینک دیا جاتا ہے)۔

لادینیت پسندوں کی نگاہ میں خدا کے وجود اور مذاہب کا تصور محض خرافات ہے۔ انسانی تخیل کا کرشمہ ہے۔ انسانی معاشرہ کی

Marfat.com

ایجاد ہے۔ وحی کے ساتھ اس تصوّر کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ لوگ وجودِ باری کے تصوّر کو ایک اضافی تصوّر سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ تصوّر انسانی تخیلات کی تبدیلیوں سے تبدیل ہوتا رہا ہے۔ اور اس تصور کا ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتے رہنا ناممکن نہیں ہے۔

خدا کے بارے میں صدر سوکارنو کا تصوّر

آیئے اب ہم وجودِ باری اور منبع مذاہب کے نظریے کے بارے میں لادینیت پسندوں کے نقطۂ نگاہ کا جائزہ لیں۔

صدر سوکارنو نے "پنج شیلا" کے پہلے اصول ——— اقرارِ خدا ——— کی وضاحت کرتے ہوئے (جسے کچھ حضرات نے ایک ایسا نقطۂ مصالحت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جسے ریاست کی بنیاد میں کونے کے پتھر کا مقام حاصل ہے) فرمایا تھا:

"الوہیت، جس سے میری مراد وہی ہے جو انڈونیشیا کے باشندے بیسیوں، بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں سالوں سے لے رہے ہیں ——— کی حقیقت یہ ہے:

میں سرزمین انڈونیشیا کا ایک کسان ہوں۔ اس میدان میں سب سے پہلے میں نے جس کا مشاہدہ کیا، وہ "مذہبی اسپرٹ" ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ انڈونیشی قوم زراعت پر گزر بسر کرتی ہے۔ اور جو قوم زراعت پر گزر بسر کرتی ہو وہ لازماً مذہب پرست ہوگی۔ میں نے ابھی "اقرارِ خدا"

Marfat.com

کے لفظ کا استعمال نہیں کیا بلکہ "مذہبی اسپرٹ" کہا ہے
جس سے میری مراد غیبی قوتوں کے وجود کا عقیدہ ہے جو
ہماری زندگی پر کارفرما ہیں۔ اس عقیدے کا احساس ہم ہر
اُس قوم کے اندر جاگزیں دیکھتے ہیں جو زراعت پر گزر اوقات
کرے۔ یہ ہے بھی درست۔ کاشتکار شخص اپنے دل
کی گہرائیوں کے اندر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس دنیا میں
ایک غیبی قوت موجود ہے جس پر اس کی تمام محنتوں اور
مشقتوں کا دارومدار ہے۔ مثلاً کاشتکار بارش کا آرزومند
ہوتا ہے۔ اس آرزو کو پورا کرنے کی وہ کس سے درخواست
کرے ہے ——

فرض کیجئے ہمارے پاس کچھ زرعی زمینیں ہیں جن میں
چاول اور مکی کی کاشت کرتے ہیں۔ اب اگر بارش نہ برسے
گی تو بلاشبہ یہ کھیتیاں مرجھا جائیں گی۔ ایسی صورتِ حال میں کاشتکار
فی الفور اس غیبی قوت کو یاد کرتا ہے جو اُس کی خواہش کی
تکمیل کر سکتی ہے۔ یہی صورت اس کے برعکس پیش آتی ہے۔
جب کٹائی کا وقت آجاتا ہے تو ایک کسان تمنا بر لب
رہتا ہے کہ زور کی بارش نہ ہو جس سے اس کی فصل برباد
ہو جائے۔ وہ اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ دوبارہ غیبی
قوت کی جانب رُخ کرے۔ اس امر کا احتمال ہے کہ

Marfat.com

اُسے ابھی یہ شعور نہ ہو کہ وہ غیبی قوّت اللہ ہی ہے ، بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کے لفظ تک کو بھی نہ جانتا ہو۔ لیکن بایں ہمہ اُس کا دل سراسر اس غیبی قوّت کی جانب مائل رہتا ہے ۔ اور وہ گویا زبانِ حال سے پکار رہا ہوتا ہے : "اے پردہ غیب میں رہنے والی قوّت ! آج کے بعد بارش نہ برسایئو ، مجھے اب دھوپ اور خشکی کی ضرورت ہے ۔" کاشتکار بارش اور خشکی کی توقع اس غیبی قوت سے وابستہ رکھتا ہے جس پر اس کا ایمان ہوتا ہے ۔

میں نے زرعی بیماریوں اور جراثیم کا ذکر نہیں کیا ، جو فصلوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں ۔ کون جانتا ہے کہ شاید کاشتکار غریب کو ابھی یہ سمجھ نہ ہو کہ اس کی کھیتی کو برباد کرنے والی یہ مذکورہ آفات ہیں ۔ اسی حقیقت سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جو قوم زراعت پر جیتی ہو اس کا مذہب پرست ہونا ناگزیر ہے ۔ البتہ جو قومیں صنعتی میدان میں داخل ہو چکی ہیں وہ اکثر و بیشتر مذہب کو ترک کر دیتی ہیں ۔ میرا منشا ترکِ مذہب کے نظریے کی تحسین نہیں ہے بلکہ میں نے صرف بر سبیل مثال یہ ذکر کیا ہے ۔ صنعت پر دار و مدار رکھنے والی قومیں مذہب کا قلادہ کیوں اتار دیتی ہیں ؟

Marfat.com

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا واسطہ مسلّمات اور حقائق ثابتہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً جب کسی شخص کو روشنی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اُس کے اندر غیبی قوت کے حضور گڑگڑانے کا کوئی داعیہ نہیں اُبھرتا۔ وہ بجلی کا بٹن دبا کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے۔ میں نے مذہب پر ایک لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا کہ مذہبی اسپرٹ مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ کیونکہ معاشرے کا مزاج ڈائنا میٹک ہوتا ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔ لہٰذا انسانی معاشرہ غیر جامد ہے، وہ کسی ایک مرحلہ پر سکون نہیں اختیار کر سکتا۔ بلکہ وہ برابر حرکت و تغیّر میں رہتا ہے۔ متحرک رہنا اس کی فطرت ہے۔ ویسے ہی جیسے انسان کی زندگی تغیّر پذیر ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر مذہب کی روح بھی مختلف شکلیں اور مختلف رنگ بدلتی رہتی ہے۔ انسان جب جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتا تھا، اور اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ زراعت کیا ہوتی ہے اور درختوں اور غاروں کے سوا اُسے دوسرے مساکن کا کچھ پتہ نہ تھا، اور شکار سے خوراک حاصل کرتا تھا، دین داری کی روح اُس وقت بھی اُس کے اندر موجود تھی۔ لیکن وہ کس کی عبادت کرے؟ ——— کبھی وہ کوندنے والی بجلیوں کی پرستش کرنے لگتا، کیونکہ

Marfat.com

وہ جانتا تھا کہ درختوں کے اندر وہی آگ کے شعلے بھڑکا تی ہے۔ کبھی دریاؤں کے آگے پیشانی رکھتا، کیونکہ وہ اُسے مچھلی مہیا کرتے تھے۔ بلکہ پتھر تک کو پوجنے لگ جاتا کیونکہ وہ اُسے درندوں اور وحشی جانوروں سے حفاظت میں مدد دیتے تھے۔ وہ جب بادل کی کڑک سُنتا تو سر بسجود ہو جاتا۔ وہ خیال کرتا کہ یہاں ایک غیبی قوت موجود ہے جو بادل کے ایک ٹکڑے سے دوسرے ٹکڑے کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے اور اسی سے یہ آوازیں اٹھتی ہیں۔ لہٰذا وہ قدیم انسان اپنے مخصوص رنگ میں ایک مذہبی انسان تھا۔ جب انسانی زندگی میں انقلاب رونما ہوا اور انسان جنگلوں اور غاروں کو ترک کر کے زراعت سے خوراک حاصل کرنے لگا تو اُس وقت بھی انسان مذہب پرست تھا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ جس غیبی طاقت پر اُس کا ایمان تھا وہ ایک نئی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ یعنی انسان نے بجلی کی کڑک، پتھر اور درخت کی پوجا کو چھوڑ کر حیوان کی پوجا شروع کر دی۔ آج بھی ہمیں بعض قوموں کے اندر اس عقیدے کے نشان ملتے ہیں۔

زراعت کے دور میں انسان کا امورِ غیب پر ایمان زیادہ پختہ ہو گیا۔ البتہ امورِ غیب کے بارے میں اُس کا

Marfat.com

تخیّل اس انسان کے تخیّل سے مختلف ہے جو جنگلوں میں رہتا ہے اور شکار سے خوراک حاصل کرتا ہے یا جس کی زندگی کا مدار بھیڑ بکریوں کی پرورش پر ہے۔ لیکن چونکہ زرعی انسان کی زندگی موسموں کے تغیّرات پر موقوف ہے، اس لیے اس کا مذہب پرست ہونا یقینی بات ہے۔

یہی صورت ہم اس انسان کے اندر دیکھتے ہیں، جو زراعت سے ترقی کر کے صنعت تک پہنچ چکا ہے۔ صنعتی انسانوں کی اکثریت مذہب کو خیرباد کہہ چکی ہے۔ کیوں کہ وہ جس دنیا میں رہتی ہے وہاں سب کچھ تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اِسی دنیا کے اندر سے ایسے اصول اُبھرے جو اللہ کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ اور یہاں سے ہی الحاد کے ظہور کا آغاز ہوا۔ لیکن ـــــ میرے بھائیو! ـــــ اگر تم مجھ سے ـــــ یعنی سرکارِ نو کی ذات سے ـــــ پوچھو کہ کیا میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں، تو میرا جواب لامحالہ یہ ہوگا: بے شک، میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں، بلکہ میں ایک اللہ پر ایمان رکھتا ہوں جس کا کوئی ثانی یا ثالث نہیں ہے۔ وہ اللہ جو زندگی کے تمام عناصر پر، انسان کی حرکات و سکنات پر، اور انسان کی ترقی پذیر ایجادات پر نگران ہے۔ عہدِ قدیم میں جب انسان جنگلوں، درختوں

Marfat.com

اور غاروں میں رہتا تھا وہ درختوں، غاروں، بادل کی گرجوں اور دریاؤں کو معبود سمجھتا تھا۔ پھر جب انسان مویشیوں پر زندگی بسر کرتا تھا وہ انہی مویشیوں کو اپنا خدا تصور کرتا تھا ـــــ بلکہ آج بھی ہمیں وہ انسان ملتا ہے جو جانوروں کی پوجا کرتا ہے ـــــ اس کے بعد جب انسان کھیتی باڑی پر جینے لگا تو اس کا ایمانی تخیل اور نوعیت کا ہو گیا۔ لیکن جب صنعتی دور آیا تو انسانوں کی کثیر تعداد نے عقیدۂ خدا کو ترک کر دیا۔ لیکن میں خود شخصی طور پر مانتا ہوں کہ اللہ موجود ہے۔ میں کئی مرتبہ ان چار اندھوں کی کہانی بیان کر چکا ہوں جنھیں ہاتھی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ان کا ایک دوست انھیں فیل خانے میں لے گیا۔ ان میں سے ایک اندھے نے بڑھ کر ہاتھی کی سونڈ کو پکڑ لیا، اور کہنے لگا: "میں سمجھ گیا ہوں، ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ یہ بل کھاتے ہوئے اژدھا سے ملتا جلتا ہے۔" دوسرے نے دم کو چھوا اور چیخ اٹھا: "یہ کوڑے کی مانند ہوتا ہے۔" تیسرا ہاتھی کی ٹانگ کو پکڑ کر کہنے لگا: "یہ کھجور کے تنے جیسا ہوتا ہے"۔ چوتھا اندھا جو کوتاہ قد تھا، ہاتھی کے نیچے چلا گیا اور ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ مگر کوئی چیز اس کے ہاتھ نہ لگی۔ چنانچہ وہ بے اختیار چلا اٹھا: "یہاں تو خلا ہی خلا ہے۔ ہاتھی کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

Marfat.com

بعینہٖ اس مثال کا مصداق ہم ان لوگوں کو دیکھتے ہیں، جو صنعتی دنیا میں رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا موجود نہیں ہے۔

بہرحال انسانی ایجاد فطرۃً تغیّر پذیر ہے ....."

یہ طویل اقتباس میں نے صدر سوکارنو کی اس تقریر سے لیا ہے جو انہوں نے "قصرِ جمہوریہ" میں "دفاعِ پنج شیلا کونسل" کے سامنے ۱۷ر جولائی ۱۹۵۴ء کو کی ہے۔ اور جسے وزارتِ اطّلاعات نے بڑے اہتمام سے طبع اور شائع کیا ہے۔

تغیّر پذیر "خدا"

جنابِ صدر! صدر سوکارنو کے مذکورہ الفاظ نے خدا کے ماننے والوں پر، خواہ وہ کاشتکار ہیں یا صنعت کار، جتنا کچھ اثر ڈالا ہے وہ تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کر سکتا ہوں۔ لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔ میں اب صرف لادینیت کے موضوع پر اپنی بحث کو جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ البتہ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ لادینی نظریہ کے حامی خدا کے تصوّر کو اضافی تصور کی حیثیت سے پیش کرتے جو معاشرے کے ارتقاء سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یعنی معاشرہ زرعی دور سے ترقی کر کے جب صنعتی دَور میں یا دوسرے دوروں میں داخل ہوتا ہے تو ساتھ ساتھ خدا کے تصوّر میں بھی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ اس نظریہ کو ہم مختصر الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ "انسان جب تک کھیتی باڑی پر زندگی بسر کرتا ہے تو اُسے خدا کی ضرورت

Marfat.com

محسوس ہوتی ہے، اور جب صنعت کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اُس کے لیے خدا کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی ـــــ صدر سوکارنو کے الفاظ سے یہ بالکل واضح ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ پھر وحی، جو عقیدۂ خدا کا ماخذ ہے، کا کیا مقام ہوگا؟ میری مراد اُس وحی الٰہی سے ہے جو زمانی اثرات مثلاً زراعت کے اثرات یا صنعت کے اثرات سے بالا و پاک ہے۔ وہ وحی، جس نے انسان کو زندگی کا نسخہ کیمیا عطا کیا، جو انسانیت کو ضلالت و سرگردانی اور تلاشِ خدا میں اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارنے سے نجات دیتی ہے۔ یہ سوال دو ٹوک جواب چاہتا ہے۔ لادینیت کے علمبرداروں کے نزدیک الوہیت اور عقیدۂ خدا کا موضوع وحی سے ادنیٰ تعلّق بھی نہیں رکھتا۔ ان کے نزدیک خدا کا تصوّر انسان ہی کی ایجادات میں سے ایک ایجاد ہے۔

صدر محترم! یہ دراصل مارکسزم کے علمبرداروں کا نظریہ ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے دین اور فلسفہ کا ماخذ وحی نہیں ہے بلکہ انسانی معاشرہ اور اس کے معاشی حالات ہی دین و فلسفہ کا تصوّر معین کرتے ہیں۔ تنگیٔ وقت کی بنا پر میں اس نظریہ پر بھرپور تنقید نہیں کر سکتا۔ میں امید رکھتا ہوں کہ کسی دوسری فرصت میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کروں گا۔

لادینی نظریہ اور نازی ازم

ریاست پر لادینی نظریہ جو کچھ اثرات ڈالتا ہے ان کا اندازہ ہمیں جرمنی نازیت سے ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ نازی ازم

Marfat.com

کا ظہور ہٹلر کی تحریک، اور حالات کے تقاضے کا نتیجہ ہے لیکن نازیت
کا پیرو ہرمین راؤسچننگ (Herman Rauschning) جو بعد
میں نازیت کا سب سے بڑا دشمن بن گیا تھا، برملا کہتا ہے کہ نازیت
کا ظہور اڈولف ہٹلر نامی شخصیت کی دعوت کا نتیجہ قرار دینا بالکل غلط
ہے۔ بلکہ نازیت در حقیقت مغربی تہذیب کے دامن میں چھپے ہوئے
مخدوم محرکات کی پیداوار ہے۔ ان میں سے سب سے بڑا محرک
وہ "غیر جانب دارانہ موقف" ہے جو روحانی اقدار اور مذہب کی تعلیم
کے بارے میں اختیار کیا گیا۔ نازی ازم کی نگاہ میں مذہب کی تعلیم کا
اعتبار ایک کمزوری قرار پا گیا۔ اور پھر لادینیت کے نظریہ کے ظہور
نے روحانی اقدار کو سرے سے انسان کی ایجاد قرار دے دیا۔ ہمیں حکومت
کے دائرے میں لادینیت کا نظریہ قوانین کو کمزور اور انصاف کے تقاضوں
کو پامال کرتا ہوا ملتا ہے۔ اور اس کے حامیوں پر غیر معمولی اثر ڈالتا ہے
مثلاً سب سے بڑا انسانی جرم، جو نازیت کی کارفرمائی نے سرانجام دیا، اس
کے مقابلے میں حکومت اور عدالت کے محافظین (پولیس اور عدلیہ)
غیر جانب دارانہ موقف اختیار کرتے ہیں۔ اس موقف کی ابتداء...
(بسمارک) کے دور سے بلکہ اس سے پہلے ہو گئی تھی... بہرحال ہمارے
لیے یہ مشکل ہے کہ ہم جرمنی کے اس وقت کے حالات کو انیسویں
صدی کے مغربی یورپ کے حالات سے بے تعلق ٹھہرائیں۔" ہرمین
راؤسچننگ صاف صاف کہتا ہے کہ نازیت کی پیدائش کی ذمہ داری

Marfat.com

صرف جرمنی پر ہی نہیں بلکہ پوری مغربی تہذیب پر ڈالنی چاہیے۔ یعنی مغربی تہذیب کی گود میں پرورش پانے والے لادینی اثرات بھی اس انسانیت کش تحریک کے جرائم میں شامل ہیں۔

ہرمین راؤ شننگ اور دوسرے مفکرین کی کثیر تعداد اس امر پر متفق ہے کہ نازی تحریک کے جذبات دراصل "لاوجودیت" کی بنیادوں پر قائم تھے۔ "لاوجودیت" کے حامیوں کا عقیدہ تھا کہ زندگی کی اصل چیز استیلاء، برائے استیلاء اور قوت برائے قوت کا حصول ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا جذبہ صرف اُس سوسائٹی میں زندہ رہ سکتا ہے جس میں لادینیت کو نشوونما مل رہا ہو۔ "لاوجودیت" کا یہی جنون — بالشویک تحریک میں بھی کارفرما تھا۔ کیوں کہ یہ تحریک بھی لادینیت کے اصول پر ایمان رکھتی تھی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ نازیوں کے بعد یہ دوسری تحریک ہے جس نے انسانیت کا قتلِ عام کیا ہے اور وحشت و بہیمیت کے جگر دوز جرائم کا ارتکاب کیا ہے، اور جو لادینیت کے تباہ کن نتائج و اثرات کا بیّن ثبوت ہے۔

خدا کی حاکمیت کیوں؟

صدرِ محترم! دین اور لادینیت کے دور رس نتائج کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے سیاست قدیم زمانے سے — یعنی افلاطون کے عہد سے — لے کر آج تک اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دیتے آئے ہیں اور اس پر غور و فکر کا کثیر سرمایہ خرچ کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ

Marfat.com

عہدِ حاضر کا فرانسیسی ماہر سیاسیات الکسیس ڈی ٹوکویل
ALexiSdeTOCQUE VILLE ریاست کی
تعمیر کے لیے دینی تعلیمات کو بحیثیت ماخذ اور لادینیت کو ٹھکرا دینے کو انتہائی
ضروری امر قرار دیتا ہے۔ ڈی ٹوکویل کہتا ہے:

"مطلق اقتدار فی الواقع ایک بہت بُری چیز ہے اور
خطرناک بھی۔ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ
اقتدارِ مطلق کو دور اندیشی اور احتیاط کے ساتھ استعمال کر
سکے۔ اقتدارِ مطلق کا مرجع صرف خدائے واحد کی ذات
ہے۔ کیوں کہ اس کے اقتدار کی کارفرمائی کے پہلو بہ پہلو
اُس کی حکمت اور اُس کا عدل بھی کارفرما ہے۔ لیکن دنیا کے
اندر کوئی ایسا معتبر اور قابلِ اطاعت اقتدار نہیں پایا جاتا،
جس کے احکام کو میں ہر ہر معاملے میں غیر مشروط طور پر قبول
کرتا جاؤں۔ جب میں یہ معلوم کرتا ہوں کہ کسی قوم یا کسی
ملک کو، یا کسی حکومت کو خواہ وہ شخصی ہو یا ڈیموکریٹک
یا بادشاہت ہو یا ری پبلک ہو، اقتدارِ مطلق سونپ دیا
گیا ہے تو مجھے اُسی وقت انتشار و انارکیت کے بیج نظر
آنے لگتے ہیں۔ اور میں فوراً ایک ایسی ریاست کی تلاش
کرنے لگتا ہوں جو میری حقیقی آرزو پوری کرے۔"

کیا ہم انڈونیشیا کی سیکولر ریاست میں کئی برس گزار کر دیکھیں کہ

Marfat.com

وہ اس وقت بھی سیکولر ہے)۔ لادینیت کے ان خطرات کی حقیقت کو نہیں سمجھ پائے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے؟ —— کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ لادینی رجحانات کی بدولت ہمارے معاشرے کے اندر طرح طرح کے مفاسد کے در کھلے۔ زندگی کی بیش قیمت اقدار انحطاط کا شکار ہوئیں۔ حکمران گروہ نے ان برتر اقدار کی خلاف ورزی کی اور انہیں تحکمانہ انداز سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی اور پھر قوم بھی ان کے نقشِ قدم پر چلی؟ کیا لادینی نظریات ہی ہمارے ملک کے اندر الحاد کے فروغ کا باعث نہیں ہوئے؟

"انسان دوستی" کا لادینی اصول

اگر ہم لادینیت کے عمدہ ترین اصول —— "انسان دوستی" —— کا موازنہ بھی دین سے کریں تو دین ہمیں اس کے مقابلے میں زیادہ وسیع الاثر اور قرینِ عقل نظر آتا ہے۔ "انسان دوستی" کے اصول کے معاملے میں دین ہمارے سامنے ایک نہایت اعلیٰ معیار کا عملی نمونہ پیش کر دیتا ہے۔ مگر لادینیت اس معیار کو نظریاتی خول سے باہر نہیں نکال سکی۔ لیکن اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ "انسان دوستی" کا ماخذ کیا ہے اور وہ کون سی بنیاد ہے جس پر یہ استوار ہوتی ہے؟

مثلاً کمیونزم "انسان دوستی" کے بارے میں جو منہاج رکھتا ہے وہ ہمارے منہاج سے کروٹ بحرف مختلف ہے۔ ایک آئیڈیل

Marfat.com

کمیونسٹ اسٹیٹ انفرادی ملکیت کو "انسان دوستی" کے اصول کے منافی سمجھتی ہے جب کہ ہم انفرادی ملکیت کو انسان دوستی کی ناگزیر شرط قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بشری میلانات کے عین مطابق ہے۔

اس امر میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ "لادینیت" اس بات سے قاصر ہے کہ جب معاشرے کی نظریاتی اساسات کے بارے میں فکری کشمکش برپا ہو جائے تو وہ کوئی فیصلہ کن حل پیش کر سکے۔ مثلاً یہ نظریہ کہ "معیاری معاشرہ" کیا ہے اور اس تک پہنچنے کا طریق کار کیا ہے؟ ان نظریات کے بارے میں فکری اختلاف و کشمکش کا حل لادینی نظام کے ذریعہ، جو زندگی کے تمام نظریات و اساسات کو اضافی امور قرار دیتا ہے، قطعاً ناممکن ہے۔ دین کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ دین زندگی کی جو اساسات پیش کرتا ہے وہ اضافت و عرض سے بالا و پاک ہیں۔ اور یہی چیز دینی اساس پر قائم ہونے والے ..... انسان دوستی کے اصول کو زیادہ جامع، ہمہ گیر اور زیادہ قرین منطق و قیاس ٹھہراتی ہے۔ دین زندگی کے بارے میں جو اساسات فراہم کرتا ہے وہ دائم و ثابت اور ناقابلِ تغیر ہوتی ہیں۔ ان کا ایک منبع

(Point Reference) ہوتا ہے۔ اس منبع کے بغیر تمام مسائل حل ہونے کے بجائے مزید الجھتے جاتے ہیں۔

انسانی زندگی کے اندر کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس کو دین یا فلسفہ زندگی سے الگ کر دیا جائے۔ اس لیے ہمیں دو راستوں میں سے

Marfat.com

ایک کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ دین کا راستہ یا لادینیت کا راستہ۔ لادینیت کے راستہ کے جو خصائص ہمیں ان گذشتہ چند سالوں کے اندر مشاہدہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کی بنیاد پر ہم کہیں گے کہ لادینیت کا راستہ انسانی معاشرے کو کوئی مضبوط بنیاد مہیا نہیں کر سکتا، بلکہ یہ اُلٹا فرد اور جماعت کے صحیح تعلقات کی جڑ کاٹنے والا ہے۔

دین کے خصوصی امتیازات

صدرِ مجلس! اس امر میں دو رائیں نہیں ہیں کہ دین خصوصی امتیازات کا حامل ہے۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ دین کی حقیقت کیا ہے؟ دین ایک نظریہ زندگی کا نام ہے۔ جو چند بنیادوں سے عبارت ہے:

۱۔ خدا پر ایمان لانا اور اسے اقتدار اور انسانی زندگی کی اعلیٰ اقدار کا ماخذ تسلیم کرنا۔

۲۔ وحی پر ایمان لانا۔

۳۔ یہ تسلیم کرنا کہ انسان اور خدا کا براہِ راست تعلق ہے۔

۴۔ یہ تسلیم کرنا کہ یہ تعلق افراد کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۵۔ حیات بعد الممات کا عقیدہ رکھنا۔

۶۔ یہ تسلیم کرنا کہ عبادات ہی تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہیں۔

۷۔ خوشنودیٔ رب کو زندگی کا مقدس مقصد قرار دینا۔

علاوہ ازیں اور بھی متعدد بنیادیں ہیں جنہیں بیان کیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

لیکن دین کی حقیقت کا مجمل نقشہ معلوم کرنے اور لادینی نظاموں کے مقابلے میں دینی نظام کے امتیازی اوصاف کو سمجھنے کے لیے مذکورہ بالا چند بنیادوں کا مطالعہ ہی کافی ہے۔

دین اپنے پیروکاروں کو علوم و حقائق کے مطالعہ کا وسیع میدان فراہم کرتا ہے۔ لادینی نظریہ علوم کو صرف تین بنیادوں میں محصور کر دیتا ہے۔ ایک تجرباتی بنیاد (Experimentalism) دوسرے عقلی بنیاد (Rationalism) اور تیسرے بدیہی بنیاد (INTUITIONISM) لادینی نظریہ "وحی" کو اساس علم نہیں تسلیم کرتا۔ مگر دین مذکورہ بالا اساسات کو بھی تسلیم کرتا اور اُن کے دائروں کا تعین کرتا ہے، اور وحی کو بھی درجۂ اول کا ماخذِ علم و فکر تسلیم کرتا ہے۔ اس لحاظ سے دین لادینی نظاموں کی نسبت علوم و حقائق کے میدان میں بہت وسیع الاطراف ہے۔

دین زندگی کے ہر گوشے پر خوشگوار اثرات ڈالتا ہے۔ مثلاً دین مرنے والوں کے اعزّا کو ایک اطمینان بخش توجیہہ مہیّا کرتا ہے، وہ یہ تصوّر دیتا ہے کہ انسانی زندگی کا اندرونہ اپنی معنویت رکھتی ہے۔ اور دنیا کا کوئی ایسا حادثہ نہیں ہے جس کا تعلّق خالق کائنات سے نہ ہو۔ الغرض یہ کہ دین انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی خواہ وہ فکری ہوں یا جذباتی، پوری رہنمائی کرتا ہے۔ لادینی نظاموں میں یہ حقیقت مفقود ہے۔ مارکسزم اور ڈارونزم کے علمبردار جسم اور روح کے افتراق کی کوئی توجیہہ نہیں پیش کر

Marfat.com

سکتے۔ کیونکہ یہ انسانی زندگی کو محض طبعی ارتقاء کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یعنی ان کی نگاہ میں کائنات کی دوسری اشیاء میں اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

دین فکر اور جذبات کے اندر ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ کیوں کہ دین صرف چند عقائد کی دعوت پر اکتفاء نہیں کرتا، بلکہ مختلف عوامل کی بدولت دین کے اندر ایسی طاقت موجود ہے جو انسانی قلوب کی دنیا کے اندر تہلکہ ڈال سکتی ہے اور جذبات کو حرکت میں لا سکتی ہے۔ اس معاملے میں دین اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے فلسفہ سے بالکل مختلف ہے۔

مشہور فلاسفر اور ماہر نفسیات ولیم جیمس (William James) نے یہ موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ آغازِ مسیحیت میں مسیحیت کے پیروکاروں کے اندر مسیحی عقیدہ کی اثر انگیزی اور فلسفہ سٹوا (Stoa) کے پیروکاروں کے اندر اصول "انسان دوستی" کی اثر انگیزی میں کیا کچھ فرق ہے۔ جیمس کی نگاہ میں دونوں گروہ عقیدۂ خدا میں متحد ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ اول الذکر کا ماخذِ عقیدہ دین ہے اور ثانی الذکر کا فلسفہ۔ دین مسیح کے پیروکاروں کے اندر جذبات کے جو سمندر متلاطم کر دیتا ہے وہ اُن اثرات سے سراسر مختلف ہیں، جو انسان دوستی کا مذہب سٹوا کے پیروکاروں کے اندر پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ دونوں میں اکثر و بیشتر مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ باطنی قوتیں اور جذبات

Marfat.com

دین کا امتیازی سرمایہ ہیں اور یہ نفس انسانی کے اندر ایسے پائدار نقوش مرتسم کرتی ہیں جو کسی طور کھرچے نہیں جا سکتے۔ ایک دوسرے فلاسفر امیل ڈرکھیم (Emile Durkheim) نے اس مسئلہ کو یوں بیان کیا ہے:

"مذہب کا قائل اور خدا سے تعلق رکھنے والا وہ شخص نہیں ہوتا جو کسی ایسی نئی حقیقت کو دیکھتا ہو جسے مذہب کو نہ ماننے والا نہ جانتا ہو، بلکہ مذہب کا قائل وہ شخص ہوتا ہے جو مصائب کو برداشت کرنے اور مشکلات کا سامنا کرنے بلکہ ان پر قابو پانے میں سب سے زیادہ ثابت قدم ہو۔"

پنج شیلا میں "اقرارِ خدا" کی حقیقت

انڈونیشیا کے باشندوں کے جذبات کو جو نظامِ زندگی متحرک کر سکتا ہے، وہ دینِ حق ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ پنج شیلا جنہیں بعض لوگوں کے خیال میں عوامی تائید حاصل ہے، یا انہی جیسے اصولوں کا کوئی اور مجموعہ ہماری ریاست کی بنیاد قرار پانے کے بجائے دینِ حق ریاست کی بنیاد بننا چاہیئے۔ پنج شیلا کو واجب الایمان دین کی حیثیت سے کسی نے قبول نہیں کیا۔ اور اگرچہ ان پانچوں اصولوں کے اندر ایک اصول "اقرارِ خدا" بھی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ اصول لادینی امزاج کے حامل ہیں۔ ان کی اساس روحی سے ماخوذ نہیں

Marfat.com

ہے۔ بلکہ یہ محض انسانی غور و فکر کا ثمرہ ہیں۔ پھر ان اصولوں کے اندر نہ حاکمیت الٰہی کا اعتراف پایا جاتا ہے اور نہ ان ذمہ داریوں کا کوئی تصور موجود ہے جو حاکمیتِ الٰہی کے اقرار کے بعد حاکمِ اعلیٰ کی اطاعت کے سلسلہ میں وارد ہوتی ہیں۔ "اقرارِ خدا" کا اصول اس سے نہ اندر کچھ نہیں ہے کہ اس میں خدا کے وجود کا ایک مجرّد تصور موجود ہے، جس کے ساتھ وحی اور وحی کی پیش کردہ ذمہ داریوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے وجود کا بھی وہ تصور اختیار کیا گیا ہے جو ایک اضافی اور قابلِ تغیر تصور ہے اور انسان کا اپنا ایجاد کردہ ہے۔

"اقرارِ خدا" کے اصول کو خود باقی چار اصولوں کا ماخذ بھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اور اسے سرِ فہرست رکھنے کے باوجود نقطۂ آغاز نہیں ٹھیرایا گیا۔ اور اسے وہ سند عطا نہیں کی گئی جس سے یہ دوسرے اصولوں کی اہمیت و حقیقت کی تشخیص کرے۔ یہ ایک اضافی اور متغیر چیز ہے۔ اس کا مفہوم جو کچھ آج ہے ہو سکتا ہے کہ وہ کل تک باقی نہ رہے۔ اس اصول کا دوسرے چاروں اصولوں سے جو تعلق ہے وہ اسی طرح مبہم ہے جس طرح ان پانچوں اصولوں میں سے ہر ایک کا باہمی ربط نامعلوم میں ہے۔ اور شاید یہاں یہ ذکر کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ پنج شیلا کا ظہور ایک ہی وقت میں نہیں ہوا ہے، بلکہ یہ یکے بعد دیگرے آتے رہے ہیں اور اقرارِ خدا کا اصول سب سے آخر میں شاملِ فہرست ہوا ہے۔ میں جنابِ صدر سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کے

Marfat.com

مبہم اور بے سروپا اصول انڈونیشی قوم کی روح کو کیوں کر اپیل کر سکتے ہیں جب کہ وہ ایک واضح نظریۂ حیات پر ایمان رکھتی ہے جو اُس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے اور اُس کی زندگی کے ریشہ ریشہ میں اُترا ہوا ہے ؟

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ پنج شیلا ـــــ جن کا تعارف میں آپ سے کرا چکا ہوں ـــــ ایک ایسی ریاست کی اساس بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے جو انڈونیشی قوم کی ضروریات و مقتضیات کو پورا کر سکے، اپنا حقیقی وظیفہ سرانجام دے سکے، اپنے اجزائے ترکیبی میں ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہو اور اُس کی جڑیں انڈونیشی قوم کے فکری پس منظر سے منسلک ہوں۔ خود پنج شیلا کے داعی بھی پنج شیلا کو نقطۂ مصالحت سے زائد کوئی چیز نہیں دیکھتے۔ یہ وجہ بھی میرے اس یقین میں اضافہ کرتی ہے کہ یہ اصول پنجگانہ ہماری ریاست کا فلسفہ بننے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

نقطۂ مصالحت کی تلاش

پنج شیلا کی حقیقت و ماہیت کیا ہے ؟ ان کے داعیٔ اوّل صدر سوکارنو کے ارشاد کے بموجب یہ ان پانچ اصولوں کی ایک فہرست ہے جو انہیں انڈونیشیا کے تمام فرقوں کے اندر بکھرے ہوئے نظر آئے ہیں۔ گویا ان اصولوں کے داعی ان کو اس حیثیت سے درجہ اعتبار میں رکھتے ہیں کہ اگرچہ ہر فرقے کے اندر ان کا مجموعہ نہیں پایا

Marfat.com

جاتا، تاہم ان کے اجزاء ہر فرقے میں کچھ نہ کچھ ضرور پائے جاتے ہیں مثلاً کمیونسٹ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔ لیکن وہ بھی ان اصولوں کو نظامِ ریاست کی بنیاد کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ ایک بنیادی کمزوری ہے۔ جس نظریہ یا نظام یا مقصد کو زندگی کی اساس ٹھیرایا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ انتہائی اہم اور نازک چیز ہے جس پر ایمان لانا اور جس کی اطاعت کرنا امرِ لازم ہے، اور قوم کے دلوں میں بھی اس کے سچ ہونا انتہائی ضروری ہے، بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو اس کے علمبردار ہوتے ہیں اور اساسِ ریاست کی حیثیت سے اس کو قبول کرتے ہیں۔ ورنہ اس اساس کے حق میں غدّاری ہو گی۔ کمیونسٹ اللہ کے وجود کو محض ایک وہم سمجھتے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ اقرارِ خدا کے اصول کو کیوں کر تسلیم کر سکتے ہیں؟

پنج شیلا کی بنیادی کمزوری

یہ موقف کہ بعض اصول قبول کر لینے اور بعض کو ٹھکرا دینے، یا ان کو بظاہر قبول کر لینے اور اصلاً ان پر اعتقاد نہ رکھنے کی اجازت ہو۔ اس موقف کی اس کے ماسوا اور کیا توجیہ ہو سکتی ہے کہ یہ اصول محض نقطۂ مصالحت کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ اور یہ جائزہ نہیں لیا گیا کہ یہ اصول باہمی کیا تعلق و ربط رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ تعیّن نہیں کیا گیا کہ ان میں سے کونسا اصول دوسرے اصولوں کے لیے ماخذ و مصدر کا درجہ رکھتا ہے یا یہ پانچوں اپنا الگ الگ ماخذ

Marfat.com

رکھتے ہیں۔ اسی طرح اُن اقدار کا جائزہ بھی نہیں لیا گیا جو ان اصولوں کا رُخ متعین کرنے کے لیے ضروری تھیں۔

اس ابہام و غموض اور نقص و ضعف کی وجہ سے یہ تو امکان ہے۔ کہ ان کو وہ گروہ تسلیم کرے جو سرے سے کسی اصول کا قائل ہی نہ ہو۔ لیکن صاحبِ نظریہ انسان انہیں قبول کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں پاتا۔ دوسرے الفاظ میں خود ان اصولوں کے مؤید و حامی بھی آپس میں ان اصولوں کی حقیقت پر متفق نہیں ہیں۔ بلا شبہ ہمارے اندر ایک بھی ایسا شخص نہیں جو ان اصولوں کے تقدس و برتری میں شک کرے۔ لیکن ان کے داعی ان اصولوں کے منشاء، ان کے ربط باہم اور ان کے مغز و جوہر کے چہرے سے پردہ اٹھانے سے عاجز ہیں۔ یہ تاریکی مسائل کو حل کرنے کے بجائے مزید الجھانے پر منتج ہوگی۔ یہ مسلّم بات ہے کہ ریاست کی بنیادیں سورج کی طرح ظاہر و باہر ہونی چاہئیں تاکہ ریاست قوم کی رہنمائی و قیادت کو بخوبی سرانجام دے سکے۔ پس یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر ہم ایسی مبہم اور مستور بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔

یہ ابہام اور غموض خود پنچ شیلا کی فطرت میں مضمر ہے۔ کیونکہ یہ محض ایک (Abstract) ہیں۔ ان میں وہ جوہر نہیں ہے جس کے بل پر بذاتِ خود قائم ہو سکیں۔ ہم ان کا موازنہ امداد سے کر سکتے ہیں۔ شلاڈہ کا عدد بذات خود قائم نہیں رہ سکتا جب

Marfat.com

تک ہم اُس کے ساتھ معدود کا اضافہ نہ کریں۔ مثلاً ۵ گھوڑے، یا ۵ کرسیاں یا ۵ کشتیاں۔ گویا ۵ کا عدد ہمیشہ ایک معدود سے متصل ہو کر آئے گا۔ یہی حال ۵ شیلا کا ہے۔ نظریۂ محض ہونے کی وجہ سے ان کو ایک نفس الامری حقیقت کے لباس میں ملبوس ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا کوئی معدود ہو، اور جس سے ان کو جدا نہ کیا جا سکے۔ اس نظریہ کا بذاتِ خود قائم ہونا محال ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا کوئی وجود نہیں تسلیم کیا جائے گا۔

مگر پنج شیلا نہ موجودہ حاضر نظریات میں سے کسی نظریہ پر اعتماد کرنا چاہتے ہیں اور نہ ان کے سوا اپنا کوئی اور مرکز و مسمّٰی ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں اور اپنی مستقل شخصیت منوانا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کسی نظریے پر مرتکز ہوں گے تو گویا وہ نظریہ ہی مطلوب و مقصود ہوگا۔ خواہ وہ اسلامی نظریہ ہو یا اشتراکی نظریہ۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پنج شیلا کا اپنے لیے کوئی رنگ اختیار کر لینا یا اپنا کوئی فحوٰی مشخص کر لینا پنج شیلا کی بنیاد کو مسمار کرنے کے مترادف ہوگا۔ پنج شیلا غیر جانب دارانہ روش پر چلنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ اُن کا مقصدِ وجود ہی یہ ہے کہ غیر جانب دار رہیں۔ پنج شیلا افکار حاضرہ کے درمیان غیر جانب داری کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو ہر چیز حتّٰی کہ انڈونیشی قوم کے قلب و ضمیر سے بھی بالاو برتر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اسی صورتِ حال نے اُن

Marfat.com

کے لیے قوم کے دل کے دروازے بند کر دیے ہیں۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر پنج شیلا اپنے جسم سے "غیر جانب داری" کا لباس نہیں اتارنا چاہتے اور نہ کوئی ایجابی اساس قبول کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ مجرّد نظریہ کی حیثیت سے قائم و دائم رہیں۔ مگر ان کی یہی صفت بتاتی ہے کہ واقعاتی دنیا میں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ محض خلا میں سفر کر رہے ہیں۔ لادین اور غیر جانب دار پنج شیلا کے حق میں یہ بات ایک المیہ سے کم نہیں ہے۔ اب ہمیں بتایا جائے کہ یہ کھوکھلے اصول مسلمانوں کی عقل و روح کو کیوں کر اپیل کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس ایک واضح و روشن اور کامل و مکمل نظریہ ہے جو مقصدِ زندگی، منبع وجود اور مادی و روحانی طاقت کے سرچشمہ کی حیثیت سے اُن کے دل و دماغ میں اُترا ہوا ہے۔ یہ نظریہ اسلام ہے۔ ایک مسلمان کا اسلامی نظریہ کو ترک کر پنج شیلا کی طرف منتقل ہو جانا ایسے ہی ہے جیسے کوئی زمین کو چھوڑ کر ہوا میں معلق ہو جائے ——— صدرِ محترم، واقعہ یہی ہے!

میں پنج شیلا کے داعیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ تم لوگ جن اصولوں کی تلاش میں ہو وہ اسلام میں موجود ہیں اور بالجزم اور مجرّد نظریے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اسلام سے نسبت رکھنے کی وجہ سے وہ خاص قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ اُن کا ایک حقیقی اور واضح نقطۂ ارتکاز ہے۔ اگر تم لوگ اسلام کو فلسفہ ریاست کے طور پر قبول کر لو گے، تو خواہ

Marfat.com

تم پنج شیلا کے داعی ہو یا مذہب پرست، تمہیں کوئی خسارہ نہیں رہے گا۔ بلکہ تمہیں ایک ایسا فلسفہ دستیاب ہو جائے گا جس میں زندگی کی حرارت ہو گی، واضح و روشن ہو گا اور تمہاری قوت و شخصیت کا مستحکم ستون ہو گا۔

اسلام کو فلسفہ ریاست قبول کر لینے سے پنج شیلا کا ایک اصول بھی محو نہیں ہو گا۔ اسلام ایسے قواعد و ضوابط سے مالا مال ہے جن کی بدولت خود پنج شیلا کا نظریہ ایک حقیقی بنیاد، ایک حقیقی محرک اور متحرک روح سے بہرہ مند ہو جائے گا۔

میں اکنامک سوشلزم کے داعیوں سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ تمہیں اسلام کے اندر اکنامک سوشلزم کا ایک ترقی یافتہ نظام مل سکتا ہے۔

اسلامی آئیڈیالوجی

اسلام ایک عقیدہ ہے۔

اس عقیدے کے پُر فضا و دل کش چمن میں انڈونیشی قوم کا سوادِ اعظم رہتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اسلام ایک آئیڈیالوجی ہے۔ وہ انگریزی اصطلاح (Religion) کے مفہوم میں مجرد مذہب نہیں ہے جس کا، انسان اور خدا کے مابین تعلق قائم کرنے کے سوا، کوئی وظیفہ نہ ہو۔ اسلام دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ پہلا جزو انسان و خدا کے باہمی تعلق کو محیط ہے۔ اور دوسرا جزو انسان اور انسان کے باہمی تعلق

Marfat.com

پر حاوی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ایک جزو کا نام "عبادات" ہے، اور دوسرے کا نام "معاملات"۔

دوسرا جزو ایک فرد سے لے کر ایک خاندان اور ایک ریاست کے دائرے سے بحث کرتا ہے۔ جب ہمیں ریاست کے مسائل میں سے کسی مسئلہ، مثلاً تدوین دستور وغیرہ سے سابقہ درپیش ہو تو ہمارے لیے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم اسلام کے دوسرے جزو کے امداد پائی جائے والی ہدایات و تعلیمات کی جانب رجوع کریں۔

ایک معترض یہ سوال کر سکتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام ایک ماڈرن اسٹیٹ کا نظام فراہم کر سکے جس میں ہمیں ہزارہا نئے نئے مسائل و مشکلات کا حل مل سکے؟

اس نوعیت کے شبہات و اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ ہمیں یہ غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اسلامی احکام کی رُو سے ریاست کا بجٹ کیسے بنائیں گے؟ یا ہم کرنسی اور تبادلۂ زر کے معاملات کیسے چلائیں گے، یا ٹریفک کا کیا نظم و نسق قائم کریں گے ..... ؟

اسلام نے اس طرح کے جزئی مسائل اور تفصیلی امور جو زمانے کے حالات اور انسانی ضروریات کے تحت بدلتے رہتے ہیں، وضع نہیں کیے۔ اسلام نے صرف بڑی بڑی بنیادیں بیان کر دی ہیں جو انسان کے فطری داعیات سے ہم آہنگ ہیں اور ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے معقول و مناسب ہیں۔

Marfat.com

اسلام کے کچھ ضوابط ہیں۔ ان میں سے اہم اور امتیازی ضابطہ یہ ہے کہ عبادات کے بارے میں ہر فعل ناجائز ہے اِلّا یہ کہ اللہ نے کسی فعل کو جائز ٹھیرا دیا ہو۔ معاملات کے اندر ہر چیز حلال ہے اِلّا یہ کہ اللہ نے کسی چیز کو حرام قرار دے دیا ہو۔ قانونِ اسلامی کی اصطلاح میں اسے "براءت اصلیہ" کہتے ہیں۔

اسلام نے دنیوی زندگی کی تنظیم کے لیے اساسی ضوابط قائم کر دیے ہیں، اور معاملات کی حدود بھی مقرر کر دی ہیں جن کے ذریعہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے؟ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے؟ یہ حدود اور پابندیاں اسلام نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی سلامتی اور سعادت کی ضمانت کی خاطر وضع کی ہیں۔ ان حدود وضوابط کے پہلو بہ پہلو اسلام نے انسان کو وسیع آزادی دی ہے کہ وہ اپنی عقل اور اپنے اجتہاد کو بروئے کار لاکر زندگی کے ہر شعبے میں انسانی عقل کی ترقی اور زمان و مکان کے تقاضوں کے تحت اپنے معاملات و مسائل کو درست کرے۔ اس طرح کے امور میں عقیدہ دخل نہیں دیتا۔ عقیدہ صرف اس وقت دخل دیتا ہے جب عقیدہ کے درمیان اور عدل و انصاف اور انسانی فلاح اور روحانی اقدار کے درمیان تعارض کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

جناب صدر محترم!

ہم جب بھی کسی ایسے مسئلہ پر، جسے ہم دستور میں شامل کرنا چاہتے

Marfat.com

ہوں، بحث اور غور و فکر کرتے ہیں۔ مثلاً بنیادی حقوق، ریاست کا ڈھانچہ، اصول اجتماع اور اقتصادی نظام وغیرہ۔ ہمیں ان مسائل پر ایک اور دو کی طرح اسلام کے ضوابط و قواعد کی فہرست ملتی ہے۔

اسلام اور تھیاکریسی

اب یہ سوال غور طلب باقی رہ جاتا ہے کہ کیا "اسلامی ریاست" کو "مذہبی ریاست" (Theocracy) کہا جائے گا؟

تھیاکریسی، جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے، مغربی تصور کے مطابق اُس ریاست کو کہا جاتا ہے جس میں اقتدار کی اساس رہبانیت ہوتی ہے اور حاکمیت (SOVEREIGNTY) کے اختیارات چرچ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اور مذہبی طبقہ (Priest Class) خدا کے نمائندہ کی حیثیت سے تمام سیاسی و قانونی ادارات پر متصرف ہوتا ہے۔ اسلام کو اس نظام اور تصور سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ اسلام میں رہبانیت اور قیصریت و پاپائیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ اسلامی ریاست کو "مذہبی حکومت" کی اصطلاح سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی ریاست مزاج اور نظام کے لحاظ سے ایک جمہوری ریاست (Democracy) ہوتی ہے۔ لیکن مغرب کی جمہوری ریاستوں کی طرح غیر مذہبی (Secular) نہیں ہوتی۔ بلکہ اسلامی مفہوم کے مطابق وہ اسلامی جمہوری ریاست ہوتی ہے۔ اگر ہمیں اسلامی ریاست

Marfat.com

کے لیے لازماً کوئی اصطلاح تجویز کرنی پڑے تو ہمیں موزوں ترین اور مزاج اسلام سے اقرب ترین جو اصطلاح ملتی ہے وہ "الٰہی جمہوری ریاست" ہے۔ یعنی (Theocratic Democracy)

انڈونیشی معاشرے میں اسلامی نظریات وتعلیمات کے گہرے اثرات

اب میں کوشش کروں گا کہ آپ کے سامنے اسلامی نظریات وتعلیمات کے اثرات کے متعلق مجمل طور پر چند تمہیدی گزارشات پیش کروں۔

ہمارا مشاہدہ اور تجربہ بتاتا ہے کہ انڈونیشی قوم متعدد بلند ترین اقدار کی حامل ہے۔ ان میں سے ایک تعاون کا جذبہ ہے۔ اگر کسی ہٹ دھرمی کی بنا پر یہ نہ بھی تسلیم کیا جائے کہ اسلام نے سب سے پہلے دنیا کو ان اقدار سے روشناس کرایا ہے، تو کم از کم یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں ہوگا کہ ان اقدار کے فروغ واحیاء میں اسلام نے بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔

اسلام نے آغازِ دعوت ہی میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کروادیا تھا کہ "بُعِثت لا تمم مکارم الاخلاق" (میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں)۔ یہ روحانی اقدار یا مکارم اخلاق، جن کے اتمام کے لیے جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں، انہی اقدار ومکارم کے سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن

Marfat.com

کو اللہ تعالےٰ نے انبیاء سابقین علیہم السلام کے ہاتھوں سے دنیا میں جاری فرمایا ہے۔ مگر ان کی تکمیل کا شرف خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ ہمیں آج اپنی ریاست کی داغ بیل ڈالتے وقت دستوری طور پر ان اقدار کی محافظت اور ان کی نشوونما کا انتظام کرنا چاہیے۔ چنانچہ اگر اسلام کو اساسِ ریاست قرار دینے کا فیصلہ کر دیا جائے تو یہ بدیہی بات ہے کہ ہم قوم کے اندر پائی جانے والی تمام روحانی و اخلاقی اقدار کا مطالعہ کریں گے اور اُن کو اُجاگر کرنے کے لیے فکرمند ہوں گے۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری قوم کے اندر تعاون کی اسپرٹ موجود ہے۔ اس ایک مثال سے ہم یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اخلاقی اقدار کے بارے میں اسلام کس اہتمام و التفات کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اسلام تعاون کو اپنے بنیادی مقاصد کا ایک جُز قرار دے کر اپنے پیروؤں سے اس پر کاربند ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے پوری تحریص و ترغیب کے ساتھ واضح کیا ہے کہ "تعاونوا علی البرّ والتّقوی" (نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو)۔ یہ ترغیب کا ایجابی پہلو ہے۔ اور جب معاشرے کے اندر برّ اور تقویٰ کے برعکس اخلاق پھیلنے شروع ہو جائیں تو اسلام ہمیں ایجابی ترغیب کے بجائے سلبی ترغیب دیتا ہے کہ "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (گناہ اور تعدّی میں تعاون نہ کرو)۔

دوسری مثال یہ ہے کہ انڈونیشی معاشرے میں جمہوریت کا ذوق

Marfat.com

اور اسپرٹ بدرجۂ اتم جاری و ساری ہے۔ اسلام اس اسپرٹ کو قائم و دائم رکھنے اور اس کو مزید نشوونما دینے کی تاکید کرتا ہے۔ اور افراد اور جماعتوں کے اندر اس کی مسلسل تخم ریزی اور آبیاری کا حکم دیتا ہے۔ وہ یہ ہدایت کرتا ہے کہ ہر کام مشورہ کے ساتھ سرانجام دو۔ قرآن تصریح کرتا ہے کہ اہلِ ایمان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات باہم مشورہ سے انجام دیتے ہیں (وامرھم شوریٰ بینھم)۔ شورائیت اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ یہ اسلام کا ایک واجب الاتباع حکم ہے۔ جس سے سرتابی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جب ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جمہوریت اور شورائیت کے اصول کو ہماری ریاست کا محور و مدار ہونا چاہیے تو ہمارے مطالبہ کی بنیاد یہی ہوتی ہے کہ اسلام نے شورائیت کے قیام کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام نے شورائیت یا جمہوریت کو اُس دور کے اندر جامۂ عمل پہنا کر دکھا دیا۔ جب دنیا کی اقوام استبداد، جاگیرداری اور ظلم و ستم کے بے کراں سمندر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اسلام کے دورِ اوّل میں جمہوریت جس شان و شوکت سے کارفرما تھی اور معاشرے میں اُس کی برکات کی بدولت جو بہار و تازگی پیدا ہو گئی تھی، اسلامی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے اُس کی بے شمار مثالیں سامنے آتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ایک اور اسپرٹ حبِ وطن پائی جاتی

Marfat.com

ہے۔ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ وطن کی محبّت اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اسلام اس اسپرٹ کی حفاظت کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے: "وجعلناکم شعوبا وقبائل"۔ اس ارشاد میں قومیّت کی اساس کی توثیق کی گئی ہے اور قبائلی تشخّص کو معدوم کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ انسانوں کو اقوام و قبائل میں تقسیم کرنے اور ان کے قومی و قبائلی تشخّص کو برقرار رکھنے کا منشاء فقط یہ ہے کہ اس طرح سے لوگ ایک دوسرے کو پہچانیں اور تعاون کا رویّہ اختیار کریں۔ اپنی قوم سے لگاؤ رکھنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اسلام نے جتنے احکام و قوانین وضع کیے ہیں ان سب میں اسلام نے انسان کے فطری تقاضوں کو کچلنے کے بجائے ان کی پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ لہٰذا آیت بالا کا یہ اعلان کرنا بھی مزاجِ اسلام کے منافی نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے جو انسانوں کا خالق ہے، اپنے منشاء کے تحت ان کو مختلف گروہوں اور قبیلوں میں منقسم کر دیا ہے۔ مگر یہ تقسیم بلند تر مقصد کے لیے کی گئی ہے جس کا حاصل باہمی تعاون کی بنیادوں کا استحکام ہے۔ چنانچہ اسلام نے یہ اعلیٰ تعلیم دے کر حبّ وطن کے فطری جذبے کی محافظت کی ہے۔

اسلام قومی جذبے کے ایجابی اور فطری پہلو کی حفاظت کے ساتھ اس کے سلبی پہلو پر بھی پورا دھیان دیتا ہے۔ سلبی پہلو سے مراد

Marfat.com

انتہا پسندانہ قومی عصبیت اور تنگ نظر وطن پرستی ہے۔ جو انسانی دلوں میں تعاون کے بجائے کبر و نخوت اور خود پسندی کی روح پھونکتی ہے اور انسانی آبادیوں کے درمیان رنگ و نسل کی بنیاد پر تفریق پیدا کرتی ہے۔ اور اپنے علمبرداروں میں یہ غلط احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ دنیا میں دوسری اقوام سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔ چنانچہ اسلام جہاں شعوب و قبائل کی فطری تفریق کا اعتراف کرتا ہے وہاں ساتھ ہی اس غلط رجحان کا بھی قلع قمع کر دیتا ہے جو رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں میں تفرقہ اندازی کرتا ہے، اور رنگ و نسل کی کسوٹی پر انسان کو انسان سے افضل و اعلیٰ قرار دیتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں فضیلت و کمال اور بزرگی و تفوق کی اساس چہرے کا رنگ، نسلی خون اور وطن کی خاک نہیں ہے بلکہ صرف تقویٰ اور نیکوکاری ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

ہمارے معاشرے کے اندر ایک اور اسپرٹ موجود ہے، اور وہ ہے حریت پسندی۔ اگرچہ یہ اسپرٹ بہت قدیم ہے، مگر ملک کی آزادی اور خود مختاری کے بعد یہ زیادہ نمایاں ہو کر ابھر آئی ہے۔ حریت پسندی بھی انسان کی فطرت کی صدا ہے اور حب وطن کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔

انڈونیشی قوم ساڑھے تین صدیوں سے ڈچ سامراج کے ولندیزی استعمار کے پنجۂ استبداد و جور میں گرفتار تھی۔ مگر اس نے یہ دیکھا کہ اسلام

Marfat.com

آزادی و حریت کی فکری اُمنگ کی تائید کرتا ہے، اور آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے شجاعت و فداکاری کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور ہر اُس قوم کو استعمار سے مزاحمت کی دعوت دیتا ہے اور اُس کے خلاف برسرِ پیکار ہو جانے کی روح پھونکتا ہے جس کی روحانی و اخلاقی اقدار کو پامال کیا گیا ہو اور جسے عبودیت و ذلت پر مجبور کیا گیا ہو۔ اور رسول کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچاتا ہے کہ "اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر"۔ جن لوگوں سے لڑا جا رہا ہے انہیں بھی لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم رہے ہیں اور یقیناً اللہ انکی مدد پر قادر ہے۔

چنانچہ اسلام کے اس پیغام نے انڈونیشی قوم کے جذباتِ حریت کو مشتعل کر دیا۔ ۔ اور اُس نے مسلسل جنگ و پیکار کے بعد استعمار کا جوا گلے سے اُتار پھینکا۔ اس معمولے کو شاہین کے مقابلہ میں کامیاب کرنے والا اسلام ہی تھا

صدرِ محترم! اگر ہم اپنی قوم کے اندر پائی جانے والی اعلیٰ اقدار کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان تمام اقدار کو اسلام کی بارگاہ سے ایک ایسا محرک جذبہ فراہم ہو جاتا ہے جو قوم کو اُن کی نگہبانی اور نشوونما پر مسلسل راغب رکھتا ہے۔ مثلاً ہماری قوم کے اندر حمایتِ مظلوم کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ لیکن کیا اس فطری خوبی کو مزید اُجاگر کرنے کے لیے اسلام کی اس واضح تعلیم کے سوا بھی کوئی تعلیم ہو سکتی ہے کہ:

Marfat.com

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللّٰہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھٰذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیا واجعل لنا من لدنک نصیرا۔

تم کو کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے دشمنوں سے نہیں لڑتے ہو جو اللہ سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ پروردگار! ہمیں اس ظالموں کی بستی سے نکال۔ اور بنا اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی۔ اور بنا اپنی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار۔

یہ ارشاد خداوندی راجح مفہوم کے مطابق محض حمایت مظلوم کی ایک اپیل ہی نہیں ہے، بلکہ یہ ضعفاء اور مظلومین کی مدد اور عبودیت و استبداد کے طوق و سلاسل سے اُن کی نجات کے لیے مسلح کشمکش اور جان افشانی کی دعوت ہے۔ اور "ربنا اخرجنا ..." کا معنوی اسلحہ استعمال کرنے کے بعد مادی و فولادی اسلحہ کو بروئے کار لانے کا حکم ہے۔

صدر محترم! آج ہم برابر ایسی اپیلیں سنتے رہتے ہیں جن میں استعمار کے انسانیت کُش عزائم سے جنگ کی دعوت دی جاتی ہے۔ لیکن اسلام نے چودہ صدی قبل تفصیل کے ساتھ ایسے احکام و اصول پیش کر دیے ہیں جو کمزور کی دستگیری، ستم رسیدہ کی حمایت اور ظلم و تشدد کے استیصال کو واجب ٹھیراتے ہیں۔ اسلام نے ان احکام کو جس صراحت

Marfat.com

اور زورِ کلام کے ساتھ بیان کیا ہے اُس سے اہلِ ایمان کے اندر جذبات کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے اور ان کے لیے اس راہ میں مال و جان کی بازی لگا دینا معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ کسی مومن فرد یا جماعت کے لیے خواہ وہ کہیں رہتی ہو، اپنی ذات کے لیے یا غیر کے لیے ذلت و عبودیت قبول کرنا امرِ محال ہے۔

حمایتِ مظلوم اور جنگِ حریت سے متعلق اسلام کے جملہ اصول "جہاد" سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ انڈونیشی قوم اس لفظ سے اچھی طرح متعارف ہے۔ اور خاص طور پر یہ لفظ ان دنوں تو زبانِ زدِ عام و خاص تھا جب انڈونیشیا کا مسلمان سرزمینِ انڈونیشیا کی آزادی و استقلال کی خاطر میدانِ جنگ میں اُترا ہوا تھا۔

صدرِ محترم! مجھے یقین ہے کہ ہمارے لیڈروں میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو انڈونیشی قوم کے اندر لفظ "جہاد" کی غیر معمولی تاثیر سے نابلد ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کے دوران ہمارے تمام لیڈروں نے، خواہ وہ "جہاد" کے قائل تھے یا منکر، انڈونیشیا کے باشندوں کو استعمار کے خلاف بھڑکانے کے لیے جو مؤثر ترین اور قوی ترین محرک استعمال کیا وہ نعرۂ جہاد تھا۔ اس نعرہ کا بلند ہونا تھا کہ قوم کے جذبات مشتعل ہو گئے اور وہ اپنی عزیز سے عزیز متاع کو بھی قربان کر دینے پر مستعد ہو گئی۔ یہ وہی قوم تھی جس نے بارہا اسلامی دعوت پر لبیک کہا اور جس کے اندر بارہا علماء نے قرآن کی آیت:

Marfat.com

"وجاھدوا فی سبیل اللہ" سُنا کر فداکاری وجان افشردگی کی روح پھونکی ـــــ اور اب یہ ماننا پڑے گا کہ اگر جذبۂ جہاد قوم کے دل کی گہرائیوں میں پہلے سے نہ سرایت کیے ہوتے تو جانبازی کے وہ کرشمے کبھی ظاہر نہ ہوتے جو جہاد کے تصور کی بدولت جنگ آزادی میں ہم میں سے ہر شخص نے مشاہدہ کیے ہیں۔

میں ایک اور مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری قوم ایثار و سخاوت کو نہایت مقدس جذبہ اور انانیت و خود غرضی کو نہایت ملعون و مردود صفت سمجھتی ہے۔ اسلام کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جذبہ ایثار کی تحسین کرتا ہے اور قوم کے ہر طبقہ کو رفاہیت و خوشحالی سے ہمکنار کرنے کے لیے اس کو فروغ دیتا ہے۔ چنانچہ جب قوم کے اندر نفع اندوز عنصر گھس آئے جو مصلحت عامہ کو نظر انداز کر کے ذاتی مفاد کو مطمح نظر بنالے اور مال کی محبت و حرص میں خود غرضی اور نفس پرستی پر اتر آئے اور دولت کی تجوریوں پر سانپ بن کر بیٹھ جائے، تو اس حالت میں اسلام ایسی ملعون سرمایہ پرستی کے خلاف اظہار بیزاری کرتے ہوئے صاف صاف کہتا ہے کہ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔

بلاشبہ اسلام انفرادی ملکیت کے اصول کا قائل ہے اور اُسے انسان کی فطری طلب قرار دیتا ہے لیکن ساتھ ہی اسلام ارباب دولت

Marfat.com

پر چند فرائض بھی عاید کرتا ہے۔ جن کی رُو سے اسلام اُن کی دولت کے ایک حصّہ پر فقراء و مساکین کا حقِ انتفاع قائم کرتا ہے۔ اور اس امکان کا کلّی خاتمہ کر دیتا ہے کہ دولت ایک مخصوص طبقہ کے اندر گردش کرتی رہے اور اس کے تعیّش اور نفسانی خواہشات کا ایندھن فراہم کرتی رہے۔ اسلام کے نظامِ اقتصادی کی رُو سے قوم کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے دولت کا گردش میں رہنا ضروری ہے۔ اسلام میں اکتناز سرمایہ کا سرے سے تصوّر ہی نہیں ہے۔ ایک صاحبِ ایمان شخص ان الٰہی احکام کو نورانی مشعل کی حیثیت سے قبول کرتا ہے جس سے وہ اپنی زندگی کو روشن کرتا اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے لیے اس سے ہدایت اخذ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ جب اُس کے کان میں حاضرہ یہ مشہور فقرہ پڑتے ہیں کہ "انفرادی ملکیت کو اجتماعی خدمت سرانجام دینا چاہیے۔" تو وہ اس فقرے کی معنویت اور اس کے عمیق حقائق کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا ہے۔ جو اس کے لیے مجرّد قانون سے زیادہ اثر انگیز ہوتے ہیں۔ اُس کے اس گہرے احساس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کا ماننے والا ہے اور اسلام اُسے اوّل روز سے دولت کے صحیح مصرف اور اجتماعی خدمت اور قومی مصلحت کی اہمیت کا قائل کر چکا ہے۔

اور آخری مثال یہ ہے کہ ہماری قوم از روئے فطرت رواداری اور وسیع النظری کو پسند کرتی ہے۔ اور اسلام بھی اُسے یہی تعلیم دیتا ہے۔

Marfat.com

اللہ کا ارشاد ہے "لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی"

اسلام رواداری کا جو تصور پیش کرتا ہے، وہ محض منفی موقف سے عبارت نہیں ہے، بلکہ اسلام کا تصورِ رواداری مسلمان کو آزادیٔ مذہب کی خاطر جان تک قربان کر دینے کا حکم دیتا ہے۔ وہ مذہب خواہ اسلام ہو یا دوسرے آسمانی مذاہب۔ آیتِ ذیل میں اسی چیز کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا۔ (الحج: ۴۰)

اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں) کے صومعے اور (عیسائیوں) کے گرجے اور (یہودیوں) کے عبادت خانے اور (مسلمانوں) کی مسجدیں جن میں خدا کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے گرائی جا چکی ہوتیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مذہب کی محبت انسان کو بعض اوقات تعصب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی تعصب کو روکنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اہلِ کتاب کے حق میں یہ اعلان کروایا کہ:

وامرت لاعدل بینکم اللہ ربنا وربکم، ولنا اعمالنا

اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تم میں عدل کروں۔ خدا ہی ہمارا اور تمہارا پروردگار

Marfat.com

ولکم اعمالکم لا حجة بیننا و بینکم، اللہ یجمعنا والیہ المصیر ۝ (شوریٰ: ۱۵)

ہے۔ ہم کو ہمارے اعمال کا بدلہ ملیگا اور تم کو تمہارے اعمال کا۔ ہم میں اور تم میں کچھ بحث و تکرار نہیں۔ خدا ہم سب کو اکٹھا کریگا اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اس طرح سے اسلام مثبت رواداری کی واضح بنیادیں قائم کر دیتا ہے۔ بلکہ مسلمان کی یہ ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ مذہب کی آزادی پر آنچ نہ آنے دے۔ آپ سوال کر سکتے ہیں کہ مذہبی رواداری کی اسپرٹ قائم رکھنے کے لیے ہم انڈونیشیا جیسے ملک میں جہاں متعدد مذاہب جاری و ساری ہیں، کونسا راستہ منتخب کریں؟ میں اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ اسلام کا تصور رواداری اختیار کیے بغیر ہمارے کوئی چارہ ہی نہیں ہے اور نہ اس کے ماسوا کامیابی کا کوئی امکان ہے۔ اسلام کا تصورِ رواداری ہی اس وقت انڈونیشی قوم کے اندر قدر و منزلت حاصل کیے ہوئے ہے۔ مسلمان اس تصور کو نہایت مقدس و محترم سمجھتا ہے۔ ویسے بھی اگر مقابلۃً دیکھا جائے تو اُس تصور سے زیادہ مضبوط اور حریت ادیان کے تحفظ کیلئے زیادہ مؤثر ہے جو پنچ شیلا کے پہلے اصول "اقرار خدا" میں پایا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا عارضی دستور اس وقت پنچ شیلا کی بنیادوں پر قائم ہے لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمان قوم ان اصولوں کو کھوکھلے اور کاغذی الفاظ

Marfat.com

سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دے رہی؟ مسلمان اگر یہاں غیر مذاہب کے ساتھ رواداری برت رہے ہیں تو وہ اس لیے نہیں کہ پنج شیلا کا اُن پر کچھ اثر ہے، بلکہ اس لیے کہ اُن کے خدا و رسولؐ کا یہ حکم ہے۔

مذکورہ بالا تمام تفصیلی گزارشات سے ذیل کے نتائج اخذ ہوتے ہیں:

پاکیزہ کیریکٹر کا اصل محرّک

۱: اسلام نے ہماری قوم کے اندر جن اعلیٰ اقدار کی تخم ریزی کر رکھی ہے یہ توحید کے نظریے سے ماخوذ ہیں۔ نظریہ توحید ہی ہمیں خدا سے برتر و قادر پر اعتماد کا تصوّر دیتا ہے اور ہمارے اندر تقویٰ اور ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں اللہ کی ذات ہی تمام تکوینی حاکمیّت کے ساتھ ساتھ سیاسی و قانونی حاکمیت کی حامل ہے۔

۲: ریاست مستقل بالذات مقصود و مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ادارہ ہے جو اپنے سیاسی و قانونی نظام کی بدولت قوم و وطن کے مصالح کی حفاظت و نگرانی کرتا ہے۔ جس چیز کو ہم "سیاسی شعور" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، وہ درحقیقت ملکی قوانین کی اطاعت و احترام سے عبارت ہے۔

صدرِ محترم! آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آزادی حاصل کیے ۱۲ سال

Marfat.com

سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر کتنے لوگ ہیں جنھوں نے ملک کے قوانین اور بالخصوص فوجداری قانون کا اس غرض سے بالاستیعاب علم حاصل کیا ہے کہ وہ ارتکاب جرم میں مبتلا نہ ہوں؟ بے شک ایسے لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ یہاں کا سوادِ اعظم ملک کے فوجداری قانون ـــــ خواہ وہ عہدِ استعمار کا ہو یا اب آزادی کے دور کا ـــــــ کی تشکیل سے بہت پیشتر اسلام کے فوجداری احکام سے آگاہ ہے اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان احکام کو ـــــ یا اپنی ٹھیٹھ اصطلاح میں "حلال و حرام" کو ـــــ ملحوظ رکھتا ہے۔ اب کون شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ حلال و حرام کی تمیز کا احساس و لحاظ اُسے اسلام کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ لہٰذا اگر یہاں کے باشندے جرائم سے پرہیز کرتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ باعث نہیں ہے کہ وہ یہاں کے کریمنل لا کا تفصیلی علم و شعور رکھتے ہیں بلکہ عمدتہً اس بنا پر کہ اسلام نے اُن کے لیے کچھ حدود و ضوابط مقرر کر دیے ہیں، حلال و حرام کا پابند کیا ہے، انہیں آگاہ کیا ہوا ہے کہ کیا کام جائز ہیں اور کیا ناجائز۔ اور کون سی بات موزوں ہے اور کون سی غیر موزوں۔ انڈونیشیا کا باشندہ اگر جرم کو برا سمجھتا ہے، اس سے کنارہ کش رہتا ہے اور جرائم سے متعلق قوانین پر عملدرآمد کرتا ہے تو اُس کی واحد بنیاد یہ ہے کہ وہ وحدانیت کا قائل ہے اور اللہ تعالیٰ کی عام و فائق ذات کو اقتدارِ مطلق کا سرچشمہ

Marfat.com

تسلیم کرتا ہے۔ ہمیں اللہ تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس نے ہمیں ایسی قوم کے اندر اٹھایا جو ——— اللہ کی اطاعت اور اس کی حاکمیتِ اعلیٰ اور اس کے اقتدارِ مطلق و برتر پر اعتقاد رکھتی ہے، اور اس اطاعت شعاری کی بدولت وہ خود کار پہیے کی طرح ایک ایسی آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی کا سفر طے کر رہی ہے جسے فرد سے لے کر ریاست تک کے بارے میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا پورا احساس و شعور ہے۔ ورنہ صدرِ محترم! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اس وسیع و عریض ملک کے اندر پھیلے ہوئے کروڑوں انسانوں کی حرکات و سکنات پر کنٹرول کرنے کے لیے اور انہیں جائز و ناجائز کا پابند بنانے کے لیے محض پولیس، فوج اور جیل پر اعتماد کرنا پڑتا تو ہمیں سعی و جہد کا کتنا سرمایہ اس کے لیے وقف کرنا پڑتا اور مشکلات و مصائب کے کتنے کٹھن مراحل عبور کرنے پڑتے۔ اور اس کے باوجود کامیاب ہو جانا کوئی یقینی امر نہ تھا۔

۳: جس چیز کو مغلسفۂ ریاست "کہا جاتا ہے اس سے مراد ریاست کی وہ ٹھوس بنیاد ہوتی ہے جس میں یہ قوت و کشش ہو ——— کہ وہ پولیس اور فوج کی طاقت کے بغیر انسانوں کی تربیت و اصلاح کر سکے اور انہیں ایک مہذب و با اخلاق قوم کا روپ دے سکے۔ اس پہلو سے ہمیں اسلام کے ماسوا ایسی کوئی بنیاد اور کوئی نظریہ نہیں ملتا جو اتنی عظیم خدمت سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسلام

Marfat.com

کے پاس وہ فلسفیانہ نظام موجود ہے جس کا ڈھانچہ توحید اللہ اور خدا کی کامل سیاسی و قانونی حاکمیت کے تصور سے تیار ہوتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت کے موضوع پر تفصیلی گفتگو میرے رفیق مسٹر عثمان رلیبی ۲۰ مئی ۱۹۶۷ء کی جنرل میٹنگ میں کر چکے ہیں۔

ہم ہر ملا کہتے ہیں کہ ریاست کی نظریاتی اساس اگر اللہ تعالیٰ کے اقتدار مطلق اور اس کا کامل سیاسی و قانونی حاکمیت کے عقیدہ پر مبنی نہیں ہو گی تو اس کی قدر و قیمت ریت کے منتشر ذروں سے بھی کم ہو گی۔ زندگی کی وہ اقدار کبھی ریاست کی تشکیل و تاسیس نہیں کر سکتیں جن کا ماخذ وحی الٰہی نہ ہو۔ ہم صرف وحی الٰہی کو زندگی کی پاکیزگی و کامیابی کا ضامن سمجھتے ہیں اور اس بنا پر ہم انڈونیشیا کے اندر صحیح اسلامی نظام کے قیام اور اسے صحیح اسلامی ریاست قرار دینے کا مطالبہ لے کر اٹھے ہوئے ہیں۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

Marfat.com

دار المطالعہ
تنظیم المسلمین
فتح گڑھ

Marfat.com

اسلام اور تھیاکریسی

ڈاکٹر محمد ناصر : انڈونیشیا

اسلامی ممالک کے جس گوشے میں بھی ہم مسلمانوں کی جانب سے اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ بلند ہوتا ہے۔ غیر مسلم اسے سُن کر لرزہ براندام ہونے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت سے ہماری مراد اس نوعیت کی پُراسرار اور وحشتناک 'مذہبی حکومت'

(Theocracy) ہے جو ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ پر چھائی رہی ہے۔ اسلام اور اسلامی حکومت کے بارے میں یہ نہایت غلط تصور ہے۔ اسلامی نظام کے خواہش مند اس سے بری ہیں۔ اسلام میں پریسٹ کلاس کا قطعاً کوئی وجود نہیں ہے۔ یہاں تو صرف علماء اور فقہاء ہوتے ہیں، جو شریعت کے مختلف شعبوں میں تفکّر و تدبّر سے کام لیتے رہے ہیں۔ ان لوگوں کی حیثیت پروہتوں کی نہیں ہوتی جو مقدس اختیارات کے تحت مذہبی مراسم کو سرانجام دیتے ہوں، بلکہ یہ لوگ اسلامی شریعت و قانون کے ماہر اور راہنما ہوتے ہیں۔ ہر مسلمان جہد و طلب کے ذریعہ احکام شریعت کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اور امامت و رہنمائی

Marfat.com

کے منصب تک پہنچ سکتا ہے۔ اسلامی حکومت کی جانب سے جو لوگ سرکاری امام مقرر کیے جاتے ہیں، ان کی امامت بھی "مذہبی اجارہ داری" کے نظریے کے تحت نہیں ہوتی، بلکہ مسلمانوں کی عملی ضرورت کے پیشِ نظر اس کا انتظام کیا جاتا ہے۔

بہرحال جس اسلام پر ہم ایمان رکھتے ہیں، اس میں پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا کوئی ایسا طبقہ نہیں پایا جاتا جو خدا کا نمائندہ اور ترجمان بن کر خدا کی بادشاہت کو نافذ کرے اور نہ ایسے کہنوتی ادارہ (Priest Hood) کا سراغ ملتا ہے جو نظامِ حکمرانی میں قانون سازی میں، اور قضا میں خاص اثر رکھتا ہو۔ اس کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ اسلامی نظریۂ سیاست کی رُو سے اسلامی ریاست کے اندر کوئی خود مختار اور مستقل بالذات چرچ کا نظام نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس لازم ہے کہ اسلام کے پیروکار اپنی زندگی کے ہر گوشے میں خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، عوام سے تعلق رکھتا ہو یا حکومت سے، اسلامی عقیدہ کو نافذ کریں۔ اسلام پوری ملّت کو اپنی گود میں لے لیتا ہے۔ مذہب، معاشرے اور ریاست کے مابین تقسیم کا روادار نہیں ہے۔ اس لیے وہ "پُراسرار و خشتناک مقدّس حکومت" کے تصوّر سے کوسوں دُور ہے ——— میں کوئی اسلام کی جانب سے صفائی کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ اسلام اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کی طرف سے صفائی اور معذرت پیش کی جائے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں اس گہرے

Marfat.com

شبہ کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں جو اہلِ مغرب اور ان کے ہم مسلک لوگوں کے ذہنوں میں جڑیں جمائے ہوئے ہے۔

اب اگر اہلِ مغرب اور ان کے مقلد ہمیں "مذہبیت" کا طعنہ دیتے ہیں، تو میں عرض کروں گا کہ "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"۔ خود امریکہ کے اکثر لوگوں کو دیکھیے کہ وہ جب اپنے ملک اور اپنی ذات کے بارے میں سوچتے ہیں تو مسیحی کی حیثیت سے سوچتے ہیں۔ آنجہانی روز ویلٹ برملا مسیحیت کے حامی تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران انہوں نے جو تقریریں کی ہیں، ان میں سے کوئی تقریر مسیحیت کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔ انگریز کٹر مسیحی قوم ہے۔ ان کی ریاست مسیحی ہے۔ انگلستان کی ملکہ باضابطہ چرچ آف انگلینڈ کی سربراہ اور دینِ مسیح کی محافظ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی جانب سے چرچ کے مراسم کی انجام دہی میں خصوصی اہتمام برتا جاتا ہے۔ ولندیزی قوم عیسائیت کی علم بردار ہے۔ اس کے دستور میں یہ شرط پائی جاتی ہے کہ ہالینڈ کا حکمران پروٹسٹنٹ عقیدہ کا حامل ہونا چاہیے۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۰ء تک ہولینڈ میں چرچ کی مکمل حکمرانی رہی ہے۔

عیسائیت کی تبلیغ میں بھی مغربی ممالک ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا ممالک اور ان کے علاوہ دوسری یورپین مسیحی ریاستوں نے، جن میں فرانس بھی شامل ہے، جس نے

Marfat.com

اپنے نظامِ حکومت سے مذہب کو بالکل فارغ خطی دے رکھی ہے، یورپ سے باہر ایشیا، افریقہ، اور اسٹریلیا میں تبلیغِ عیسائیت کے معاملہ میں غیر معمولی سرگرمی اور انہماک کا ثبوت دیا ہے۔ خصوصاً وہ ممالک جو یورپ کی مکمل نوآبادی یا نیم نوآبادی بنے رہے ہیں، مسیحی مشنریوں کا ہدفِ خاص بنے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی تک یہ بات عام مشہور رہی ہے کہ سامراجی حرص کو پورا کرنے کے لیے یورپ کے پاس تین قسم کے ہتھیار ہیں: تجارت، جنگ اور تبلیغ۔

(المسلمون: جلد اوّل، شمارہ: ۷۴)

Marfat.com

باب سوم

اسلام اور مغرب

● ڈاکٹر محمد محمد حسین :

پروفیسر ادبیات عربیہ۔ اسکندریہ یونیورسٹی، مصر

● پروفیسر احمد راتب نفاخ :

پروفیسر ادبیات عربیہ۔ دمشق یونیورسٹی۔ شام

● عبدالوہاب حمودہ :

رکن ادارۂ تحریر مجلہ لواء الاسلام، قاہرہ۔ مصر

● ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی :

صدر شعبۂ قانون اسلام، شام یونیورسٹی، دمشق۔

شام

Marfat.com

ڈاکٹر محمد محمد حسین :۔

آپ مصر کے رہنے والے ہیں۔ اسکندریہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں جدید عربی ادبیات کے پروفیسر ہیں۔ علومِ جدیدہ کے ساتھ علومِ شریعت پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ خیالات و افکار کا سلجھاؤ اور اسلام کے ساتھ سچی وابستگی خود آپ کے زیرِ نظر مقالہ سے عیاں ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا یہ مقالہ دراصل ایک تبصرہ ہے جس میں سنہ ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں منعقد ہونے والے اسلامی کلوکیم کے مقالات و تقاریر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مقالات و تقاریر عربی زبان میں "الثقافة الاسلامية والحياة المعاصرة" (اسلامی کلچر اور عہدِ حاضر) کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ موصوف کا یہ بے لاگ تبصرہ ادھر یونیورسٹی کے سرکاری آرگن "مجلة الأزهر" اور بیروت کے ماہوار رسالے "الآداب" میں شائع ہوا ہے اور علمی حلقوں میں بڑا مقبول ہوا ہے۔

Marfat.com

موصوف عربی زبان و ادب کا نہایت شستہ ذوق رکھتے ہیں۔ قدیم عربی نظم و نثر اور جدید عربی رجحانات پر ان کی متعدد تحقیقات منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ آرٹ کے نام سے دنیائے عرب کے اندر اخلاقی بے راہ روی اور فکری آوارگی کی جو مہم چل رہی ہے موصوف اس کے خلاف پوری قوت کے ساتھ سینہ سپر ہیں۔ ان کے ادبی ولسانی ذوق، اسلامی جذبہ اور سیاسی نقطۂ نظر پر مصطفیٰ صادق رافعی اور احمد حسن زیات کے مدرسۂ فکر کی چھاپ ہے۔ مصر کے موجودہ غیر معتدل معاشرے میں ایسے لوگ بڑے قابلِ قدر ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

دامِ ہمرنگِ زمیں

کلوکیم اور اس کے امریکی شرکاء

"الثقافة الاسلامية والحياة المعاصرة" کے نام سے پچھلے سال ایک کتاب امریکہ کی فرینکلن پبلشنگ سوسائٹی کی طرف سے عربی زبان میں شائع کی گئی ہے۔ یہ کتاب ان مباحث و مقالات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں منعقد ہونے والے کلوکیم کے موقع پر مختلف نمائندوں نے پیش کیے تھے۔ اس کلوکیم میں مسلمان ممالک میں سے انڈونیشیا، پاکستان، ایران، عراق، شام، لبنان اور مصر کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ مسلمان نمائندوں کی جتنی تعداد اس مجلس مذاکرہ میں شریک تھی تقریباً اس کے مساوی تعداد میں امریکی مستشرقین تھے۔ کلوکیم بورڈ نے بعد میں ان تمام مقالات کو کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ کتاب کی ترتیب، اور اس کے انگریزی مضامین کے عربی ترجمہ کا کام کلوکیم بورڈ کے ایک رکن پروفیسر محمد خلف اللہ، پرنسپل کلیۃ الآداب (آرٹس کالج) اسکندریہ یونیورسٹی (قاہرہ) نے سرانجام دیا۔

Marfat.com

مذاکرات میں حصہ لینے والے نمایندوں میں سے جن اصحاب کے رشحاتِ فکر اس مجموعہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ اُن کی فہرستِ اسماء پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں امریکہ کی نمایندگی کرنے والے بعض وہ حضرات بھی ہیں، جو پیشہ ور مسیحی مبلغ ہیں۔ جیسے ڈاکٹر ملّر (Millar burrows) جو "ییل" (Yale) یونیورسٹی میں مسیحی فقہ اور انجیلیات (Biblical Theology) کے پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر ملّر کے تخریب پسندانہ رجحانات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے اسلامی عقائد میں تشکیک کی غرض سے اپنے مقالے میں ایمان بالوحی، ایمان بالرسالت اور ایمان بالقرآن جیسے بنیادی اسلامی مسائل پر بھی بے باکی سے بحث کی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ہیرلڈ سمتھ (Herold Smith) ایک سرکردہ عیسائی پادری ہیں۔ اور او ہیو (OIHO) میں ووسٹر کالج کے پروفیسر اور ریلیجن ڈیپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ انچارج ہیں۔ اس سے قبل یہ قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ و اخلاق کے صدر رہ چکے ہیں۔ امریکی مندوبین میں سے جن کے مقالات شاملِ مجموعہ ہیں۔ کچھ وہ اصحاب بھی ہیں جو امریکہ کی وزارتِ خارجہ میں بطورِ مشیر کام کر چکے ہیں اور امریکی ڈپلومیسی کی مخلصانہ خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر رفائیل، ڈاکٹر جان کرسوویل (John Sowell) اور ڈاکٹر ایلن ہیرلڈ (Allen Herold) وغیرہ۔ ان میں سے اوّل الذکر اقوامِ متحدہ کے شعبۂ اجتماعیات میں امورِ

Marfat.com

مشرقِ اوسط کے مشیر رہ چکے ہیں۔ ثانی الذکر بیروت میں امریکی سفارت خانے میں کلچرل اتاشی کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ اوّلیسرے ڈاکٹر ہارلڈ، جواب "مشرقِ قریب فاؤنڈیشن" میں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر ہیں مشرقِ اوسط میں متعدد سیاسی مناصب پر متعین رہ چکے ہیں۔ چنانچہ مشرق قریب ریلیف فاؤنڈیشن میں منطقہ قوقاز کے ڈائرکٹر آف تعلیمات رہے ہیں۔ پھر اسی ادارے کے مرکزی دفتر (یونان) میں رہے ہیں۔ ایران کے منرو تعلیمی مشن کے ممبر بھی تھے، امریکہ کے مڈل ایسٹ سپلائی سنٹر مشن میں سائنٹیفک ایڈوائزر کے عہدے پر بھی فائز رہے ہیں اور یونیسکو مشن برائے عرب ممالک کے صدر بھی تھے۔ اسی طرح امریکی مندوبین میں ڈاکٹر نبیہ فارس (Nabia Faris) بھی زینتِ فہرست نظر آتے ہیں۔ یہ نیویارک میں جنگی معلومات کے سنٹر میں شعبۂ عربی کے صدر تھے اور امریکن یونیورسٹی بیروت میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے صدر کے منصب پہ بھی سرفراز رہ چکے ہیں۔ انہی کے ساتھ ڈاکٹر چارلس ماتھیوس (Charles Mattews) بھی شریکِ محفل نظر آتے ہیں، جو پہلے امریکی سفارتخانہ مصر میں کلچرل اتاشی تھے اور اب طہران میں امریکن عرب آئیل کمپنی میں شعبۂ تحقیقاتِ علمیہ کے رکن ہیں۔ غرض یہ کہ اس کتاب کے مصنفین کے ناموں پر ایک طائرانہ نگاہ ہی یہ اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے کہ اس پورے گروپ میں امریکہ کی نمایندگی کے فرائض سرانجام دینے

Marfat.com

کے لیے اُن لوگوں کے نام قرعہ فال نکالا گیا ہے، جو اسلامی ممالک کی سیاسیات کے ماہر ہیں اور ان ممالک میں سیاسی امور سے متعلق مہمات سے وابستہ رہ چکے ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو بیروت اور قاہرہ کی امریکن یونیورسٹیوں میں تعلیم و تبلیغ کا کام کرتے رہے ہیں۔

مسلمان نمایندوں کی پوزیشن

مجلسِ مذاکرہ میں مسلمان شرکاء کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی غالب اکثریت ان حضرات کی ہے جو اپنی تعلیم و تربیت میں امریکہ کے شاگرد ہیں۔ یعنی ان کی تعلیم یا تو ممالکِ غیر کے امریکی تعلیمی اداروں کی رہینِ منّت ہے یا خود ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جا کر انہیں تشنگیٔ علم بجھانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور بعض کے انتخاب کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اپنے ملک میں عوام کی فکری اور علمی رہنمائی کے وسائل رکھتے ہیں۔ مثلاً کسی یونیورسٹی میں تدریسی امور سے متعلق ہیں۔ یا وزارتِ تعلیم کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہے یا کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر ہیں۔ کلوکیم کے بعض گوشوں میں ایسے مسلمان مفکرین کا بھی ایک شرذمۂ قلیل رونق افروز نظر آتا ہے جن کے خیالات و افکار اور پیش کردہ مقالات تجدّد و الحاد کی آمیزش و آلائش سے پاک ہیں۔ ایسے لوگوں کو حلقۂ رندان میں گھسیٹ لانے کی توجیہ ہماری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آ سکی کہ کلوکیم کے حقیقی اغراض و مقاصد پر انہیں پردہ پوشی کے لیے استعمال کرنا مقصود ہے۔ گویا ان حضرات کا مقام "نمونے کی جنس" کا تھا۔ جس طرح

Marfat.com

ایک عیار اور دھوکہ باز دوکاندار اپنی ناقص اور ردّی جنس پر پردہ ڈالنے کے لیے کچھ نمونے کی جنس بھی اپنے پاس رکھتا ہے تاکہ گاہکوں کو اس وہم میں ڈال سکے کہ اس کی دکان کا تمام مال اسی معیار کا ہے۔ اسی طرح کلوکیم کے مغربی کارپردازوں نے بھی اپنی جوفروشی کرنے کے لیے ایسے لوگوں سے گندم نمائی کا کام لیا ہے۔ اور کلوکیم میں زیر بحث آنے والی خرافات واہاطیل کے تلخ ذائقے کو بدلنے کے لیے انھیں بطور شیرینی مہیا کیا ہے۔ بایں ہمہ ان نیک نیت اور مخلص مسلمان نمائندوں کی فکری کاوشیں بعض مقامات پر مسامحات سے محفوظ نہیں رہ سکیں۔ مثلاً ہمارے نزدیک شام کے مصطفیٰ زرقاء ان معدودے چند افراد میں سے ہیں جن کے افکار و آراء میں ہر صاحبِ فہم شخص اخلاص اور پاکیزگی کے جذبات محسوس کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے مقالہ: "شریعتِ اسلامی اور عائلی حقوق" میں رائج الوقت مالی اور معاشرتی نظاموں کو ـــــ جو بعض پہلوؤں سے صریح طور پر شریعت اسلامی کے خلاف ہیں ـــــ سندِ جواز دینے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کو اپنا لینے کے لیے معذرت خواہانہ رنگ میں باب الحیل کا سہارا لیا ہے۔ (ملاحظہ ہو مبحث: حدود اللہ اور رباص ۱۵۶ ـــــ ۱۵۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ استاذ زرقا کے مقالے کو پڑھنے والا ہر شخص یہ اعتراف کرے گا کہ مجموعی طور پر اس میں اسلام کی مخلصانہ روح کارفرما ہے، اور انہوں نے شریعتِ اسلامی کے امتیازی اوصاف کو اجاگر کرنے میں اور مخالفین کے لیے اسے قابلِ قبول بنانے میں قابلِ قدر محنت صرف

Marfat.com

کی ہے۔ لیکن اس سارے خلوص اور اہتمام و احتیاط کے باوجود جب وہ شریعتِ اسلامی پر جمود کا الزام دھرنے والے اہلِ مغرب کے روبرو اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرتے ہیں تو اُن لغزشوں کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے جن سے ہر معذرت خواہ ذہن دوچار ہو جاتا ہے۔ وہ پوری نیک دلی کے ساتھ شریعتِ اسلامی کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ شریعتِ اسلامی کے تغیر پذیر اور قابلِ تبدیل پہلوؤں کی فاضلانہ توضیح کرتے ہیں، لیکن اسی مقام پر وہ لغزش کھا جاتے ہیں اور مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنی تشریح و توضیح میں شریعت کے اُن پہلوؤں کو بڑھا چڑھا کر بیان کریں جو مغرب کے موجودہ تصورات سے، جو سر تا سر نفسانی اغراض و اہواء پر مبنی ہیں، ہم آہنگی رکھتے ہوں چنانچہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ نصوص شریعت میں جو احتمال و امکان کے پہلو پائے جاتے ہیں، بیشتر زرقا ان کی آخری سرحدوں تک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں اس حد تک موڑ دیتے ہیں کہ اسلامی اقدار کے ڈانڈے مغربی اقدار کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ بس یہی وہ دامِ ہمرنگ زمین ہے، جو اہلِ مغرب نے مصطفےٰ زرقا اور ان کے ہم خیال نیک طینت ساتھیوں کے لیے بچھایا تھا اور آخر وہ اس میں الجھے بغیر نہیں رہ سکے۔ شریعتِ اسلامی پر مستشرقین اور مغرب پرستوں کی تہمتِ جمود کو دھونے کی کوشش میں وہ شریعت کی لچک اور تغیر پذیری کو بیان کرتے ہیں۔ مگر اس قدر حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ محض موم کی ناک ہے، اس کا انفرادی وجود کالعدم ہے۔ اور اس کے

Marfat.com

لیے کسی بھی نظامِ زندگی کے چوکھٹے میں فِٹ ہو جانا یا کسی بھی تقسانی غرض کو پورا کر دینا مشکل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مصطفٰے زرقا کی اس تشریح اور ترجمانی سے شریعت کی خدمت تو کیا ہو گی بلکہ الٹا شریعت کے اصل مقاصد کے ابطال تک کی نوبت آ جائے گی۔ کیونکہ وہ شریعت کے ذریعے سے انسانی زندگی میں رونما ہونے والے مفاسد اور خرابیوں کی اصلاح کے بجائے خود شریعت کے احکام ہی کو تاویل کے خراد پر چڑھا دیتے ہیں اور مفاسد و معائب کے جواز کا فتویٰ دے دیتے ہیں۔ ان کا یہ طرزِ فکر بحث کے خاتمے پر کچھ اور نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ جب کہ وہ مصر کے قانون ملکی مدوّن کرنے والے بورڈ کی مثال پیش کرتے ہیں اور اُسی کے خطوط پر رائج الوقت اقتصادی نظام کو فقہ اسلامی کی بنیادوں پر منطبق کرنے کی ضرورت کا اظہار کرتے ہیں[1]۔

---

[1] شیخ مصطفٰی زرقا کے مقالہ پر ڈاکٹر محمد محمد حسین کا یہ تبصرہ پڑھ کر راقم کو بڑی خلش ہوئی۔ لیکن جنوری ۵۸ء میں جب لاہور میں اسلامی کلوکیم منعقد ہوا اور شیخ زرقا اس کلوکیم میں شرکت کے لیے تشریف لائے تو راقم نے اس تبصرہ کا ان کے سامنے ذکر کیا۔ شیخ زرقا نے اپنے مقالے کے قابلِ اعتراض حصوں کی تفصیل سے وضاحت کی اور ڈاکٹر محمد محمد حسین کی رائے کو غلط فہمی پر مبنی قرار دیا۔ شیخ زرقا کی وضاحت سے اندازہ ہوا کہ موصوف مسلکِ اعتدال کے حامی ہیں۔ وہ جس قدر تجدّد و جمود سے بیزار ہیں۔ اُسی قدر

(بقیہ صفحہ ۴۰۰ پر دیکھیے)

Marfat.com

ان مقالات و تقاریر کا مطالعہ کرتے ہوئے قدرتی طور پر قاری کے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو ان پس پردہ راندوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔

کلوکیم کے مسلمان نمائندوں میں سے ہر ایک کسی نہ کسی اہم منصب پر فائز ہے، کوئی وزیرِ تعلیم ہے، اور کوئی کسی تعلیمی ادارے کا سرکردہ فرد ہے، ان میں سے بعض انڈونیشیا سے لے کر امریکہ تک سیر و سیاحت کر چکے ہیں۔ یہ سب نمائندے چند ماہ تک امریکہ میں قیام کرتے ہیں۔ وہاں کے مختلف مقامات اور شہروں کا دورہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دوروں اور تفریحات پر غیر معمولی اخراجات اٹھے ہوں گے۔ علاوہ ازیں قیام و طعام پر، مختلف تقاریب پر دی جانے والی پارٹیوں اور دعوتوں پر، تحائف و ہدایا پر، لیکچروں کے فراخدلانہ معاوضوں پر، زیرِ نظر مقالوں کے تراجم پر اور انھیں نفیس اور اعلیٰ قسم کے کاغذ پر شائع کرنے

(بقیہ صفحہ ۳۹۹ سے آگے):

موجودہ مذہبی جمود کے بھی خلاف ہیں۔ البتہ شیخ زرقا نے ان تمام ہتھکنڈوں کی تائید کی جو امریکی کلوکیم میں مستشرقین کی جانب سے اختیار کیے گئے تھے اور جن کی نشان دہی ڈاکٹر محمد حسین نے زیرِ نظر مقالے میں کی ہے۔

(مرتب)

Marfat.com

پر، ڈالروں کی بھاری مقدار کلوکیم کی نذر ہوئی ہوگی۔ ایک عام قاری جب ان تمام امور پر غور کرتا ہے، تو کیا اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھنا طبعی بات نہیں ہے کہ آخر یہ زرِ کثیر کس مقصد کی خاطر پانی کی طرح بہایا گیا ہے؟ پھر جب وہ آگے بڑھ کر یہ دیکھتا ہے کہ ان تمام مقالات میں صرف اسلامی مسائل، اور اسلامی موضوعات ہی کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، جن کا براہ راست تعلق صرف مسلمانوں سے ہو سکتا ہے، تو اسے تھوڑی دیر کے لیے یہ خیال گزرتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ امریکہ کی ان تمام مساعی اور مالی قربانی کا مدعا اسلام کی پہچان بین ہو اور اسلام کو ولایات متحدہ امریکہ کا سرکاری مذہب قرار دینے کے لیے یہ پاپڑ بیلے گئے ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ دوسرا سوال ذہن میں چٹکی لینے لگتا ہے کہ اسلامی موضوعات و مسائل کی تحقیق و تحیص کے لیے امریکن پادریوں اور امریکن ڈپلومیٹک انتھارٹیز کو اس پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت تھی؟

یہ چند سوالات ہر اس شخص کے ذہن میں ابھر آتے ہیں، جو اس مجموعہ کو مطالعہ کرنے کا آغاز کرتا ہے، لیکن قبل اس کے کہ کوئی گھر کا بھیدی اٹھ کر ہمارے ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کرے، ہم اسی مجموعے کے مندرجات سے جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

رازہائے دروں پردہ

کلوکیم کے اغراض و مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی بتایا گیا ہے

Marfat.com

کہ دوستی اور خیر سگالی کے ذریعے اسلامی ممالک کے ساتھ روابط استوار کرنے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ممالک کے ساتھ ایسا دوستانہ رشتہ جوڑا جائے جو ایک طرف اسلامی ممالک میں امریکی مصالح کے تحفظ کا ضامن ہو اور دوسری طرف مسلمان اقوام کو روسی بلاک کے خلاف استعمال کرنے میں کارآمد ہو۔ کلوکیم کا یہ مقصد اس قدر اساسی حیثیت رکھتا ہے کہ اول سے لے کر آخر تک پوری کتاب پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں، جسے بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور کلوکیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر بایارڈ ڈوج (Bayard - Dodge) نے لکھا ہے، اس مقصد کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: "ماضی میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان معاندانہ رشتہ تھا۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ دونوں مذہب متحد ہو کر مادیت کا مقابلہ کریں، جو اس وقت روحانی اقدار پر اعتقاد و یقین کی عمارت کو ڈھانے کے لیے زبردست خطرے کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے"۔ انہی خیالات کی صدائے بازگشت ہمیں ڈاکٹر ملر بروز کے مقالے: "اسلام کی نگاہ میں مذہب و سائنس کا باہمی تعلق" میں سنائی دیتی ہے۔ اور جب وہ روحانی اقدار کے خلاف مادیت (Materialism) اور لادینیت (Secularism) کے خطرات کی گھنٹی بجاتے ہیں تو ان کا مقصد بھی اسلام اور مسیحیت میں اتحاد کی دعوت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہیرلڈ سمتھ

Marfat.com

جب "اسلام اور فرد" پر گفتگو کرتے ہوئے فکرِ اسلامی کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ وہ قطعاً جبری اقتصاد اور تاریخ کی مادّی تعبیر ——— جو مارکسی فلسفہ میں اساس کی حیثیت رکھتے ہیں ——— سے متفق نہیں ہو سکتا۔ تو ان کی اس "اسلامی دریافت" کا منشا بھی مذکورہ بالا مقصد کی اہمیت کو واضح کرنا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جان کر سویل اور ڈاکٹر کینتھ کراج وغیرہ کے بیانات میں بھی اسی طرح کے خیالات ملتے ہیں۔ اور ان سب میں ٹیپ کا بند یہی ہے کہ اسلام اور مسیحیت میں جلد از جلد دوستی کے راستے ہموار کیے جائیں تاکہ اشتراکیت کے منڈلاتے ہوئے خطرات کا فوری سدِّباب کیا جا سکے۔

لیکن ڈاکٹر جان کر سویل کا مقالہ اس پیغام دوستی کو بڑی خطرناک صورت سے دوچار کر دیتا ہے۔ اور وہ اپنی سادہ بیانی اور طلاقتِ لسانی کے ہزار داؤ پیچ لگانے کے باوجود بالآخر ان خفیہ مقاصد کی پردہ داری کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا جو اس کے بطن میں چھپے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر جان صراحت کے ساتھ ان کوتاہیوں کا اعتراف کرتا ہے، جو امریکہ سے اور مغربی امپریلزم سے عالم اسلامی کے معاملے میں سرزد ہوئی ہیں۔ گویا وہ اقرارِ جرم کر کے مسلمانوں کے اضطراب اور بے اعتمادی کی کیفیت کو اطمینان و اعتماد سے تبدیل کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد عالمِ اسلامی کے لیے وہ اقتصادی امداد کی مختلف شکلیں تجویز کرتا ہے، اور پھر ان روابط پر بحث کرتا ہے جو اسلام اور مغرب کو باہم بغل گیر کر سکتے ہیں۔ لیکن ان تمام

Marfat.com

پیش بندیوں کی تان وہ اپنے مرکزی ہدف پر لاکر توڑتا ہے، اور وہ ہے روس کی بڑھتی ہوئی جوع الارضی سے چوکس رہنے کی ضرورت۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ عالم اسلامی کے اندر ایک مشترکہ دفاعی ادارے کے قیام کی تجویز پیش کرتا ہے، اور اس کے مالہٗ اور ماعلیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ جو ممالک اس ادارے میں شریک ہوں ان کی عسکری قوت اور فوجی تیاری کا اندازہ لگا لیا جائے۔ اور اگر وہ جدید طرز کی جنگوں کے لیے ناکافی ہو تو مغرب کی طرف سے انھیں پوری امدادی جائے۔ بلکہ ان ممالک کی افواج کی ٹریننگ اور اِن کی قیادت کے فرائض بھی مغرب ہی کو سرانجام دینا چاہیے۔

امریکہ اور آرامکو

اسی قسم کے استعماری مقاصد ہیں ڈاکٹر چارلس ماتھیوس (Charles Mattews) کے آرٹیکل میں جا بجا جھلکتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر مذکور ظہران (سعودی عرب) میں آرامکو کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کے رکن ہیں۔ اس سے قبل وہ قاہرہ میں امریکی سفارت خانہ کے کلچرل اتاشی رہ چکے ہیں۔ یہاں یہ معمہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص جو وزارت خارجہ میں کام کر رہا ہوتا ہے حکومتِ امریکہ کس بنا پر اسے وہاں سے اٹھا کر آئیل کمپنی کے ساتھ وابستہ کر کے قلبِ صحرا میں علمی تحقیقات پہ لگا دیتی ہے۔ آرامکو کا ریسرچ ڈیپارٹمنٹ بجائے خود ایک مشتبہ چیز ہے، اس کی "تحقیقاتی" سرگرمیوں کا دامن شکوک و شبہات سے پاک نہیں ہے۔

Marfat.com

کمپنی کی مہم بظاہر یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ صرف زمین کے پیٹ سے تیل نکالنے پر مامور ہے، مگر خود کمپنی کے ایک ملازم ـــــ ڈاکٹر چارلس ـــــ کے انکشاف کے بموجب، کمپنی جزیرۂ عرب میں تاریخی، جغرافیائی اور اقتصادی تحقیقات اور طبقات الارض کی جانچ پڑتال کا کام بھی کرتی ہے۔ شعبۂ تحقیقات کے عملے کا کام یہ ہے کہ وہ جزیرۂ عرب کے مشرقی حصّے اور صحرا کا سروے کرتا ہے، مختلف حصّوں کے نقشے تیار کرتا ہے، مختلف عرب قبائل اور مختلف مزاج کے باشندوں سے راہ و رسم پیدا کرتا ہے، کیا ان کاموں کو دیکھ کر یہ کہنا بے جا ہوگا کہ یہ گروہ علمی انکشافات کے پردے میں جزیرہ عرب کے مشرق اور صحرائے خالی میں جاسوسی کی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ گو وہ اپنے معصومانہ بیانات اور رپورٹوں سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی تگ و دو جزیرۂ عرب کی ایک ایسی جامع تاریخ مرتب کرنے تک محدود ہے، جو زمانۂ قدیم سے دورِ جدید تک کی مکمل انسائیکلوپیڈیا ہو۔ اور اس کام کے لیے اگرچہ وہ متعدد پہلوؤں پر تحقیقی مواد فراہم کر چکا ہے۔ مگر ہنوز اس کام کی تکمیل کے لیے بڑا وقت درکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم آرامکو کے شعبۂ تحقیقات کا جائزہ لیتے ہیں اور اس میں ڈاکٹر چارلس کی مساعی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارا ذہن یک لخت نامور انگریز جاسوس کرنل لارنس کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جس نے جنگِ عظیم میں برطانیہ کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ ڈاکٹر چارلس نے اپنے مقالے میں کمپنی کا یہ موقف

Marfat.com

بیان کرکے ہمارے شکوک وشبہات کو نہ صرف تقویت پہنچائی ہے بلکہ ایک حیرت انگیز انکشاف یہ بھی کیا ہے کہ "کمپنی اس امر کی ذمہ دار ہے کہ وہ حکومتِ امریکہ کو پوری معلومات مہیّا کرے کہ عرب ماضی میں کیا تھے اور اب کیا ہیں؟ اور مغرب، کی جمہوریت پرست دنیا کے لیے عربوں کی دوستی اور تعاون کی اہمیت کس حد تک ہے؟"

امریکہ کی دوستی

یہ وہ تاثرات ہیں جو کتاب کے متن اور بین السطور سے واضح طور پر مترشح ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، یہ باتیں ہمارے لیے کوئی اتنا بڑا خطرہ نہیں ہو سکتیں، بشرطیکہ ہم بیداری اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیں اور اپنی آزادی واستقلال کو ہر قیمت پر محفوظ رکھنے کا تہیہ کر لیں۔ اس آزادی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ہم نہ مشرقی کیمپ کے حاشیہ بردار بنیں اور نہ مغربی کیمپ کے۔ ہماری نگاہ میں اس مؤتمر کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ ویسا ہی ایک پروپگنڈے کا حربہ ہے جو ہر حکومت دوسری حکومت کی رائے عام کو اپنے حق میں سازگار کرنے کے لیے اختیار کرتی ہے۔ مؤتمر کے اغراض ومقاصد میں سے ہمارے لیے اگر کوئی خطرناک پہلو ہو سکتا ہے تو وہ منافقانہ مساعی ہو سکتی ہیں جو اسلام کی بنیادوں کو منہدم کرنے، یا اسلام کی حسبِ منشاء قطع وبرید کرکے، اسے امریکی پروپگنڈے کا آلۂ کار بنانے کے سلسلے میں صرف ہو رہی ہیں۔ دوستی اور محبت کی پینگیں جنھیں آج امریکہ ——— انگریزوں اور

Marfat.com

فرانسیسیوں کا جانشین بن کر، جن کا منحوس سایہ اب مشرقِ اسلامی سے سمٹ رہا ہے ..... ہماری طرف بڑھانے کے لیے بے تاب ہے، اِن کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ اس دوستی کو مشرقِ اسلامی میں اپنی گوناگوں سیاسی، تجارتی اور عسکری مصلحتوں کی حفاظت کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اور آج کل امریکی سیاست میں مشرقِ وسطیٰ کے جس "خلا" کے چرچے ہیں اور جسے پُر کرنے کے لیے منصوبہ بندیاں ہو رہی ہیں، اس "خلا" کی پیدائش کا سبب بھی اُن "دوستانہ تعلقات" کا نتیجہ ہے جو فرانسیسی اور برطانوی استعماریت نے ہم سے قائم کر رکھے تھے اور اُن کی بساط لپیٹ جانے کے بعد اب امریکی دلالوں کا گروہ اس خوانِ یغما پر یورش کر رہا ہے۔

امریکہ اور اسلام

اب ظاہر ہے کہ ان "دوستانہ تعلقات" کو استوار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی بنیادیں فراہم کی جائیں جو مشرق و مغرب میں مماثلت رکھتی ہوں۔ اور باہم تبادلۂ خیالات سے دونوں فریقوں کے زاویہ ہائے نگاہ کا سنگم قرار پا جائیں اور دونوں کے مزاج اور طبائع میں بھی کسی حد تک یگانگت پیدا کر دیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسی بنیادی مماثلت روبظہور لانے اور اسے پختہ کرنے کے لیے اس سے کارگر کیا تدبیر ہو سکتی ہے کہ دونوں کی اخلاقی اور اجتماعی اقدار کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے بلکہ یکرنگ کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اب

Marfat.com

مشکل یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی اقدار کا اتصال اور امتزاج اس وقت تک محال ہے، جب تک مسلمان قوم اسلام کی ٹھوس اور اٹل اقدار اور اساسات پر ـــــ جو مغربی اقدار سے سرے سے کوئی مماثلت ہی نہیں رکھتیں ـــــ جمی ہوئی ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے دو ہی راستے ہیں:

اولاً یہ کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام اور اس کی اساسی تعلیمات کے بارے میں شک اور بے یقینی کے بیج بو کر اسے حقیقی اسلام کے تصور سے بیگانہ کر دیا جائے اور افراد کی اجتماعی زندگی سے اسلام کی گرفت کو ختم کر کے اس کا دائرہ مسجد کی چار دیواری تک تنگ کر دیا جائے۔ اور لوگوں کو اس امر پر مطمئن کر لیا جائے کہ مذہب اور چیز ہے اور مسائل زندگی چیزے دگر۔

ثانیاً یہ کہ اسلام کا "ماڈرن ایڈیشن" تیار کر کے اس سے مغربی اقدار اور مغربی نظامِ زندگی کے جواز کی سند فراہم کر لی جائے۔ اور مسلم اقوام اور مغربی اقوام کے مابین اختلافِ اقدار اور اختلافِ افکار نے جو خلیج حائل کر رکھی ہے اس طرح اسے پاٹ دیا جائے۔ دوسری صورت اگر کامیاب ہو جائے اور فی الواقع اسلام امریکہ کے مقاصد کا آلۂ کار بن جائے تو ہمارے نزدیک وہ دن دنیا کے اندر قیامت کی وحشت و ہولناکی سے کم نہ ہوگا۔ اس لیے یہ راستہ نسبتہً دشوار ہے۔ البتہ اوّل الذکر حربہ مسلمانوں کو اسلامی اقدار اور اسلام کے اصول و مبادی میں ترمیم پر رضامند

Marfat.com

کرنے کے لیے کارگر ہدرقہ بن سکتا ہے۔ لیکن اس ترمیم سے مطلوبہ نتائج اخذ کرنے کے لیے لازم ہے کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے اسے بروئے کار لایا جائے۔ ملّتِ اسلامی کا اجتماعی شعور دین میں ان ترمیموں کو قبول کرنے سے اس وقت تک اِبا کرتا رہے گا، جب تک اسلام پر مسلمانوں کے اعتقاد و یقین کو کمزور نہ کر لیا جائے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات نہ اتار دی جائے کہ اسلام کی موجودہ شکل زمانۂ حال کے مطالبات پورا کرنے کے بجائے ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ یا کم از کم مسلمانوں کو اس بات کا عادی نہ بنایا جائے کہ وہ عام مسائلِ زندگی میں اسلامی اصولوں کی پیروی ترک کر دیں اور اسلام کے مآخذ کو طاقِ نسیاں کی زینت بنانے سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔ کلوکیم میں حصّہ لینے والے نمائندوں کی تقاریر اور تشریحات میں ہمیں ان تمام تخریب پسندانہ ہتھکنڈوں کی جا بجا تصویریں نظر آتی ہیں۔

بنیادی عقائد میں تبدیلی کا مطالبہ

اسلامی عقائد میں تزلزل پیدا کرنے والے شر انگیز خیالات ڈاکٹر ملر کے مقالے میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے مقالے میں اس نے مطالبہ کیا ہے کہ دین، نبوّت، معجزات، نماز اور قیامت وغیرہ بنیادی مسائل پر بھی بحث و تمحیص اور نظرِ ثانی ہونی چاہیے اور انھیں علم النفس کے اصولوں کے تحت مرتب کیا جائے۔ حالانکہ علم النفس کے مناسبطہ خود ظن و تخمین کے پائے چوبیں پر قائم ہیں اور ان میں تغیر و تبدل کا لامتناہی سلسلہ

Marfat.com

جاری ہے۔ ڈاکٹر ملّر اپنے انہی خیالات کے تحت دین پسندی کو ذوق اور تخیل کا مسئلہ قرار دیتا ہے۔ جس کا خارجی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے بلکہ وہ اس حد سے بھی آگے بڑھ کر اپنے خیالات کی کمند ڈالتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے "طرزِ خدائی" کے متعلق گفتگو شروع کر دیتا ہے اور اسے باقاعدہ معرضِ بحث و تحقیق میں لانا چاہتا ہے۔ الغرض پادری صاحب نے اپنے خیالات کی تائید میں اپنے مقالے میں، کچھ فلسفہ کے اصول و ضوابط کا بھی ذکر کیا ہے۔ حالانکہ یہ ضوابط محض فلسفیانہ مفروضوں (Philosophical Presumptions) کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن وہ انھیں اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ گویا وہ ایسے ثابت شدہ حقائق ہیں جن کی صحت و صداقت محتاجِ دلیل نہیں ہے۔ اور پھر ان مفروضوں کا قرآن کی بعض آیات سے موازنہ کر کے قاری کو اس وہم میں ڈال دینا چاہتا ہے کہ آیاتِ قرآنی واقعات و حقائق کے خلاف ہیں۔ ڈاکٹر ملّر کی مطلق العنانی میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ لاگ لپٹ رکھے بغیر آخر یہ کہہ ہی ڈالتا ہے کہ "وحی زمان و مکان کے تقاضوں کے تحت نازل ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ نظرِ ثانی اور تصحیح کی محتاج رہتی ہے۔" ڈاکٹر ملّر کی ہم صفیری میں ڈاکٹر ہیرلڈ سمتھ نے بھی یہی زہر افشانی کی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ "لفظی ڈھانچے اضافی ہوتے ہیں۔ ان پر معصومیت اور ابدیت کی چھاپ نہیں لگائی جا سکتی۔ ان کا گاہے بگاہے تبدیل ہوتے رہنا ضروری ہے۔"

Marfat.com

دین اور سیاست میں کیسا تعلق ہو

دین کے دائرہ اقتدار کو محدود کرنے اور اسے زندگی کے ان مسائل سے جن پر فی الواقع معاشرے کا قصر تعمیر ہوتا ہے، برطرف کر کے پوجا پاٹ تک محصور کر دینے کے رجحانات معلوم کرنے کے لیے ہیرلڈ سمتھ ایسے ہوشیار اور مکار پادری کے آرٹیکل کا مطالعہ کر لینا ضروری ہے۔ وہ اپنے آرٹیکل میں ضیا کول الپ[1] کا نظریہ "مذہب و سیاست کی تفریق" بڑے جاذب اور قابلِ رشک انداز میں پیش کرتا ہے اور ضیا کول الپ کو جدید ترکی کا نظریاتی اور فکری مؤسس ثابت کرتا ہے۔ اور جدید ترکی کی تمام ترقی اور تجدد پسندی اس کے منبعِ فکر سے منسوب کرتا ہے۔ خاتمۂ بحث پر بڑی دلسوزی کے ساتھ پکار اٹھتا ہے کہ "اگر چرچ اور اسٹیٹ (مذہب و سیاست) کے باہمی ربط کو اس شرط پر باقی رکھنا ممکن ہو جائے کہ اس ربط سے متعصب رجعت پسندی کو شہ نہ ملے گی اور وہ کسی دوسرے مسلک یا کسی جدید نظریے کو اپنی معروف دینی اصطلاحات اور مروجہ مذہبی مراسم کے خلاف دیکھ کر بالکل اور مردود نہ ٹھیرائے گی۔ نیز اس ربط کو عصبیت اور قدامت پرستانہ اجتماعی تصور سے ملوث نہ ہونے دیا گیا، تب یہ ربط سوسائٹی کے اندر ایک حقیقی اور صحت مندانہ طاقت پیدا کر دے گا۔ میں اس موقع پر تمام مخلص اور محب الوطن مسلمان لیڈروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ قبل اس کے کہ عجلت میں کوئی ایسا ٹھوس اور مبرم فیصلہ کر لیں، جس کا منسوخ کرنا دشوار ہو جائے، میری ان پیش کردہ گذارشات پر ضرور غور و فکر کر

---

[1] جدید ترکی کا ملحد شاعر اور فلسفی۔

Marfat.com

لیں۔"

شریعتِ اسلامی کو حسبِ منشا ڈھال کر اُسے مغربی افکار و اہواء کے ہاتھوں میں دے دینا اور اسلام اور مغربیت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا اس مؤتمر کی غایتِ اُولیٰ ہے، اسی مقصد کی خاطر بھاری بھرکم مصارف برداشت کیے گئے اور اسی مقصد کی خاطر تمام عرق ریزیاں کی گئیں۔ اور جو پروگرام اور اسکیمیں مجلس میں زیرِ بحث آئیں اُن سب کا محور یہی تھا۔ خود زیر تبصرہ کتاب انداول تا آخر اس رجحان کی شہادت دے رہی ہے۔ مغربی مفکرین نے اس سلسلے میں زیرکی یہ دکھائی ہے کہ اپنے اس رجحان کو ایک ہی سانچے کا سکہ بنا کر ظاہر نہیں کیا۔ بلکہ اس کے لیے مختلف اقسام کے جامے تراشے ہیں۔ کبھی انہیں تمناؤں اور آرزوؤں کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ اور کبھی مختلف موضوعات و عنوانات کے نام سے اُن پر دعوتِ مباحثہ دی ہے۔ مثلاً پادری اسمتھ اپنے مقالے کا مغز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "اس مقالے میں میرا مرکزی نقطہ نگاہ یہ ہے کہ میں بعض نئے پیدا شدہ رجحانات و افکار کا جائزہ لوں۔ نیز انسان کے بارے میں انسانی نقطۂ نگاہ کیا ہونا چاہیے۔ اس پر غور و فکر کے پہلو آپ کے سامنے رکھوں ..... کیونکہ بلاشبہ اس قسم کا مطالعہ ——— جو ہمہ گیر اور جامع صورت میں ہو ——— خود مسلمانوں کے اہلِ علم و اہلِ فکر حضرات کے ہاں بھی متروک ہو چکا ہے۔" اگر ایک امریکی پادری کو یہ اجازت دے دی جائے ——— اور فی الواقع اُسے یہ اجازت دے دی گئی ہے

Marfat.com

——— کہ وہ اسلام کے موضوعات اور مسائل کو بحث و تمحیص کے لیے مجلس کے سامنے رکھے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی مسندِ ارشاد اور زمامِ پیشوائی امریکی مفکرین بلکہ امریکی پادریوں تک کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اور پھر اس کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ امریکی مفکرین اور اُن کے ہم نوالہ مسلمان جن موضوعات کو چھیڑنا چاہتے ہیں، اُن میں قضا و قدر کے موضوع بھی شامل ہیں (جیسا کہ پادری ہیرلڈ سمتھ نے اپنے مقالے میں قضا و قدر کے خوابیدہ مسئلہ کو جگانے کی کوشش کی ہے۔) ایسے موضوعات پر بحث کا دروازہ اگر ایک بار کھول دیا جائے تو ابدالآباد تک بند نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ایسے مسائل پر مغز ماری سے کسی یقینی اور مفید نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ بجز اختلافات کے اور بھانت بھانت کی بولیوں کے دنگل کے، اس سے کچھ حاصل نہیں۔ مسلمانوں کے حق میں اس کے مضر اثرات یہ ہوں گے کہ اُن کی توجہ حقیقی خطرات سے، جو ان کے وجود تک کے لیے پیغامِ اجل رکھتے ہیں، ہٹا کر بازنطینی اور یونانی مناظروں میں لگا دی جائے۔

..... ایسے مسائل کو اس قدر اہمیت سے پیش کرنے میں ایک مضحکہ انگیز پہلو یہ بھی ہے کہ گویا مسلمانوں کی پس ماندگی، زبوں حالی اور غلامی کا اصل سبب یہ ہے کہ انہیں قضا و قدر کے مسائل اور الجھنوں کا صحیح حل میسر نہیں آسکا ہے۔ اور اب اُن مسائل کا صحیح حل ہی ان کی تمام قومی اور ملکی مشکلات اور امراض کا تیر بہدف علاج ہے۔

Marfat.com

دام اور صید

اہلِ مغرب شریعت اسلامی کو "زمانہ ساز" بنانے کے لیے ایک یہ اسلوب بھی اختیار کرتے ہیں کہ شریعت اسلامی کے مجموعی ڈھانچے میں سے چند ایسے قواعد منتخب کر لیتے ہیں جو جدید تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ رواج کے خلاف ہیں۔ اور انہیں موضوعِ سخن بنا کر مسلمان علماء کو آہستہ آہستہ اُن پر بحث و مناظرہ کے لیے تیار کر لیتے ہیں۔ اور مختلف اُلجھاؤ پیدا کر کے انہیں اس قدر مرعوب کر لیتے ہیں کہ اُن کو قرآن اور سنت کے نصوص میں تحریف کی راہ اختیار کرنے کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں ملتی۔ ایسے تحریفانہ اقدامات زیادہ تر ہمیں عورت اور اس کے دائرہ کار کے معاملے میں ملتے ہیں۔ بغداد کے لاء کالج کے پرنسپل اور عراق کی المجمع العلمی کے چیئرمین ڈاکٹر فیر القاضی کا مقالہ "اسلام کے بعض عمومی پہلو" میں اس کی مثال موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام نے امورِ حکومت میں بھی عورت کو حقوق عطا کیے ہیں۔ اور اس میں مرد اور عورت کے مابین کوئی تفریق روا نہیں رکھی۔ اور عورتوں کو بھی صدرِ ریاست کی بیعت کا اُسی طرح حق دیا ہے جس طرح مردوں کو دیا ہے"۔ اس کے بعد وہ قرآن کی اس آیت کو اپنے فیصلے کی تائید میں لاتے ہیں: یاایھا النبی اذا جاءک المؤمنات یبایعنک ..... نبا یعھن (اے نبیؐ! جب تیرے پاس مومن عورتیں بیعت کے لیے آئیں۔ تو اُن سے بیعت لے لو)۔ قاضی صاحب نے اپنے استدلال کے لیے اس آیت کی جس

Marfat.com

طرح قطع و برید کی ہے وہ حد درجہ قابلِ افسوس ہے۔ پوری آیت یہ ہے:
یاایھا النبی اذا جاءک المومنات یبایعنک علی ان لا یشرکن باللہ شیئًا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یأتین ببہتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبایعھن واستغفر لھن اللہ ان اللہ غفور رحیم ——— الممتحنۃ ۱۲ ———
(اے نبیؐ! جب تیرے پاس مومن عورتیں بیعت کے لیے آئیں اور عہد کریں کہ خدا کا کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی۔ چوری نہ کریں گی۔ زنا نہ کریں گی۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اور نہ کوئی ایسا بہتان تراشیں گی جو ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان ہو۔ اور نہ کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی کریں گی۔ تو اُن سے بیعت لے لو)۔ آیت سے صاف واضح ہے کہ یہاں بیعت سے مراد عورتوں کا وہ عہدِ وفا ہے جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کے لیے کیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسلام نے عورتوں کو صدر ریاست کے انتخاب میں شرکت کا حق دیا ہے۔ یہ صرف فاضل سکالر کی اپنی من مانی تعبیر ہے، جسے انہوں نے یورپ کی ہوائے نفس کو تسکین دینے کے لیے اختیار کی ہے۔ اُن کی اس تعبیر و استدلال کا بھونڈا پن کسی صاحبِ علم کے لیے وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امارت نہ مذکورہ بیعت پر وجود میں آئی تھی اور نہ آپ کی امارت انسانی انتخاب و اختیار سے

Marfat.com

متعلق تھی۔ بلکہ آپؐ کا انتخاب من جانب اللہ تھا۔ اور اللہ جل وشانہٗ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے آپؐ کو چُن کر یہ فضیلت عطا فرمائی تھی۔ اسی سے ملتا جلتا تحریفانہ طرزِ استدلال ہمیں سفیر مصر برائے امریکہ ڈاکٹر احمد حسین کی بیگم صاحبہ کے ہاں ملتا ہے۔ سفیر صاحب کی بیگم صاحبہ نے اپنے مضمون :۔۔۔۔ "مصری عورت میں معاشرتی انقلاب"۔۔۔۔ میں پردہ اور تعدد ازدواج پر جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اگر اُسے سمجھ فہمی اور غلط استنتاج کا پلندہ کہا جائے تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہ ہوگا۔ بیگم صاحبہ نے بالکل اندھیرے میں لاٹھی چلائی ہے۔ اور اُن کا تمام تر سرمایۂ معلومات یورپین مصنفین اور تاریخ نگاروں کی بے سروپا ہفوات سے ماخوذ ہے۔[1]

---

[1] بیگم صاحبہ قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی کی گریجویٹ ہیں۔ انہوں نے اپنے مقالہ : "مصری عورت کی معاشرتی ترقی" کے آغاز ہی میں مصر کی انجمن ترقی نسواں کی بانی مدیٰ شعراوی کو مصر کی قابلِ فخر خاتون قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ وہ خاتون ہے کہ آج سے ۳۰ سال قبل جب یہ روم کی وومن کانفرنس سے فارغ ہو کر مصر پہنچی تھیں تو انھوں نے بحری جہاز سے اُترتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنا برقع اُتار کر بحیرۂ عین میں پھینک دیا تھا۔ برقع کے بارے میں موصوفہ نے اپنی تحقیقات کے جو نتائج امریکی مفکرین کے سامنے اپنے مقالہ میں پیش کیے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ : "صدرِ اوّل میں اسلامی معاشرے میں، برقع کا رواج نہ تھا۔ برقع بازنطینی تہذیب سے مسلمانوں کے اندر منتقل ہوا ہے۔ چونکہ مسلمانوں (۳)

Marfat.com

جاہلیت اولیٰ کا احیاء

تحریف دین کے لیے مغربی سیاستدانوں نے دوسرا تدبیر یہ اختیار کر رکھی ہے ——— اور جو بدقسمتی سے اپنی خطرناکی کے باوجود اکثر لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہے ——— کہ ہر اسلامی ملک میں وہاں کی تاریخ ماقبل اسلام کو زندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اس کی دو مثالیں ——— پروفیسر کارلٹن کون (Carletions Conn) اور پروفیسر جے۔ اے۔ ولسن (J. A. Wilson) کے مقالوں میں ہمیں ملتی ہیں۔ پروفیسر کون کے مقالے (Anthropology for me Arabs) میں ہماری نگاہ میں وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو مسلمان مؤرخین کو قدیم تاریخ پر توجہ دلانے کے سلسلے میں امریکہ کے غیر معمولی شغف و اہتمام سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔ جیساکہ خود ڈاکٹر کون لکھتا ہے: "آج سے مغرب کے ماہرین آثارِ قدیمہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مسلمان علمائے آثار کو مل جل کر تربیت دیں، اور انہیں اس قابل بنا دیں کہ جو کام مغربی ماہرین آثارِ قدیمہ کو سرانجام دینا

---

(۴) کے اندر خوشحالی بڑھ گئی تھی اور مسلمانوں میں لونڈیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار ترقی کر گیا تو انہوں نے آزاد عورت اور لونڈی میں علامتِ امتیاز قائم کرنے کے لیے بازنطینی برقع کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔"

(الثقافۃ الاسلامیہ ص ۵۱۷)

Marfat.com

پڑتا ہے۔ اُسے خود مسلمان سرانجام دینے لگیں۔۔۔

قریب اور مشرقِ اوسط کے ملکوں میں ایک ایسی تہذیب جنم لے رہی ہے، جسے ایک لحاظ سے تہذیبِ جدید کہا جا سکتا ہے۔ اور ایک دوسرے پہلو سے وہ قدیم تہذیب کی نشاۃ ثانیہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اور توقع ہے کہ شخصی حقوق و مراعات کی حد تک عربی اور اسلامی تہذیب بھی قدیم روایات و اقدار کی تائید کرے گی۔" ڈاکٹر ولسن اس جاہلی تہذیب کے جنم پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے یورپ کی تاریخ سے اس کی مثال مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ ــــ "مسیحی یورپ کی تحریک نشاۃ ثانیہ، جس نے ازمنہ وسطیٰ کو پیٹ کر جدید یورپ کی داغ بیل ڈالی، اور یورپ کی تحریک احیائے علوم و آثار، جس نے اپنے تحقیقی کاموں کی بنیاد روم و یونان کی بت پرستی کی کلاسیکل شکلوں پر رکھی، مشرق کی جدید تہذیبی بیداری کی نظیر میں پیش کی جا سکتی ہے" ــــ آگے چل کر ڈاکٹر ولسن یورپ کی تحریکِ نشاۃ ثانیہ کی کامیابی کا راز بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: "دراصل مغرب کو اپنی فکری طاقت اور اپنے مذہبی عقیدے پر اس قدر اعتماد تھا کہ اُس نے اپنی تعمیرِ نو کی بنیاد اس ملبے سے اٹھائی، جو قبل مسیح دور سے فراہم کیا گیا تھا۔ اسی اعتماد کی بدولت اُس نے اپنی شخصیت پر غور و فکر کیا، اور اپنے مستقبل کی راہیں متعین کیں۔" لیکن کیا اسلام کے بارے میں بھی یہ قیاس درست ہو سکتا ہے؟ کہ وہ مسلمان قوم کو جاہلی اقدار کی طرف رجوع کرنے کی اجازت دے گا..... ؟ مغربی سیاست کار مشرق میں جاہلی تہذیب کے احیاء کی جو اسکیمیں نافذ کر رہے ہیں ان کی تائید مزید اسی سکالر کی ایک

Marfat.com

تجویز سے بھی ہوتی ہے۔ یہ تجویز اس نے کلوکیم کے مسلمان نمایندوں کے سامنے پیش کی تھی۔ اس تجویز میں اُس نے اثری ڈیپارٹمنٹ کو وزارتِ تعلیم میں ضم کر دینے پر زور دیا ہے اور سیر و سیاحت کے محکموں سے اس کی وابستگی کو غلط ٹھہرایا ہے۔ اس الحاق کا فائدہ یہ بیان کیا ہے کہ "اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اثری تحقیقات اور یونیورسٹی ریسرچ ورک کے مابین مضبوط اور مستحکم تعلق ہو۔" اس تجویز کے بطن میں دراصل یہ غرض پنہاں ہے کہ آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس ڈھب پر ہو کہ اُس کے دل و دماغ کے ریشوں میں جاہلی اقدار اور نسلی اور روایتی علائق کی محبت اس طرح سرایت کر جائے کہ ان کے ذہن سے اسلامی اقدار و روایات کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے ——— وہی جاہلی روایات و اقدار جن کو اسلام نے نیست و نابود کر کے ان کے کھنڈروں پر اپنی پاکیزہ عمارت تعمیر کی تھی۔

آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے مغربی مفکرین جس مقصد کے لیے تڑپ رہے ہیں، اُس کے لیے مزید دلائل و شواہد کی حاجت ہو، تو آپ انگریز مستشرق آر۔ اے۔ گب (R. A. C bb) کی کتاب

(Whither Islam) کے صفحہ ۳۴۲ پہ ان الفاظ کو غور سے پڑھیں:

"عالمِ اسلامی کی فرنگیت پسندی کا سب سے بڑا ثبوت ہمیں یہ ملتا ہے کہ وہاں ان قدیم تہذیبوں کے احیاء کی طرف دھیان بڑھتا جا رہا ہے جو ماضی میں مختلف مسلم ممالک میں اپنی شانِ عروج دکھا چکی ہیں۔ اس کی مثال ترکی، مصر، انڈونیشیا

Marfat.com

عراق اور ایران میں بآسانی مل سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فی الحال اس اہتمام کی حقیقت یورپ دشمنی کے شعور کی تقویت کے لیے ہو، لیکن مستقبل میں یہی چیز شعوبیت اور طائفیت کی جڑوں کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔"

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد بھی اسی طرح یکایک علم الآثار کے ساتھ مغربی شغف بڑھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مشہور امریکی سرمایہ دار، راک فیلر نے دس ملین ڈالر کی پیش کش کر دی تھی تاکہ آثارِ فراعنہ کا ایک مستقل میوزیم قائم کیا جائے اور اس کے ساتھ ایک انسٹی ٹیوٹ جاری کر کے اس فن کے ماہرین تیار کیے جائیں۔ اور اب امریکہ کی حالیہ اثری دلچسپیوں کو دیکھ کر بھی ہماری نظروں کے سامنے تاریخ فلسطین کا وہ تاریک باب آجاتا ہے، جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد وہاں برطانوی استعماریت نے اپنا انتداب قائم کیا تھا۔ اور اس وقت سے بین الاقوامی ادارے: لیگ آف نیشنز نے ایک چارٹر شائع کر کے اس انتداب پر مہرِ تصدیق ثبت کی تھی۔ اس وقت بھی آثارِ قدیمہ سے مغرب کی شیفتگی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس چارٹر کے اندر باضابطہ ایک دفعہ (۲۱) رکھی گئی جس میں یہ قانونی فیصلہ ثبت کیا گیا کہ "حکومتِ انتداب یومِ انتداب سے ایک سال کے اندر اندر فلسطین کے آثارِ قدیمہ اور وہاں کی رسوم و عادات سے متعلق ایک مستقل قانون وضع کرنے اور نافذ کرنے کی پابند ہو گی۔"

Marfat.com

مذہبی تعلیم سے بغض

حقیقت یہ ہے کہ شریعتِ اسلامی کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کو دین کے صحیح تصوّر سے بے بہرہ کرنے میں آج تک امریکی سیاستدانوں نے جتنی کاوشیں کی ہیں، وہ اگرچہ اپنی ظاہری وضع کے لحاظ سے مختلف لباسوں میں ملبوس نظر آتی ہیں، مگر وہ دراصل مشرق کو مغرب پسند (Westernize) بنانے کے لیے مغرب کی امپیریلیسٹ طاقتوں کی مساعی کے طویل سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ مغرب کی اس دیرینہ سوچی سمجھی اسکیم کے نقوش ہم خود ایک ذمہ دار انگریز سیاس لارڈ لائڈ، سابق برٹش ہائی کمشنر برائے مصر کی زبان سے آپ کے سامنے رکھتے ہیں۔ لارڈ لائڈ اپنی کتاب (Egypt Since Cromer) (مطبوعہ ۱۹۳۳ء) کے صفحہ ۱۵۸، ۱۵۹ میں رقمطراز ہیں:

"انگریز نے جب سرزمینِ مصر پر اپنا قدم رکھا ہے اُس وقت سے لے کر آج تک ملک کی تعلیم و ثقافت پر مصر کی کٹر مذہبی یونیورسٹی ——— الازہر ——— کا قبضہ ہے۔ اس یونیورسٹی کا خشک اور قدامت پرستانہ طریقۂ تعلیم ہر نوع کی تعلیمی اصلاح میں سدِّ راہ ہے۔ اس سے سند فراغت حاصل کر کے نکلنے والے طلباء اپنے اندر مذہبی تعصّب اور غرور کی بھاری مقدار ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ ان میں فکری اور نظری رواداری سرے سے مفقود ہوتی ہے۔

Marfat.com

اگر یونیورسٹی کے اندر کوئی انقلابی تحریک اٹھا کر اس میں تبدیلی کر دی جاتی تو یہ صورت بڑی سود مند اور عظیم اہمیت کی حامل ہوتی۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ جب تک ازہر اپنے قدیم طریقۂ تعلیم کو سینے سے لگائے ہوئے ہے، مصر میں کسی قسم کی ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر (داخلی انقلاب) کی کوئی امید شرمندۂ تکمیل نظر نہ آتی ہو، تو پھر تمام امیدیں سیکولر تعلیم میں، جس کا اس وقت ازہر کی تعلیم سے مقابلہ ہے، اصلاحات پر مرکوز کر دی جائیں اور اسے ملک میں قدم جمانے اور نفوذ عام حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کے بعد ازہر کے سامنے دو ہی راستے رہ جائیں گے۔ یا وہ اپنے آپ کو بدلنے پر مجبور ہو گا اور یا ہمیشہ کے لیے قبر کی آغوش میں چلا جائے گا۔

استعمار کی کامیابی

نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے مستعمرین کی ریشہ دوانیاں اور اسلام کش تحریکیں روبکار ہیں۔ اور کسی حد تک اپنا رنگ بھی لا چکی ہیں۔ آج ہمارے اندر انہیں کوششوں کے نتیجے میں مغرب پسند مسلمان علماء کا ایک اچھا خاصا گروہ پیدا ہو چکا ہے۔ اور ۱۹۵۳ء کے امریکی کلوکیم میں ہم اس گروہ کے بعض افراد کو مسیحی مستشرقین اور مغربی مفکرین کے قدموں سے قدم ملاتا ہوا دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم پاکستان کے ڈاکٹر

Marfat.com

فضل الرحمان کو پیش کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے کلوکیم میں جا کر یہ انکشاف کیا کہ اسلام کی دو قسمیں ہیں: کلاسیکل اسلام اور ماڈرن اسلام۔ اور پھر ماڈرن اسلام کی ایک شاخ ہندوستانی اسلام بیان کی ہے۔ اور اس کا مجدد علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خان کو قرار دیا ہے۔ اور یہ اعتراف کیا ہے کہ اس یونیورسٹی کی تاسیس مغربی افکار کے زیرِ اثر ماڈرن اسلام کی اشاعت و ترویج کے لیے کی گئی تھی۔ اسی لیے شروع میں یہ یونیورسٹی "اینگلو محمڈن کالج" کے نام سے موسوم تھی۔ فضل الرحمان صاحب نے یہ مشورہ بھی دیا کہ چونکہ "عقل انسانی کو کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے، انسان کی معرفت و تحقیق کے زاویے متواتر پھیلتے رہتے ہیں، اس لیے لازم ہو جاتا ہے، کہ کائنات کے بارے میں انسانی نظریات کی ہر تبدیلی سے عقاید کی بنیادی حقیقتوں کی تشکیلِ نو اور ان پر نظر ثانی ہوتی رہے[1]۔"

ہندوستان کے سابق سفیر برائے مصر مسٹر آصف علی فیضی بھی اسی صف میں شامل ہیں، جس میں ڈاکٹر فضل الرحمان، منیر القاضی اور بیگم احمد حسین ہیں۔ ان کے افکار و نظریات کا رُخ دیکھنے کے لیے یہ جان

---

[1] ملاحظہ ہو "الثقافۃ الاسلامیہ" (مقالہ: جدید اسلامی فلسفہ) ص ۹۱۔ تبصرہ نگار نے ڈاکٹر فضل الرحمان کے مقالہ پر تنقید کے سلسلہ میں بہت اختصار اور نرمی سے کام لیا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کا مقالہ انتہائی گمراہ کن ہے۔
(مرتب)

Marfat.com

لینا کافی ہے کہ وہ اپنے طویل مقالہ ـــــ "ہندوستان میں اسلامی قانون اور دینیات کی تشکیلِ نو" کی بسم اللہ کے بعد ہی یہ مطالبہ اٹھا دیتے ہیں کہ یہ خیال کہ صرف خدا ہی ماخذ قانون اور ماخذ دین ہے، بحث طلب موضوع ہے۔ اور اس موضوع پر تنقید کا آغاز کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پہلے اس مذہبی تصور کا جائزہ لے لیا جائے۔ جو صرف خدا کو قانون سازی کا حق دیتا ہے۔ طریقۂ تنقید کے سلسلے میں تجویز کیا ہے کہ یہ تنقید جدید اصولوں کے ماتحت ہونی چاہیے۔ آگے چل کر ایک مقام پر یہ نکتہ طرازی بھی کی ہے کہ شریعتِ اسلامی کے شخصی قوانین بالتدریج دو انجاموں میں سے ایک انجام سے دوچار ہوں گے: یا تو اُن کا وجود سرے سے ناپید ہو جائے گا اور یا انہیں، مروجہ مغربی طرزِ تدوین کے سامنے سرنگوں ہو جانا پڑے گا، اور ایسی شکل اختیار کرنا پڑے گی کہ مذہبی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر عام ملکی قوانین میں تحلیل ہونا ہو گا۔ میرے نزدیک، احکامِ شرعیہ میں اس تدریجی تبدیلی سے عقیدۂ اسلام کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس "مجتہدانہ" محاکمے کے بعد فرماتے ہیں کہ "اس معاملے میں جتنا غور و خوض کیا جائے گا۔ اور جس قدر اس کا بتعمق نگاہ مطالعہ کیا جائے گا، نتیجہ یہی نکلے گا کہ "اسلام کے اساسی تصور" پر کچھ خارجی پردے پڑے ہوئے ہیں۔" اساسی تصور کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس پر قائم رہنا تبھی ممکن ہے کہ ہر دور میں اور تمدن کے ہر مرحلے میں اس تصور کے مقتضیات اور اس کی تعبیرات پر نظرِ ثانی ہوتی رہے۔ نیز فرماتے ہیں

Marfat.com

کہ "علماء کا تقلیدی مذہب دورِ حاضر کے افکار و رجحانات کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہے" البتہ اپنے بارے میں تنگ ظرفی اور عدم رواداری کا شبہ زائل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسلامی مذہب (جو تقلیدی مذہب سے مختلف ہے) کی اصلاحِ جدید کے لیے فلسفہ اور علم النفس کی تحقیقات جدیدہ سے اور یورپ کے نظریات سے اور پروٹسٹنٹی اور یہودی طرزِ فکر سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

غرضیکہ شرکائے مؤتمر میں سے کوئی صاحب ایسے نہیں ملتے جنہوں نے اس میدان (یعنی ترمیم شریعت) میں اپنا تیر نہ چلایا ہو۔ پیچھے آپ دیکھ چکے کہ لا کالج بغداد کے پرنسپل منیر القاضی اس حد تک بے باک ہو گئے کہ "یحرفون الکلم عن مواضعہ" کے مصداق جا ٹھہرے۔ بیروت کے ڈاکٹر صبحی محمصانی کی بحث کا خلاصہ بھی یہ ہے کہ شریعت کو ترقی پسند بنایا جائے اور دورِ جدید کے قافلۂ تمدن کی ہمرکابی سے محروم نہ رہا جائے اور دین کو دنیا کے بکھیڑوں سے خلط ملط کرنے سے احتراز کیا جائے۔ ڈاکٹر محمصانی ان افکار کو بڑے ایچ پیچ کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ کبھی حدیث کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی اسلام کے فقہی سرمائے پر سرکہ چھیں ہوتے ہیں۔ کبھی قدامت پسندوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان پر بیوقوفی اور جہالت کی پھبتی کستے ہیں اور انہیں "انسانی مساوات اور عالمگیر وحدت" کے راستے کا روڑا قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر بنیہ فارس حاضرین سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اسلامیات کا مطالعہ و تحقیق مستشرقین

Marfat.com

کے طرز پر کریں کیونکہ یہ عقلی طریقۂ تحقیق (Scientific Method)
ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح اسلام کے "اصل حقائق" میں
اور "خرافیات" میں تمیز کرنا آسان ہوگا۔ انڈونیشیا کی وزارت امور مذہبی
کے جنرل سیکرٹری محمد کفراوی اپنے ملک کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہوئے
فرماتے ہیں کہ انڈونیشیا میں وزارت امور مذہبی کے اجراء کا مقصد دو متضاد
نظاموں ——— اسلامی نظام اور سیکولر نظام ——— کے درمیان مصالحت
(Compromise) کو ترقی دینا ہے۔ چنانچہ انڈونیشی گورنمنٹ جس
طرح مسلمانوں کی مساجد کی امداد و اعانت کرتی ہے، اسی طرح بتقاضائے
مساواتِ ادیان عیسائیوں کے گرجوں کی اعانت بھی کرتی ہے، اور
عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کی، خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، حوصلہ افزائی
کرتی ہے۔

یہ ہیں وہ "اسلامی مباحث و مقالات" جن پر یہ کتاب مشتمل ہے۔
اس کتاب میں سے جو چند مثالیں ہم نے قارئین کرام کے سامنے رکھی
ہیں، کیا ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ فی الواقع یہ کتاب
اپنے ٹائٹل کی پیشانی پر لکھے ہوئے اعلان کے مطابق "اسلامی مباحث و
مقالات کا مجموعہ" ہے؟ ع

بر عکس نہند نامِ زنگی کافور

(چراغِ راہ، جنوری ۵۸ء)

Marfat.com

Marfat.com

پروفیسر احمد راتب النّفاخ :

دمشق (شام) کے نوجوان محقّق و مجاہد ہیں۔ آرٹس کالج، (شام یونیورسٹی) کے گریجویٹ اور قاہرہ یونیورسٹی (مصر) کے ایم، اے (عربی ادبیات) ہیں۔ آج کل آرٹس کالج میں ڈین ہیں۔ اسلامی علوم کے اچھے عالم ہیں۔ احیائے دین کا گہرا ولولہ رکھتے ہیں۔ عرب علماء کی تجدّد پسندی اور ملاہنت آمیز روش پر سخت برہم ہیں۔ اخوان المسلمون کے ان لوگوں سے بھی خفا ہیں جو وقتی مصلحت کی رعایت کر جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اخوان کے حلقے ان کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ ان کے خلوص اور للّٰہیت پر پورا ملک متفق ہے۔

شام میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات کی نشر و اشاعت کا آغاز انہوں نے ہی کیا ہے۔ آج سے ۶ سال قبل اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اور آج تک سرانجام دے رہے ہیں۔ ۲۰ سے زائد کتب خود شایع کر چکے یا دوسرے اداروں سے

Marfat.com

شائع کروا چکے ہیں۔ پبلشنگ ان کا پیشہ نہیں، محض اقامتِ دین کی تڑپ ہے کہ دوسرے علمی مشاغل کے ساتھ یہ خدمت بھی اپنے ذمہ لی اور اسے خوب نبھایا۔

شُستہ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ عہدِ اموی اور عہدِ عبّاسی کے پاکیزہ خیال اسلامی شاعر ابنِ دُمَینَۃ (۱۴۰ھ) پر ٹھوس تحقیقی کام کر چکے ہیں اور اس کے دیوان کو پہلی مرتبہ (۱۹۵۸ء) متعدد قلمی نسخوں سے موازنہ کر چکے شائع کر چکے ہیں۔

Marfat.com

مغربی مفکّرین کی اسلام سے بے خبری

تاریخی چھان بین، اثریاتی اکتشافات اور اسلامی تحقیقات کے پردے میں مستشرقین کا گروہ اسلامی حقائق اور اسلام کے تہذیبی محاسن کو مسخ کرنے کی جو کوششیں کر رہا ہے عوام ان سے ناآشنا ہیں۔ اور جب سے عالم اسلامی سے استعماری تسلط کی بساط لپیٹی ہے اس گروہ کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے اِس گروہ میں مسلمانوں کا ایک عنصر بھی شامل ہے جو دانستہ و نادانستہ مغربی مفکّرین کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔ اور جو بات مغربی مفکّرین زیرِ لب کہتے ہیں اُسے یہ ببانگِ دہل کہنے کی خدمات سرانجام دیتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں فاضل مضمون نگار نے اگرچہ مستشرقین کے "علمی کارناموں" کا نہایت مختصر جائزہ لیا ہے لیکن اس جائزہ سے ان کی پوری جماعت کے عزائم اور منصوبوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صلیبی صلیبی جنگوں اور استعماری خونخواریوں نے عالمِ اسلامی کو دوبارہ اپنی

Marfat.com

آتشِ جوعُ الارض کا ایندھن بنانے کے لیے اب نئی ٹکنیک یہ اختیار کی ہے کہ کھلم کھلا گندم پیکار ہونے کے بجائے علمی راستہ اختیار کیا ہے۔ اور تحریکِ استشراق کے ذریعہ سے اس مہم کو سر کرنے کی ٹھانی ہے۔ مگر ہم مغربی اقوام کی غلط فہمی دُور کرتے ہوئے گزارش کریں گے کہ:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

(مرتب)

سب سے پہلے ہم ان مسلمان محققین کے رشحاتِ فکر و تحقیق کا جائزہ لیتے ہیں جو مغربی مستشرقین کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر چکے ہیں اور بحث و استدلال میں انہی کی قائم کردہ لکیر کے فقیر ہیں اور پایانِ کار اپنے استادوں کی متابعت میں انہی مغالطوں اور فکری گمراہیوں کا شکار ہوئے ہیں جنہیں اسلام کے اصول و مبادی کی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

ایسے مسلمان "مجتہدین" کی اگرچہ ہمارے سامنے طویل فہرست ہے لیکن وقت اور فرصت کی کمی کے باعث ہم اس پوری فہرست کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ اور یہاں صرف ان شخصیات کے خیالات و افکار کا جائزہ لیتے ہیں جن کو بدقسمتی سے ہمارے بعض اہلِ علم بھی بڑا بے ضرر اور مخلص تصور کرتے ہیں۔

Marfat.com

ایک مسلمان مستشرق

اس نوع کے مستشرقین میں سے ایک حیدر بامات افغانستانی ہیں۔ان کی کتاب (Visages dil Islam) جو فرانسیسی زبان میں انہوں نے تالیف کی ہے اور "محاسن الاسلام" کے نام سے اس کا عربی ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ حیدر بامات فرانس میں افغانستان کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مصنف موصوف نے بحث و تحقیق کی دُنیا میں کسی اچھوتی چیز کا اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنے افرنگی اساتذہ کے افکار کو اور ان کی مختلف، تالیفات کو خلاصے کی شکل میں جمع کر دیا ہے۔ کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھ جائیے۔ کہیں یہ نظر نہیں آئے گا کہ مصنف نے اسلامی موضوعات پر بحث کرتے ہوئے کسی مقام پر اسلام کے اصل ماخذ سے استناد کیا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے اپنی حمایت و تائید میں جو ماخذ سامنے رکھے ہیں اور انہیں اپنی تحقیقات کا محور بنایا ہے، وہ تقریباً تمام مغربی مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ مصنف نے کتاب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں اسلام کے اصول و مبادی پر بحث کی ہے اور دوسرے حصّے میں اسلامی تہذیب کے ان آثار و فضائل کو گنوایا ہے جو علم و فلسفہ اور ادب و فن کے میدانوں میں اس نے چھوڑے ہیں۔ بحث کے ان دونوں حصّوں میں مصنف نے جو جو ٹھوکریں کھائی ہیں اور جن جن توہمات میں الجھا ہے ان سب

Marfat.com

کو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

سیاسی مقصد

کتاب کے مقدمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنّف اس کتاب کی تالیف میں دراصل ایک سیاسی مقصد پیشِ نظر رکھتا ہے اور وہ مقصد اسے اتنا عزیز ہے کہ وسائل و ذرائع کے فقدان کے باوجود اس کے حصول کے لیے آتش زیرپا ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ عالمِ اسلامی اور دنیائے مغرب کے مابین مفاہمت کی فضا پیدا کی جائے۔ چنانچہ مقدمے (ص: ۱۱) میں اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھتا ہے: "مؤلف کا یہ اقدام، وسائل کی کمی کے باوجود، محض اس مقصد کی خاطر ہے کہ مشرقِ اسلامی اور مغربی ممالک کے مابین مفاہمت کی قوسین کو زیادہ سے زیادہ نقطۂ اتصال کی طرف لایا جائے۔ پس مؤلف کے نزدیک اس مقصد کی تکمیل کے لیے مؤثر ترین وسیلہ یہی ہو سکتا ہے کہ دونوں فریقوں کے احساسات میں اور طرزِ فکر میں جو مشترک عناصر پائے جاتے ہیں ان کو ابھارا جائے۔ بدقسمتی سے آج تک ان دونوں فریقوں کو بڑی بے انصافی کے ساتھ دو متحارض کیمپوں کی شکل میں پیش کیا جاتا رہا ہے اور پھر اس تعارض کو لاینحل اور لاعلاج قرار دے کر افتراق کی خلیج کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ اسلامی تصوّرات کا مطالعہ صریح طور پر یہ شہادت پیش کرتا ہے کہ دونوں کیمپوں کی تہذیبی عمارت جن اخلاقی اصولوں پر استوار ہے اگر ان میں اتحادِ کامل نہ بھی تسلیم کیا جائے

Marfat.com

تو کم از کم یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ ان اخلاقی اصولوں کی غالب اکثریت ضرور مماثلت رکھتی ہے۔ آج اگر اسلام اور مغرب کے انہی متفقہ اور مشترکہ اصولوں کو زندہ کیا جائے تو کیا یہ اس امر کے لیے کافی نہ ہوگا کہ اسلام اور مغرب کے درد مند لوگ اپنے مشترک روحانی خزانے کی حفاظت اور مدافعت کے لیے اپنی جدوجہد کو ایک پلیٹ فارم پر مرکوز کر دیں جب کہ انہیں معلوم ہے کہ اس روحانی خزانے کا مستقبل رُو بہ ترقی مادیّت کے ہاتھوں ہولناک خطرے کی زد میں ہے؟"
اس اقتباس کی روشنی میں مؤلف کے سیاسی مقاصد کے خدوخال معلوم کرنے میں کسی غیر معمولی فہم کی ضرورت نہیں ہے۔ مؤلف کی "دعوتِ مفاہمت" اور مغربی مستشرقین اور مبشرین کی "صدائے دوستی" درحقیقت ایک ہی طنبورے کے راگ ہیں، جس کا مضراب استعمار پسندوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ عالمِ اسلامی میں اپنی خواہشات کو شرمندۂ تکمیل کرنے کی خاطر مختلف تقریبوں سے اس نوعیت کے مسحور کن راگ فضا میں بکھیرتے رہتے ہیں۔ مؤلف نے جو مقصد دیباچے میں بیان کیا ہے، یہ صرف ان کے دل کی آواز نہیں ہے بلکہ بالفعل امریکہ میں متعدد ایسی انجمنیں وجود میں آچکی ہیں جو "دوستی اور تعاون" کے جذبات سے سرشار ہو کر مشرقی ممالک میں "اہلِ دل عنقا" کی جستجو میں ہیں۔ اسی طرح کی ایک جمعیت چند سال ہوئے لبنان میں بھی اپنی ایک کانفرنس منعقد کر چکی ہے۔ اس کانفرنس میں امریکی نمائندوں

Marfat.com

نے "اسلام اور مسیحیت کے باہمی تعاون اور الحاد و مادیت کے امڈتے ہوئے سیلاب کی روک تھام" پر بڑی شدید ضرورت کا اظہار کیا تھا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اگر استشراقی تحریک دجل و تلبیس کے یہ ہتھکنڈے متواتر استعمال میں لاتی رہی اور مسلمانوں کے ایک گروہ کی جانب سے بھی اس کی صدائے بازگشت اٹھتی رہی، تو وہ دن دور نہیں جب مغرب کی استعماری حکومتیں اپنے مقاصد میں ظفرمند ہو جائیں گی۔ اور یہی دوستی اور تعاون اور انسداد مادیت کی اپیلیں خود مسلمانوں کے وجود کے لیے "ہولناک خطرہ" ثابت ہوں گی۔ مستشرقین کی اکثریت چونکہ وزارتِ خارجہ کے محکموں سے وابستہ ہے اس لیے سیاسی طور پر بھی ان کو اپنے منصوبے روبعمل لانے میں خواطر خواہ سہولتیں فراہم ہیں۔ ہم اپنے قابلِ اعتماد ذرائع کی بناء پر ان لوگوں کی ان تمام سرگرمیوں سے بخوبی واقف ہیں جو ممالک عرب میں شبانہ روز جاری رکھے ہوئے ہے۔

اب ہم افغانستان کے اسکالر حیدر یامات صاحب کے خیالات کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جن سے آپ، ان کے سیاسی مقاصد کے ساتھ، ان کے اسلامی نظریات سے بھی روشناس ہو سکیں گے:

دینِ محمدی عیسائیت کا چربہ ہے

مصنف کتاب کے صفحہ ۲۱، ۲۲ پر "مذہب اسلام پر ایک نظر" کے عنوان کے تحت رقمطراز ہے: "یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بعض

Marfat.com

معروف مصنّفین اور ممتاز مستشرقین نے اسلام کے محاسن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کی یہ کوشش خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ابھی تک عام قارئین اس سے بے خبر ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین زیادہ تر عیسائی اصولوں کا چربہ تھا۔"

قرآن، رسولؐ کا کلام ہے

صفحہ ۲۳ پر ارشاد ہوتا ہے: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اللہ کے کلام کی تبلیغ کے علاوہ کوئی اور منصب بھی سامنے رکھتے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قول ہے: ما کنت بدعا من الرسل وما ادری ما یفعل بی ولا بکم ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ۔ وما انا الا نذیر مبین (میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور تمہارے ساتھ کیا۔ میں تو بس اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اور میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک صاف صاف متنبہ کرنے والا)۔ ہم نے مصنّف کے الفاظ کو بجنسہٖ نقل کر دیا ہے مصنف کی بے خبری ملاحظہ کیجئے کہ قرآن کی آیات (۴۶: ۹) کو رسول کا کلام بتا رہا ہے۔

صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں: "انبیاء بنی اسرائیل اپنی اُمتوں کے کاندھوں کو معجزات کے بوجھ سے دُہرا کرتے رہے ہیں، مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی معجزہ طرازی کی جانب مائل نہیں ہوئے، قرآن ان کا واحد معجزہ تھا۔"

Marfat.com

(گویا مصنف کے نزدیک، معجزات ایک قسم کی صنعت کاری ہے جو نعوذ باللہ سابق انبیاءؑ تو اختیار کرتے رہے مگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اس سے محترز رہے)۔

اسی صفحہ پر مزید ارشاد ہوتا ہے: "معترضین قرآن کی اس صفت پر انگشت نمائی کرتے ہیں کہ وہ حالات کے رُخ کے ساتھ اپنا رُخ تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اُن کی نگاہ میں قرآن کا وقت کے تقاضوں کے مطابق چلنا اور ضروریاتِ زمانہ کو پورا کرنا عیب کی بات ہے۔ چنانچہ اس کتاب مقدس کے اندر جو بے ترتیبی، تکرار اور تضاد پایا جاتا ہے، یہ لوگ اس پر بڑی تند و تیز تنقیدیں کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ تسلیم کرنا عین قرینِ انصاف سمجھتے ہیں کہ قرآن سے پہلی کتابوں پر بھی ایسی ہی تنقیدیں کی گئی ہیں۔" (مصنف کا مدعا یہ ہے کہ تضاد و تکرار صرف قرآن ہی میں نہیں ہے بلکہ سابقہ کتب آسمانی بھی انہی اوصاف سے متصف ہیں۔)

حجرِ اسود کی مشرکانہ پرستش

اسلام کے بارے میں مصنف کے ایسے ہی طرفہ انکشافات سے پوری کتاب لبریز ہے۔ چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں: "مکہ کا حج عربوں کی بت پرستی کی باقیات میں سے ہے، کیوں کہ حج، جس میں حجرِ اسود کی مشرکانہ پرستش بھی شامل ہے، قبل از اسلام بھی جزیرۂ عرب میں رائج تھا۔ ہر سال لوگ اطرافِ ملک سے اس کی خاطر مکہ کا سفر کرتے تھے۔ یہ خیال غلط ہے کہ حج مکہ کے مقدس شہر کے اقتصادی اور تجارتی مفادات

Marfat.com

کا ضامن تھا۔" (صفحہ ۲۶)

مذہب زردشت بھی حق ہے

"قرآن میں انسان کے اندر خیر و شر کی کش مکش کے بارے میں جو تذکرہ ملتا ہے اسے پڑھ کر انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ زردشت کے مذہب پر غور و فکر کرے اور خدائے شر (اہرمن) اور خدائے خیر (یزداں) کے نظریے کو تسلیم کرے۔" (صفحہ ۲۷)

دوسرے مذاہب سے مشابہت

"یہ اعتقاد کہ مذہب کے لیے وحی کی ضرورت ہوتی ہے، جو ایک مقدس کتاب کی صورت میں ظہور پذیر ہو، مزدکیت، یہودیت اور اسلام کے مشترک عقائد میں سے ہے۔" (صفحہ ۲۷)

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار تصریح کی ہے کہ وہ کسی نئے دین کا پرچار کرنے کے لیے نہیں آئے بلکہ وہ صرف ابراہیمؑ، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کے دین کی اصلاح کے لیے آئے ہیں۔ اور اس کی عربی زبان میں نشر و اشاعت کرنا چاہتے ہیں۔" مؤلف نے اس کی تائید میں قرآن کی متعدد آیات سے استشہاد بھی کیا ہے اور ان آیات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بتایا ہے۔ مصنف کی مذہبی معلومات سے بیگانگی کا یہ عالم نہایت درجہ افسوس ناک ہے کہ قرآن اور احادیث میں بھی فرق نہیں کر سکتا۔

"اسلام بعض باتوں میں یہودیت کا ممنون ہے۔ مثلاً انسانی صحت

Marfat.com

کے پاکیزہ اصول، ختنہ اور لحمِ خنزیر سے اجتناب وغیرہ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان باتوں پر شراب اور جوئے کی حرمت کا اضافہ کر دیا ہے۔ اسی طرح اسلام نصرانیت سے بھی قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ یہ مشابہت اسلام اور نصرانیت کے بعض عقاید اور مذہبی اخلاق میں بالکل عیاں ہے۔"

"اسلام میں بلّی کے ساتھ نہایت ہمدردانہ اور مشفقانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں ایک حدیث سے ملتا ہے۔ کہ ایک بار بلّی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چادر کے دامن پر سو گئی تو آپؐ نے اس کو اٹھانے اور پریشان کرنے کے بجائے چادر کا اتنا حصّہ کاٹ دینے کو ترجیح دی۔ کیا یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ یہ حدیث سینٹ فرنسوا اسیزی کی سیرت سے ماخوذ ہے؟"

مغربی مفکّرین کی تقلید کا نتیجہ

یہ چند اقتباسات اور اشارات جو کتاب کے صرف ایک باب سے لیے گئے ہیں پوری کتاب کے رنگ ڈھنگ سے آگاہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ خیالات مغربی مستشرقین کے اسلوبِ تحقیق کی تقلید کرنے والوں کی ذہنی و فکری عبودیت کی نہایت شرمناک مثال مہیّا کرتے ہیں۔ مغربی مفکّرین کا منصوبہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے گھڑے کی مچھلی بنانے کے لیے اُن کے اندر فکری بے راہ روی پیدا کر دیں۔ اس کام کے لیے وہ اسلامی حقائق و مسلّمات پر تحقیق کے بہانے سے حملے کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان مستشرقین ان کے اس منصوبے سے نابلد ہونے

Marfat.com

کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ان کے حملوں کی تائید کرتے ہیں بلکہ شاگردی کا حق ادا کرنے کے لیے خود آگے بڑھ کر اسی قسم کے حملے شروع کر دیتے ہیں۔ حیدر ہامات صاحب بھی بدقسمتی سے ایسے ہی وفادار شاگردوں کی صف میں شامل ہیں۔

حیدر ہامات کی کج فکری اور مغالطہ انگیزی کی مذکورہ بالا مثالیں کسی تشریح کی محتاج نہیں ہیں۔ ان مثالوں کو دیکھ کر کوئی شخص ان کے علمی افلاس اور جہالت میں شک نہیں کرے گا۔ لیکن کس قدر مقام تأسف ہے کہ جہاں ایک عامی شخص ان کی جہالت اور اسلام سے ناواقفیت کا صاف اندازہ کر لیتا ہے، وہاں ہمارے بعض فضلا کے دماغ میں یہ موٹی موٹی باتیں نہیں آ سکیں۔ چنانچہ آپ سن کر تعجب کریں گے کہ شام یونیورسٹی کے شریعت کالج کی طرف سے حیدر ہامات صاحب کو باقاعدہ دعوت دی گئی کہ وہ کالج میں اسلام اور تاریخ اسلامی کے موضوع پر طلباء کو لیکچر دیں۔ اور اس دعوت کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ایک جاہل مطلق اپنے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اہلِ مغرب کے افکار و نظریات کو سب سے بہتر سمجھتا ہے اور ان کی اسلامی تحقیقات کا گہرا مطالعہ رکھتا ہے۔ مگر اس دعویٰ کو پرکھنے کے بجائے اس پر فوراً ایمان لے آیا جاتا ہے ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیے

شریعت کالج بھی محفوظ نہیں

اس مثال سے زیادہ واضح ایک اور مثال ہمیں ملتی ہے جس سے

Marfat.com

مستشرقین کے فکری حملوں کی کامرانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ آج سے تین سال قبل جب شریعت کالج (شام یونیورسٹی) کی داغ بیل ڈالی گئی تو اس کے ارباب حل وعقد نے تاریخ اسلامی کی تدریس کے لیے جس شخص کے نام قرعہ نکالا وہ اسی زمرے کا ایک ممتاز فرد ہے جو ذہنی طور پر مغرب سے شکست کھا چکا ہے۔ آج کل یہ صاحب ترقی کر کے نائب پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ تاریخ اسلامی کی تدریس کے سلسلے میں انہوں نے جو کارِ نمایاں سرانجام دیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک جرمن مستشرق کی کتاب "سقوط دولتِ عربیہ" کا ترجمہ کر کے طلباء کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ کتاب ان کی نگاہ میں "بڑی اہمیت رکھتی ہے" اور آج کل اسلامی تاریخ کے طلباء اسی کے جھروکوں سے اپنے ماضی کے نشیب و فراز کا مشاہدہ کر رہے ہیں ؎

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

تحقیقات کے نام پر فریب

مقدمہ کتاب میں جرمن مستشرق نے بڑی بسط و تفصیل سے تاریخ الطبری پر تبصرہ کیا ہے۔ اور بڑے نیازمندانہ انداز میں مورخ الطبری کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اس نے ابو مخنف کی روایات، اور بیانات کو اور قدیم نثری ادب کو اپنی کتاب میں محفوظ کر کے ہم تک پہنچایا ہے۔ مؤلف نے ابن الکلبی کو بھی جس کے واسطے سے مورخ الطبری نے ابو مخنف کی روایات لی ہیں۔ بڑا مخلصانہ ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔ بالعموم تاریخ

Marfat.com

کی جمع و ترتیب کا سائنٹیفک اسلوب یہ ہوتا ہے کہ مؤرخ تمام تاریخی دستاویزات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی صحت و صداقت کی مقدار معلوم کر کے روایت پر رد و قبول کا حکم لگاتا ہے۔ لیکن "سقوط دولت عربیہ" کا جرمن محقق اپنے علمی زعم کے باوجود ان تمام مراحل سے آنکھیں بند کر کے گزر جاتا ہے۔ ورنہ اگر مؤلف نے ان وادیوں میں قدم رکھا ہوتا تو وہ کبھی ابو مخنف پر مدح و ستایش کے دونگڑے نہ برساتا۔ اور یہی چیز اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ حضرت مؤلف تاریخِ اسلام اور تحقیقِ روایات کے طریقوں سے کلیتہً نابلد ہے۔ ابو مخنف اور اس کے راوی ابن الکلبی اسلامی تاریخ میں بہت بڑے دروغ گو شمار کیے گئے ہیں۔ کتبِ رجال میں ابو مخنف کو کذاب و دجّال اور وضّاع کہا گیا ہے۔ ابن الکلبی کے بارے میں بھی علمائے رجال کی قریب قریب یہی رائے ہے۔ (تفصیل کے لیے ابن حجر کی لسان المیزان ملاحظہ کی جا سکتی ہے) ۔ علاوہ ازیں ابو مخنف غالی روافض کا سرغنہ تھا۔ اس کی تمام روایات اس کی بدعات و اختراعات کے گرد گھومتی ہیں۔ اہلِ تحقیق کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ دروغ گو اور مبتدع راوی کے بیانات کو قبول کرنے سے محترز رہیں۔ اور اگر اس کی روایات کو لینا ناگزیر ہے تو تحقیق کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھ لیں اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ لیکن مصنّف نے ان تمام فرائض کو اُٹھا کر دیوار پر دے مارا ہے اور شرح صدر کے ساتھ ابو مخنف کی روایات کو کتاب کی زینت بنایا ہے۔ آخر مصنف کو تحقیق و تنقید کا دردِ سر مول لینے کی کیا

Marfat.com

ضرورت تھی جب کہ ابو مخنف کی روایات اس کی خواہشات کے عین مطابق پڑتی ہیں۔ اور تاریخ اسلام کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کے اندر افکارِ باطلہ کی اشاعت کرنے کے لیے اس کے میدانِ کار کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے میں ممد ہیں۔ پوری کتاب رطب و یابس کا پلندہ ہے۔ اگر تنگیٔ وقت دامن گیر نہ ہوتی تو ہم پوری کتاب میں سے فاسد مواد آپ کے سامنے رکھتے۔ بایں ہمہ یہ دیکھ کر ہمارا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ شریعت کالج کے نائب پرنسپل اس کتاب کا ترجمہ کرتے ہیں۔ طلباء کو اس کا درس دیتے ہیں لیکن انہیں یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کتاب کی خرافات و اباطیل کی حواشی کے ذریعے سے نشان دہی کرتے جائیں۔ جس جگہ مترجم نے ایسی کوشش کی ہے وہ بھی اس قدر کمزور ہے کہ اس سے نہ احقاقِ حق ہوا ہے اور نہ ابطالِ باطل۔

حدیث کی تحریف

تحریک استشراق کا سب سے زیادہ ضرر رساں اور جگر دوز پہلو یہ ہے کہ مستشرقین اپنی کتابوں میں بے محابا قرآن و سنت کی نصوص سے کھیلتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں جہاں جہاں آیات و احادیث وارد ہیں، انھیں یا تو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ یا ان کی صریح تحریف کی گئی ہے۔ اور پھر ان پر بڑے بڑے اہم مسائل اور آراء کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور اکثر یہ کرتے ہیں کہ نص کا جو عام اور متبادر مفہوم ہوتا ہے، بالکل اس کے برعکس مفہوم نکالتے ہیں۔ فنِ تزویر و تحریف کا سب سے

Marfat.com

بڑا ماہر بلجیئم کا مستشرق، لبشپ لیمنس ( ) تھا۔ عرب جاہلیت اور دورِ اُموی ..... کے بارے میں اس کے متعدد مقالات شائع ہوئے ہیں۔ اس کی تین کتابیں: "(۱) اسلام"۔ (۲) "قبل از ہجرت جزیرۂ عرب کے حالات۔" (۳) "خلافتِ یزید" استشراقی لٹریچر میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مستشرق تاریخ اسلامی پہ گہری نظر رکھتا تھا۔ اور اسی لیے افترا پردازی، مغالطہ انگیزی اور دراندازی کے فن میں اسے یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اور اس میں اس نے اس قدر مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے کہ خود اس کے ہم مشرب مستشرقین نے اسے ناپسند کیا ہے۔ یہ معاملہ صرف لیمنس تک ہی کیا موقوف ہے۔ یہاں کا ہر مستشرق لیمنس کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ یہی حال جرمن کے شیخ المستشرقین بروکلمان (Brockelmann) کا ہے۔ جس کا پچھلے سال انتقال ہو چکا ہے۔ تاریخ اسلام پر اس کی کتاب "تاریخ الامم الاسلامیہ" کے نام سے، بیروت میں، عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں ایک مقام پر بروکلمان عربوں کے مزاج پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے: "اعرابیوں کے اندر خود غرضی اور ترجیح ذات کی صفت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ احادیثِ نبوی میں بھی اعرابیوں کی اس سرشت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور انھیں یہ کہنے کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی نمازوں میں بھی خود غرضانہ دعا مانگ سکتے ہیں۔ جیسے "اللھم ارحمنی و محمداً ولا ترحم معنا احداً۔ اے اللہ!

Marfat.com

صرف مجھ پر اور محمدؐ پر رحم کر اور ہمارے علاوہ کسی پر رحم نہ کر)۔ حدیث رسول میں تحریف اور کذب بیانی کا اس سے بڑا شاہکار آج تک مشاہدے میں نہیں آیا۔ بروکلمان کی اس دیدہ دلیری کی داد نہ دینا ان پر بڑا ظلم ہوگا کہ تمام کتب حدیث کی موجودگی میں انھوں نے علی الاعلان اس حدیث کے مدّعا کو مسخ کر ڈالا ہے اور بالکل واضح حدیث سے یہ عجیب و غریب مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ گویا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابیوں کی فطرت کے مطابق یہ دعا انہیں سکھائی ہے۔ حالانکہ پوری حدیث کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس میں کسی قسم کے الجھاؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں مذکورہ الفاظ اپنی دعا میں استعمال کیے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ٹوکا اور فرمایا "لقد تحجرت واسعًا" "تو نے وسیع چیز کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے"۔ اب اس ذہن کی داد دیجئے جس نے اولاً ایک فرد کے الفاظ سے نتیجہ اخذ کیا کہ تمام اعرابیوں کی فطرت خود غرضانہ ہوتی ہے۔ اور ثانیاً یہ کہ اسلام نے بھی ان کو خود غرضی پر قائم رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ اور سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ پہلو ہے کہ کتاب کے مترجمین : نبیہ امین فارس اور منیر بعلبکی کتاب کے حاشیے پر اس مقطوعہ اور مبتورہ حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ اسے بخاری نے باب الادب میں اور ابوداؤد نے باب الطہارۃ میں بیان کیا ہے۔ لیکن

Marfat.com

حدیث کے آخری الفاظ کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کی نکیر پر ارشاد فرمائے تھے بالکل حذف کر جاتے ہیں۔ اور اس طرح مصنف کے اخذ کردہ مدعا کو مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔

حدیث مذکور کا پس منظر

حدیث مذکور کے بارے میں بروکلمان کی یاوہ گوئی پر مصر کے مشہور اہل حدیث عالم احمد محمد شاکر نے مسند امام احمد کے نئے ایڈیشن میں اس حدیث پر نہایت فاضلانہ حاشیہ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "یہ حدیث اس اعرابی کے بدوی پن اور خشک مزاجی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ اعرابی دیہات سے آیا تھا۔ دیہاتی لوگوں میں جہالت کے ساتھ ساتھ اکھڑپن بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس اعرابی نے بھی وہی حرکت کی جو ایک نادان اور جاہل کرتا ہے۔ لیکن معلم خیر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صحیح تعلیم دی۔ جو شخص اس حدیث کو سنے گا خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، ذکی ہو یا غبی، عربی ہو یا عجمی، اسے اعرابی کی نادانی اور کج خلقی پر ذرہ بھر شک نہیں ہوگا۔ لیکن تعجب ہے کہ ایک بہت بڑا وسیع الاطلاع مستشرق، جس کے بارے میں ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے، کہ وہ اپنے ہم جنسوں کی طرح ہفوات اور دسیسہ کاریوں سے ملوث نہیں ہے، اپنی آخری تصنیف "تاریخ الامم الاسلامیۃ" کے جزو اول میں اس حدیث کو ہوائے نفس کا نشانہ بناتا ہے۔ اور اسے ماقبل اور مابعد سے کاٹ کر اس کی نادر المثال فلسفہ طرازی کرتا ہے۔ اس مستشرق کا یہ تجاہل عارفانہ اس

Marfat.com

امر کی غمازی کرتا ہے کہ صلیبی عصبیت اس کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

سخن فہمی عالمِ بالا

حدیث حبس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے یہ ایک انفرادی واقعہ تھا۔ جو ایک جاہل بدوی سے سرزد ہوا۔ لوگوں نے اس پر نکیر کی۔ معلم انسانیت نے اسے سمجھایا۔ اس سب کے باوجود بروکلمان کا اختراع پسند دماغ اس جزوی واقعہ سے اہلِ بادیہ کے کردار اور اخلاق کی ایک پوری تھیوری مرتب کر لیتا ہے۔ استنباط و استخراج کا یہ حیرت انگیز اسلوب دنیائے فقہ میں کبھی اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ نہ معلوم بروکلمان سے یہ کیوں چوک ہو گئی کہ اس نے جزوی واقعہ سے ایک اور قاعدہ کلیہ کیوں نہ مستنبط کر لیا۔ وہ یہ کہ اہلِ بادیہ کی یہ عادت بھی ہوتی ہے کہ وہ جب مساجد میں داخل ہوتے ہیں یا کسی مجمع میں جاتے ہیں تو فوراً وہاں پیشاب کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ اسی اعرابی نے مسجد نبویؐ میں لوگوں کی موجودگی میں پیشاب کر دیا تھا۔ اگر بروکلمان صاحب یہ نتیجہ بھی ساتھ ہی اخذ کر لیتے تو ہم انہیں دنیائے استشراق کا امام الفن ماننے کے ساتھ ساتھ علم منطق کا بھی ارسطوئے زمان تسلیم کر لیتے۔ ہم بروکلمان کی فلسفہ طرازی سے قطع نظر، صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ سے یہ مفہوم کیسے نکلتا ہے کہ "بعض احادیث (جن میں ایک زیر بحث حدیث بھی ہے) اعرابیوں کو (بہ تقاضائے فطرت) ایسی خود غرضانہ دعائیں مانگ

Marfat.com

لینے کی رخصت دیتی ہیں۔" کیا بروکلمان کی نظر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نہیں گزرے کہ: "لقد تجرت واسعًا"

بریں عقل و دانش بباید گریست

اپنوں سے شکوہ

بروکلمان سے زیادہ ہمیں اپنے دوست ڈاکٹر عمر فروخ (پروفیسر فلسفہ، المقاصد الاسلامیہ کالج بیروت، اور ممبر المجمع العلمی العربی دمشق) سے شکوہ ہے۔ کتاب کے مترجمین نے ڈاکٹر صاحب کو سیرت اور عقائدِ اسلامی سے متعلق مؤلف کے آرا و نظریات پر ضروری حواشی لکھنے کا کام سپرد کیا تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس حدیث پر مؤلف کی ہرزہ سرائی سے یونہی گزر گئے۔ اور ان کے دل میں نزاکت مقام نے کوئی چٹکی نہیں لی۔"

احمد محمد شاکر غالباً اس سے بے خبر ہیں کہ ڈاکٹر عمر فروخ علم حدیث میں بالکل سطحی النظر ہیں۔ میں نے خود انہیں اس طرف توجہ دلائی تھی۔ انہوں نے اس پر اپنے مختلف عذرات پیش کیے اور معلوم ہوا کہ وہ دراصل حدیث کے پورے واقعہ سے بے خبر ہیں۔

احمد محمد شاکر صاحب کی نگاہ سے یہ امر اوجھل رہا ہے کہ کتاب کے مترجمین میں سے ایک صاحب (نبیہ امین فارس) نہ صرف عیسائی ہیں، بلکہ ممالکِ عرب میں صلیبی نظریات کے سرخیل ہیں۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے انچارج ہیں۔ اور امریکی استعمار کے

Marfat.com

نہایت قابلِ اعتماد ستون شمار کیے جاتے ہیں۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی جس وسیع پیمانے پہ تبلیغیات اور استعماریت کا پروپیگنڈا کر رہی ہے اس کی تفصیلات کے لیے یہ مقام موزون نہیں ہے۔ ڈاکٹر عمر فروخ اور مصطفیٰ خالدی کی کتاب "التبشیر والاستعمار" اس موضوع پر نہایت جامع مجموعہ ہے۔ اور پوری شرح وبسط کے ساتھ اس میں مسیحی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اسلامی تہذیب کی تحقیر

مغربی مستشرقین کی مغالطہ انگیزیوں کی ایک نوعیت یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی تہذیب وتمدن کے آثار وشعائر کا استخفاف کرتے ہیں۔ اور اسلامی تہذیب وتمدن نے دنیا کے اندر انسانیت کی فکری اور عمرانی ترقی کے لیے جو سنہری کردار ادا کیا ہے، اس کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ نوعیت اگرچہ کتاب وسنّت کے نصوص کی تحریف اور پیغمبر اسلام اور صحابہ کرام پہ بہتان طرازیوں سے نسبتہً ہلکی ہے۔ لیکن اس لحاظ سے اس کی اہمیت کم نہیں ہے کہ یہ ان مضمرات کی حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے، جو مستشرقین کے دلوں کی گہرائیوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی بے اختیار ان کے منہ سے ابل پڑتے ہیں۔ ذیل میں ہم مشہور مستشرق (G B. Trend) کی کتاب (The Legagy of Islam) کا ایک پیراگراف درج کرتے ہیں۔ جو اس نے "اسپین اور پرتگال" کے زیرِ عنوان رقم کیا ہے۔ اور اس میں اپنے مستشرق

Marfat.com

رفقاء پر عربی تہذیب و تمدن کے ساتھ ضرورت سے زیادہ نفرت کرنے پر اظہارِ تاسف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"ہسپانوی مؤرخین کا جدید مدرسہ فکر یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اسلام نے اپنے پیچھے کوئی قابلِ قدر تہذیبی اور علمی ورثہ چھوڑا ہے۔ یہ انیسویں صدی کے اوائل کی داستانیں ہیں کہ لوگ بڑے مبالغہ آمیز انداز میں یہ بیان کیا کرتے تھے کہ عربوں نے اسپین میں عظیم الشان تہذیبی کردار ادا کیا ہے۔ آج کا مستند اور ثقہ مؤرخ اس رائے کو محض قدیم خرافیات کا درجہ دیتا ہے۔ بلکہ کسی ذکی مؤرخ سے اگر ایسا سوال کیا جائے تو وہ فوراً ناک بھوں چڑھا لیتا ہے۔ ہسپانوی مورخین کا یہ موقف موجبِ تاسف ہے۔ لیکن اس کی تہ میں بے شمار اسباب کارفرما ہیں، جن میں بعض غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے کچھ اسباب کونڈیہ ... (Conde) نے اپنی کتاب "اسپین پہ عرب حکمرانوں کی تاریخ" میں گنوائے ہیں، اور بعض کی نشان دہی ولندیزی مستشرق ڈوزے ... (Dozy) نے اپنے مقالہ "السید القمبیاطور" میں کی ہے۔ لیکن میری نگاہ میں اس کا بنیادی سبب محققین و مستشرقین کا یہ عام رجحان ہے کہ وہ ہر چیز کو حتی الامکان لاطینی اصلیت کی طرف لوٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ رجحان ان کے اندر روز بروز فروغ پا رہا ہے۔ اس رجحان کی پیدائش میں امریکن اور فرانسیسی یونیورسٹیوں کا ہاتھ ہے۔ جنھوں نے یہ ذوق اس قدر عام کر دیا ہے کہ ہسپانوی مورخین کی نگاہوں میں مشرق

Marfat.com

کی تمام تحقیقات اور علمی کاوشیں پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی ہیں۔ آسن اور ریبرا جیسے لوگوں نے اس موقف کو بدلنے کی بہت کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں فاضلانہ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن انہیں کامیابی نہیں حاصل ہو سکی۔"

ٹریفیڈ (Trend) کی کتاب کا یہ اقتباس بتا رہا ہے کہ مستشرقین کا ایک گروہ اسلامی تہذیب اور عربوں کے تمدنی محاسن کے استخفاف میں مصروف ہے۔ اور نوجوان نسل کے دلوں سے اس کی قدر و قیمت کو ہر ذریعہ سے محو کر دینا چاہتا ہے۔ اور امریکہ اور فرانس کی یونیورسٹیاں اس گروہ کے نظریات کی اشاعت کا مرکز بنی ہوئی ہیں، جہاں طلباء کو اول روز ہی سے یہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ تہذیبی اور ثقافتی مظاہر کو عربی الاصل ثابت کرنے کے بجائے لاطینی الاصل ثابت کریں۔ تاکہ علم و فکر کے رشتے اور عقیدت و محبت کے جذبات مسلمانوں سے کٹ کر قدیم لاطینی اور یونانی اقوام کے ساتھ منسلک ہو جائیں۔

حدیث اور یہودی محققین

حدیث اور علومِ حدیث پر مستشرقین کے قلم نے جو گل افشانیاں کی ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے وہ دوسرے موضوعات کی نسبت زیادہ شر انگیز اور زہر آلودہ فکری کو رواج دینے والی ہیں۔ اور مغربی نقطۂ نگاہ سے بھی استعمار پسندی کے تقاضوں کو باحسن وجوہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے والی ہیں۔ جس شخص کو کبھی حدیث کے متعلق استشراقی لٹریچر کی ورق گردانی کا

Marfat.com

اتفاق ہوا ہے۔ اور اس کے مصنفین کے افکار کا تتبع کرنے کا موقع ملا ہے۔ وہ پہلے ہی مرحلے پر یہ معلوم کرلے گا کہ حدیث کی اہمیت اور حدیث کی تاریخی صحت کو مستشرقین کے جس گروہ نے سب سے زیادہ طعن و تنقید اور استہزاء و استخفاف کا ہدف بنایا ہے، وہ یہودی ہیں۔ اصل میں حدیث کے ساتھ یہودیوں کا خصوصی بغض و عناد محض اتفاقی امر نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے اور اسی کی روشنی میں اسے سمجھا جا سکتا ہے۔

یہود کی اسلام دشمنی

اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس تاریخ میں جتنے زہرہ گداز حادثات کا صدور ہوا ہے، اُن کے پسِ پردہ زیادہ تر جس عنصر کا ہاتھ رہا ہے وہ یہودی طائفہ تھا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ثقافت اور سیاست کا نقاب اوڑھ کر جتنی باطنی تحریکیں اٹھی ہیں، ان سب کی رسی اسی فتنہ پرور عنصر کے ہاتھ میں رہی ہے۔ یہودیوں کی اسلام دشمنی اس وقت سے نمایاں ہو گئی تھی، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جا کر اسلامی تحریک کو سیاسی قوت کے ساتھ قائم کر دیا تھا۔ مگر ان کے بغض و عناد کا طوفانی دور بعد میں شروع ہوا۔ خلیفہ اوّل اور خلیفہ دوم کے زمانے میں اس عنصر کو اسلام کی مخالفت میں جب خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی تو اس نے علانیہ مخالفت ترک کر کے منافقت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اور ملّتِ اسلامی کی صفوں میں داخل ہو کر اسلام کی جڑیں کاٹنی شروع کر دیں۔ اور اسلامی سوسائٹی کا

Marfat.com

شہزادہ بکھیرنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہودیوں کے سرغنہ عبداللہ بن سبا نے یمن کے یہودیوں کے ساتھ مل کر، جو فتنے برپا کیے ہیں اس سے تاریخ کا ہر قاری اچھی طرح واقف ہے۔ ایک طرف اس نے صحابہ کرام کے اندر فتنہ انگیزیوں کا جال بچھا دیا اور باہم کش مکش برپا کرنے کی سر توڑ کوشش کی۔ اور دوسری طرف اعتقادات کی عمارت کو متزلزل کرنے کے لیے عوام الناس میں عجیب و غریب خیالات کی اشاعت شروع کر دی۔ کبھی یہ کہا کہ حضرت علیؓ ذاتِ ربانی کا مظہر ہیں، کبھی قرآن کی آیات کو وہ معنی پہنانے شروع کر دیے جو عام اور متبادر مفہوم کے خلاف تھے۔ قرآن چونکہ مجمل صورت میں تھا اور اس کی آیات میں مختلف معانی کا احتمال پایا جاتا تھا۔ اور حدیث قرآن کے اجمال کی تشریح کرتی تھی اور اس کے مجمل آیات کے معنی و مقصود کا تعین کرتی تھی، اس لیے حدیث کا ذخیرہ یہودی منافقین کی من مانی تاویلات میں حارج تھا۔ اور جمہور مسلمین میں ان کی تاویلات کے کھوٹے سکوں کے رواج کے لیے سدراہ تھا۔ یہودی منافقین نے اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے احادیث پر حملے شروع کر دیے۔ اور ان کی شرعی اہمیت گھٹانے اور ان کی صحت کو مشکوک کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خوارج کے ساتھ مباحثہ کے لیے بھیجا تو آپ نے عبداللہ بن عباسؓ کو روانہ کرتے وقت

Marfat.com

جو تلقین فرمائی تھی اُس سے اِن منافقین کے طرزِ عمل کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ نے فرمایا: "تم جب ان سے کسی مسئلہ پر بحث کرو تو اپنی دلیل میں احادیثِ نبوی کو پیش کرو۔ کیوں کہ قرآن کی آیات کی مختلف تعبیریں کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان کی صحیح اور مطلوب تاویل وہی ہوگی جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کرے گی۔"

یہودی مفکّرین کے بغض کی ایک اور وجہ

یہود کے بغض حدیث کا ایک سبب یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس قوم کی تاریخ بتاتی ہے کہ بغض و حسد اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اِسے اس بات کا سخت جلاپا ہے کہ ملّتِ محمدی کے احکام و شرائع ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف صحیح اور متصل سندوں کے ساتھ منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے برعکس یہود کے مذہبی مجموعوں کا یہ حال ہے کہ ان کے احکام و وقائع کا ایک بھی سلسلہ روایت ایسا نہیں ملتا جس کا اتصال ان کے کسی پیغمبر تک قائم رہا ہو۔ یہود کے اس کمزور پہلو کا ذکر فقہائے اسلام نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم نے الملل والنحل، جلد دوم میں جہاں حدیث کے سلسلہ ہائے اسناد کی قسمیں بیان کی ہیں اور متواتر اور مشہور کی بحث کی ہے وہاں یہ بتایا ہے کہ "شریعت محمدی کا یہ وصف کہ اس میں بیشتر احکام و شرائع کا سلسلہ صحیح اور متصل کڑیوں کے ساتھ شارع علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے، یہود اور نصاریٰ کے ہاں مفقود

Marfat.com

ہے"۔ بلکہ ابن حزم رحمۃ اللہ سند متصل کو امت محمدی کا خاصہ بیان کرتے ہیں۔ جس سے اللہ تعالےٰ نے صرف خیر الامم کو ہی سرفراز فرمایا ہے۔ البتہ مرسل، منقطع اور منفصل اسناد ——— جن کے قابلِ حجت ہونے میں فقہاء اور محدثین میں اختلاف پایا جاتا ہے ——— کے ذکر میں علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ: "اس نوع کی اسناد یہود کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ لیکن اُن کا اِس نوع کی اسناد اور ہماری اِس نوع کی اسناد میں فرق یہ ہے کہ ہماری اسناد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس قدر قریب ہو جاتی ہیں کہ صرف ایک یا دو واسطوں کی کسر باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن یہود کی اسناد میں یہ انقطاع تیس ادوار یعنی تقریباً ڈیڑھ سو سال تک طوالت پکڑ گیا ہے۔ اُن کی تمام روایات ہلال۔ شمافی۔ شمعون۔ مرعقیبا وغیرہ تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ میرے علم کے مطابق صرف نکاح سے متعلق ایک مسئلہ ایسا ہے جو ان کے ایک عالم نے بنی اسرائیل کے کسی آخری نبی سے بسندِ متصل روایت کیا ہے۔ نصاریٰ کے ہاں نقل و روایت کا قصہ ہی سرے سے پاک ہے۔ طلاق کی حرمت کا ایک مسئلہ ان کے علماء سے مروی چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کی تخریج کرنے والے کا کذب بھی ثابت ہو چکا ہے۔" علامہ ابنِ حزم رحمہ اللہ نے یہود کی اس مذہبی کمزوری کا ذکر کیا ہے، در حقیقت بغض و حسد کی یہی ہنڈیا ہے جو اسلام کے محاسن اور محکم الاسناد احکام کو دیکھ کر ان کے دل میں ابل رہی ہے۔ اور اس کا انتقام ملتِ محمدیؐ کے

Marfat.com

نیک طینت اسلاف بالخصوص ائمہ حدیث، اور حدیث کے مدوّن اصولوں سے لینا چاہتے ہیں۔ اور مختلف طریقوں سے ان پر زبانِ طعن و تشنیع دراز کرتے رہتے ہیں۔ گولڈ سیہر یہودی مستشرق نے حدیث و سنّت پر اپنے تمام مقالات میں ائمہ احادیث پر زہریں بجھے ہوئے تیروں کی بارش کی ہے۔ اور بالخصوص مشہور محدّث امام ابن شہاب زہری پر دل کھول کر حملے کیے ہیں۔ اس باب میں گوستاف فون گرون بام۔ (G E Von Grunbaum)
جرمن کے ایک یہودی مستشرق جو آج کل امریکہ میں مقیم ہیں، اپنے ہم سفروں میں کسی حیثیت سے پیچھے نہیں ہیں۔ ان کی کتاب جو "حضارۃ الاسلام" (Islam in the Middle Ages)
کے نام سے عربی میں ترجمہ ہو کر پچھلے سال قاہرہ میں شائع ہو چکی ہے، یہودی عصبیت کا مکمّل آئینہ سامنے رکھ دیتی ہے۔ میں نے جب اس کتاب کا مطالعہ کیا، تو دورانِ مطالعہ محسوس ہوا کہ مؤلف یا تو عربی زبان سے قطعاً ناآشنا ہے، یا اگر اسے کچھ شُدبُد حاصل بھی ہے تو اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ اسلامی علوم و فنون کی کتابوں سے براہِ راست استفادہ کر سکے۔ میرا یہ اندازہ بعد میں بالکل درست ثابت ہوا۔ قاہرہ یونیورسٹی کے ایک ایرانی پروفیسر ادبیات ایران ڈاکٹر یحییٰ خشاب نے میرے قیاس کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ گرون بام صاحب سے میں قاہرہ میں ملاقات کر چکا ہوں۔ عربی زبان بالکل

Marfat.com

معمولی طور پر جانتے ہیں۔ عربی ماخذ سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکتے بلکہ دوسرے مستشرقین اور پادریوں کی کتابوں کے اندر جہاں عربی کتب کے حوالے موجود ہیں انہی سے کام چلاتے ہیں۔ زیادہ تر ان کا ماخذ گولڈ سیہر کی کتابیں ہیں۔ یہ تفصیل بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ حضرات فکر و تحقیق کا یہ عزہ رکھتے ہیں کہ محدثین اور فقہاء کی پگڑی اچھالنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اور دوسری جانب عربی زبان دانی کا یہ حال ہے کہ فقہاء و محدثین کی کتابوں کو سمجھنے اور پڑھنے کی اہلیت بھی نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گرونیام صاحب نے اپنی کتاب میں بعض نصوص کا ایسا غلط مفہوم بیان کیا ہے کہ عربی زبان سے واقفیت رکھنے والا کبھی ایسی فاش غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ آغاز کتاب میں مؤلف نے اگرچہ مغربی مفکرین پر شدید گرفت کی ہے کہ انھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں نامناسب رویہ اختیار کیا ہے۔ بلکہ ان کی بعض باتوں کو کذب و افترا پر محمول کیا ہے لیکن ہم اس انداز بیان کو ایک فریب سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے ہیں۔ کیونکہ اس دعوئ غیر جانبداری کے ساتھ جب وہ خود میدانِ تحقیق میں گرم جولان ہوتے ہیں تو وہ ان تمام افتراءات اور مظلومات سے ملوث ہو جاتے ہیں جو انہوں نے اپنی پاکیزگی دامن کے مظاہرے میں مغربی سروں کی جانب منسوب کی ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں: "مسیلمہ کذاب، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہو گزرا ہے۔ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

Marfat.com

کا ہمعصر تھا۔" مصنف کا یہ تحقیقی شاہکار مارگولیتھ کی رائے سے ماخوذ ہے کیونکہ مارگولیتھ نے بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "مسیلمہ کا زمانہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے کا تھا، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسیلمہ کی نقالی کی ہے۔" (نعوذ باللہ من ہذہ الہفوات)۔ گرونبام صاحب نے اپنی کتاب میں جہاں حدیث اور علومِ حدیث پر بحث کی ہے، اور ائمہ حدیث کو ہدف مطاعن بنایا ہے، وہاں وہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ پر تبصرہ کرتے ہوئے انکشاف فرماتے ہیں کہ: "صحیح بخاری مصنفات میں سے ہے (جیسے مصنف ابن ابی شیبہ) اور صحیح مسلم مسانید میں سے ہے۔ (جیسے مسند امام احمد اور مسند امام ابوحنیفہ)۔ صحیح بخاری کو مصنفات میں شمار کرنے والا اور صحیح مسلم کو مسند بتانے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جس کی حدیث و فقہ کے فنون سے واقفیت اتنی بھی نہ ہو جتنی بڑا خفش کو نحو میں تھی۔

(چراغِ راہ، جنوری ۵۸ء)

Marfat.com

دار المطالعہ
تنظیم المسلمین
فتح گڑھ

Marfat.com

عبدالوہاب حمودہ :

مصر کے جیّد علماء میں سے ہیں۔ ازہر کے فارغ ہیں۔ مختلف دینی اور علمی پرچے ان کے رشحاتِ فکر سے مزیّن ہوتے ہیں۔ "لواء الاسلام" نے اپنے دامن میں علمائے حق اور اربابِ نظر کا جو گروہ سمیٹ رکھا ہے، موصوف اس کے رکنِ رکین ہیں۔ اسلوبِ تحریر اور طرزِ گفتگو میں اس گروہ کے سرخیل : شیخ محمد ابوزہرۃ کی جھلک ملتی ہے۔ فکر و نگاہ کی زندگی امام شہید حسن البنّا سے حاصل کی ہے۔ جرأت مندی اور تلخیٔ نوائی کا مرمایہ محب الدین خطیب کا رہینِ منت ہے۔

جس ملک میں سیاسی استبداد عروج پر ہو، اباحیت و فجور نے تہذیبی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہو، علمی ترقی اور فکری آزادی کے پردے میں ذہنی انتشار اور فکری مغلق العنانی فروغ پا رہی ہو، مذہبی لبادے جنس تجارت قرار پا چکے ہوں ——— وہاں عبدالوہاب حمودہ جیسے لوگوں کا دینی مقدسات اور اخلاقی اقدار کی حفاظت کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا جہادِ اکبر سے کم نہیں۔

Marfat.com

موصوف نے اپنے قلمی جہاد کا آغاز المسلمون (دور مصر) کے صفحات سے کیا تھا۔ اس زرخیز زمین میں لگا ہوا یہ پودا ایسا تن آور اور ثابت الاصل بن کر نکلا کہ تند و تیز طوفان بھی اُسے ختم نہ کر سکے۔ "احادیثِ رسولؐ اور مستشرقین" کے مختصر مقالہ میں موصوف کی تنقیدی نگاہ نے محمد حسین ہیکل جیسے نامور اہلِ قلم کی لغزشوں پر بھی گرفت کی ہے۔ یہ اُن کی ژرف نگاہی، غیرت دینی اور حق پرستی کا واضح ثبوت ہے۔

Marfat.com

مستشرقین اور احادیثِ رسولؐ

وضعِ حدیث کا فتنہ ——— جو اسلام کے ابتدائی دَور میں اُٹھا تھا، اور جس کی علماء نے بروقت سرکوبی کر دی تھی۔ اور انکارِ حدیث کا چرچا، دونوں دراصل ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کے دو حربے ہیں۔ احادیث وضع کرنے والے عناصر کا بھی یہی مقصد تھا کہ شریعتِ اسلامی کے چشمۂ صافی کو مکدّر کر کے اسلامی تحریک کو نقصان پہنچایا جائے۔ اور احادیث کے منکرین کے مدِّ نظر بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کو اسوۂ رسولؐ سے بدگمان کر کے اسلام سے بیزار کر دیا جائے۔ ان دونوں عناصر کی فطرت اور مطمحِ نظر ایک ہے، لبادے مختلف ہیں ——— دورِ حاضر کے فتنۂ انکارِ حدیث کا آغاز مغرب کے یہودی اور عیسائی مستشرقین نے کیا ہے۔ بدقسمتی سے انھیں مسلمانوں میں سے ایسے "شاگردانِ رشید" ہاتھ آ گئے ہیں، جو اُن کے مشن کو کامیاب کرنے میں اُن سے بھی تیز رَو ثابت ہوئے ہیں۔

Marfat.com

ذیل کے مضمون سے آپ کو معلوم ہوگا کہ گولڈ زیہر اور گوئینبل نے احادیث کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن میں اور مصر کے ڈاکٹر احمد امین یا پاکستان کے غلام احمد پرویز کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسلام دشمن یہودی اور صلیب پرست عیسائی اپنی سیاسی اغراض کی بناء پر جو فتنہ پردازی کرتے ہیں اُن کے مشرقی شاگرد دانستہ و نادانستہ انہی اغراض کا آلۂ کار بن کر ملّتِ اسلامی میں اُن کے مشن کو کامیاب کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ (مرتّب)

اسلامک انسائیکلوپیڈیا کی غلط بیانی

مستشرقین کے حلقوں میں یہ عام چرچا ہے کہ اکثر احادیث موضوع ہیں اور ان پر کسی طرح کا اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں لفظ "حدیث" کے تحت مشہور مستشرق گوئینبل[1] (GOLDZIHER) لکھتا ہے:

---

[1] گوئینبل (۱۸۵۰ء - ۱۹۲۱ء) ہالینڈ کا رہنے والا تھا۔ لیڈن یونیورسٹی میں عربی ادبیات کا پروفیسر تھا۔ ابن تغری بردی کی کتاب: "النجوم الزاہرۃ" کے حصّہ اوّل اور دوم کو اس نے پہلی مرتبہ شائع کیا تھا۔

Marfat.com

"احادیث کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جسے طریقۂ رسولؐ کا صحیح اور تاریخی آئینہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ان خیالات و آراء کی نمایندگی کرتی ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحلت کے بعد قرونِ اولیٰ میں بعض اربابِ اقتدار و نفوذ نے اختیار کر رکھے تھے۔ اور پھر انہی خیالات و آراء کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب منسوب کر دیا تھا....."

مستشرق گولڈزیہر کے خیالات

جرمن مستشرق گولڈزیہر اپنی کتاب "عقیدہ و شریعت" میں لکھتا ہے:

"احادیثِ موضوعہ کو ہم صرف بعد کی نسلوں تک منسوب کر دینا کافی نہیں سمجھتے بلکہ ہمیں ایسی احادیث بھی ملتی ہیں جن میں قدامت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ یہ احادیث کچھ رسولؐ کے اقوال ہیں اور کچھ متقدمین اہلِ اسلام کے افعال۔ ان احادیث میں کچھ بائیبل کے عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کے مقولے ہیں، کچھ علمائے بنی اسرائیل کے اقوال ہیں، کچھ اناجیل (یعنی اناجیل برناباس) اور فلسفۂ یونان کی تعلیمات ہیں۔ کچھ حکمائے ہند اور دانش ورانِ فارس کی گفتاریں ہیں۔ ان تمام چیزوں نے "حدیث" کے راستے سے داخل ہو کر اسلام کے اندر اپنا ایک مقدس مقام پیدا کر لیا تھا۔

Marfat.com

مسلمانوں نے نقدِ حدیث کا جو فن اختیار کیا ہے، اسے سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ البتہ وہ ہمارے اصولِ تنقید سے مختلف ہے۔ جن احادیث کو اسلامی انتقاد کی کسوٹی صحیح اور غیر مشکوک قرار دیتی ہے ہمارے نقطۂ نگاہ کی رُو سے اُن میں نقد و نظر کا وسیع میدان موجود ہے۔[1]

فریڈ گیوم کی رائے

فریڈ گیوم اپنی کتاب "اسلام" میں لکھتا ہے:

"مسلمانوں کے دلوں میں رسولؐ کی عزت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک عامی مسلمان جب رسولؐ کا نام کسی ایسے سلسلۂ روایت کے ساتھ ملا ہوا سُنتا، جس کی آخری کڑی صحابہ یا تابعین تک پہنچتی تھی یا خود رسولؐ تک متصل ہوتی تھی، تو وہ اس روایت کو رَدّ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُسے اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں اُس پر اپنے ہادیٔ اعظمؐ کی بے حرمتی کا الزام نہ آئے۔

---

[1] ذرا اندازہ کریں کہ ہمارے ہاں کے منکرینِ سنت احادیث پر جو اعتراضات کرتے ہیں اور اُن کے موضوع ہونے کے جو دلائل دیتے ہیں اُن میں اور گولڈ زیہر کے خیالات میں کیا فرق ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل می گوید ہماں می گویم

Marfat.com

بہرحال حدیث میں جرح و تنقید کے مدارس نمودار ہوئے اور انہوں نے قواعد ثابتہ کی روشنی میں چھان بین کا کام شروع کیا۔ مگر بدقسمتی سے انہوں نے جس طرح کی توجہ راویوں کی شخصیت اور ان کے حالاتِ زندگی پر صرف کی، داخلی تنقید (یعنی متن حدیث کی تنقید) پر اس نوعیت کی توجہ مبذول نہیں کی۔"

فریڈ گیوم آگے چل کر ناقدینِ حدیث کے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کرتا ہے:

"مسلمان اہلِ نقد و جرح نے بعض احادیث کے معاملہ میں مسامحت کا پہلو اختیار کیا ہے۔ اگر کوئی حدیث معلّل ہوتی یا اُس کی سند مضطرب ہوتی، تو اس کے باوجود اُن کے نزدیک محض اس وجہ سے وہ حدیث قابلِ اعتراض نہ ہوتی کہ اس سے کسی ضرر کا اندیشہ انھیں لاحق نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسا اوقات وہ فوائد کی حامل ہوتی تھی۔ اس لیے وہ اس کو باقی رہنے دیتے۔ اور مسلمانوں میں اُس کی ترویج کی اجازت دے دیتے....."

مستشرقین کی مغالطہ انگیزیوں کا مقصد

مستشرقین کی ان آبادہ سفواست اور بے بنیاد تبصروں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ احادیثِ نبویؐ کے عظیم الفقد ذخیرے اور تاریخ انسانی

Marfat.com

کے پاکیزہ مجموعۂ تعلیمات کے بارے میں اسلام کے نام لیواؤں کے اندر شکوک و شبہات پیدا کر دیے جائیں۔ دراصل سنتِ رسولؐ کا ذخیرہ الٰہی قوانین، اجتماعی اصول و ضوابط اور اخلاقی ہدایات کے جن جواہر ریزوں پر مشتمل ہے اس قسم کا ذخیرہ آج تک کسی پیغمبر اور کسی مصلح و مفکر کی تعلیمات و افکار کے بارے میں وجود میں نہیں آیا۔ مغرب کے مفکرین اسلام کی اس روشن تاریخ سے سخت چیں بجبیں ہیں اور وہ طرح طرح کے حربوں سے اسلام کے تابناک ماضی کو تاریک ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

مستشرقین کے مشرقی تلامذہ کے رجحانات

ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان مفکرین کا ایک گروہ بھی احادیث کے متعلق اس قسم کے بے بنیاد خیالات میں دنیائے استشراق کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے، اور تدبر و فکر سے بے بہرہ ہو کر احادیث کی اہمیت و قیمت کا استخفاف کر رہا ہے، اور ان کے ماخذ شریعت ہونے کو مشکوک ثابت کر رہا ہے۔ اس گروہ سے اگر احادیث کے موضوع پر گفتگو کی جائے تو اس کے جواب کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ "احادیث خود ساختہ ہیں، عقل میں نہیں آ سکتیں۔" چنانچہ یہ لوگ عقل کی آڑ لے کر بآسانی اُن تمام احادیث پر مُہرِ استرداد ثبت کر دیتے ہیں جو اُن کی خواہشات کے خلاف ہوں یا اُن کی عقل میں نہ آ سکتی ہوں۔ احادیث پر جعل سازی کا ٹھپہ لگا دینے میں یہ لوگ بالکل اُسی پروپیگنڈے پر اپنے رجحانات کی بنیاد استوار کرتے ہیں، جو مستشرقین نے ایک مدت سے علمی حلقوں میں پھیلا

Marfat.com

رکھا ہے۔ اس پروپیگنڈے کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جامعینِ احادیث اپنے دور میں متعدد سیاسی و غیر سیاسی آویزشوں سے دوچار رہے ہیں اور احادیث کی جمع و تدوین میں بھی یہ جھگڑے اُن پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔

ابنِ خلدون کی لغزش اور اس کا جواب

مستشرقین کا ایک گروہ حدیث کا استخفاف اس وجہ سے کرتا ہے کہ اُس نے ابن خلدونؒ کا یہ قول پڑھ لیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے صحتِ حدیث کی شروط میں اس قدر تشدد برتا ہے کہ اُن کے نزدیک سترہؑ سے زیادہ احادیث درجہ صحت کو نہیں پہنچ سکیں۔ ابن خلدونؒ کا یہ قول کس حد تک درست ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے مشہور ترکی عالم شیخ محمد زاہد الکوثری لکھتے ہیں:

"یہ ابن خلدونؒ کی صریح لغزش ہے اور لغزش پہ لغزش ہے بجا نادرست نہیں ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ بلا شبہ صحیح حدیث کے لیے بڑی شدید شروط رکھتے تھے، لیکن اِس شدت اور حزم کے باوجود ان سے صرف سترہؑ احادیث مروی نہیں ہیں، بلکہ ان کی مرویات سترہ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ہر مجلد کو مسند ابو حنیفہؒ کہا جاتا ہے۔ حفاظ و محدثین کے ایک گروہ نے ان مرویات کی تخریج کی ہے۔"[1]

---

[1] مقالات الکوثری۔

Marfat.com

مغرب سے مرعوبیت کا اثر

بعض معاصر محققین بحث و تنقید کے جدید مغربی اسلوب سے مرعوب ہیں اور بزعمِ خویش وہ اس اسلوب کو "جرأت مندانہ تنقید" سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ مستشرقین کا اندازِ تنقید و بحث بڑا علمی اور قرینِ عقل ہے۔ محدثین کا اسلوب اس کے مقابلے میں ہیچ اور ناقص ہے۔ چنانچہ اس مرعوبیت کی بنا پر جونہی دنیائے استشراق سے کسی حدیث پر اعتراض کی خبر انھیں پہنچتی ہے، فوراً اس اعتراض کے صحیح ہونے کی صدائے بازگشت بلند کر دیتے ہیں۔ یہ زحمت گوارا نہیں کرتے، کہ اصل حدیث کی جانب رجوع کر کے اس کی حقیقت معلوم کر لی جائے۔[1]

ان لوگوں میں سے ایک "حیاتِ محمدؐ" کے مصنف محمد حسین ہیکل مرحوم مصری ہیں۔ مرحوم ایک جگہ لکھتے ہیں:

"سب سے بہترین کسوٹی جس پر کسی حدیث کو، بلکہ

---

[1] چنانچہ ان حضرات نے آج تک جن احادیث کو موردِ اعتراض بنایا ہے۔ اہلِ علم کی طرف سے جب ان کی چھان بین کی گئی ہے تو یا تو وہ موضوع احادیث نکلی ہیں، جنھیں علمائے حدیث صدیوں پہلے جھوٹی احادیث کے ضمن میں درج کر چکے ہیں اور امت کو ان سے باخبر کر چکے ہیں، اور یا پھر وہ احادیث ہیں جن کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اعتراض کا ہدف بنایا گیا ہے اور ان کا اصل مفہوم سمجھنے کے لیے اصل کتابوں اور شرحوں کی طرف رجوع نہیں کیا گیا بلکہ مستشرقین سے سُن سُنا کر رائے قائم کر دی گئی ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

ان تمام روایات کو جن کا انتساب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کیا جاتا ہے، پرکھا جا سکتا ہے، وہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ: "انکم ستختلفون من بعدی فما جاءکم عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ فما وافقہ فمنی وما خالفہ فلیس منی" (میرے بعد تم لوگوں میں اختلافات ابھریں گے۔ پس جو حدیث میری جانب سے تمہارے پاس پہنچے اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ اگر وہ کتاب اللہ سے موافقت کرے تو وہ میری جانب سے ہے، اور اگر مخالف ہو تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں)

ہمارے جدید محققین کا مبلغ علم

اس حدیث کو بھی گولڈزیہر نے اپنی کتاب "عقیدہ و شریعت" میں بیان کیا ہے۔ اور اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ خود رسول کی زندگی میں بھی احادیث کثرت سے وضع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ گولڈزیہر اور مصری مؤرخ محمد حسین ہیکل دونوں اس بات سے بے خبر ہیں کہ جس حدیث کو وہ استدلال میں پیش کر رہے ہیں اسے محدثین اور ارباب نقد و جرح موضوع احادیث میں درج کر چکے ہیں۔ امام شاطبی رحمہ اللہ (متوفی ۷۹۰ھ) "الموافقات" کے جزو چہارم میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ زنادقہ اور خوارج نے

Marfat.com

اس حدیث کو وضع کیا ہے"۔

اصحابِ نقد و جرح نے کہا ہے: "اہلِ علم کی تحقیق میں یہ حدیث صحیح نہیں ہے"۔ علماء کے ایک گروہ نے اس حدیث کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ "ہم سب سے پہلے خود اس حدیث کو کتاب کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اسے پرکھ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرتے ہیں تو خود اسے ہی کتاب اللہ کے مخالف پاتے ہیں۔ کیونکہ کتاب اللہ میں ہمیں یہ حکم نہیں ملتا کہ ہم رسولؐ کی کسی حدیث کو اس وقت تک قبول نہ کریں جب تک وہ کتاب اللہ سے موافقت نہ کرتی ہو۔ بلکہ ہمیں کتاب اللہ غیر مشروط طور پر یہ حکم دیتی ہے کہ رسول کو اپنا اسوہ بناؤ اور اس کی اطاعت کرو۔ کتاب اللہ کا ارشاد ہے: وما اٰتٰکم الرّسول فخذوہ و ما نھٰکم عنہ فانتھوا۔ (رسول جو تمہیں دے اُسے لو اور جس سے منع کرے اُس سے باز آجاؤ۔) اور ہمیں ہر حال میں رسولؐ کے حکم کی مخالفت سے بھی ڈراتی ہے[1]....."

شیخ العجلونی اپنی کتاب کشف الخفاء میں لکھتے ہیں:

"یہ حدیث درجہ اوّل کی موضوعات میں سے ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک اور صحیح حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] الموافقات: جزء چہارم۔ ص ۱۸ و ۱۹۔ مطبع رحمانیہ، مصر۔

Marfat.com

سے ہمیں ملتی ہے جو اس حدیث کی تردید کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ لا الفینّ احدکم متکئاً علی متکأ۔ یصل الید عنّی حدیث۔ فیقول، لا نجد ھذا الحکم فی القرآن، الا وانی اوتیت القرآن ومثلہ معہ۔ (میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ وہ آرام گاہ پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو، اور جب اس کے پاس میری کوئی حدیث پہنچے تو وہ کہے: "یہ حکم ہمیں قرآن میں نہیں ملتا ہے" (اس لیے ہم اسے قبول نہیں کرتے)۔ آگاہ رہو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کے مثل بھی ایک چیز (سنّت) دی گئی ہے۔)

ڈاکٹر احمد امین کے اعتراضات اور اُن کا جواب

فجر الاسلام کے مصنّف ڈاکٹر احمد امین، گولڈ زیہر کی تقلید میں لکھتے ہیں: "میں علمائے حدیث کی یہ غلطی بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے اسنادِ حدیث کے بارے میں تو چھان بین کی ہے لیکن متنِ حدیث پر ضروری توجہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ بخاری بھی ——— اپنی جلالتِ شان اور باریک بینی کے باوجود ——— ایسی احادیث کو اپنے جامع میں جگہ دے دیتا ہے جن کو حالاتِ زمانہ اور تجربہ اور مشاہدہ نے غیر صحیح ثابت کر دیا ہے۔ کیوں کہ بخاری نے بھی صرف رجال پر اپنی تنقید کو محدود رکھا ہے۔ مثلاً یہ حدیث کہ لا یبقی علی ظھر الارض بعد

Marfat.com

مائۃ سنۃ نفس منفوسۃ (سو سال کے بعد تختۂ زمین پر کوئی متنفس باقی نہیں رہے گا)۔

صاحبِ فجر الاسلام کے پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ محدثین اپنے دور میں اس نقطۂ نظر سے احادیث کی تدوین کر رہے تھے، کہ حدیث کے متن کی بہ نسبت حدیث کی اسناد کی تحقیق ضروری ہے۔ کیوں کہ اسناد کی تحقیق کا کام صرف انہی کے دور میں ہو سکتا تھا۔ بعد کی نسلوں کے لیے اسنادِ کی خرابیوں اور علتوں تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہ رہتا۔ متنِ حدیث کا معاملہ ایسا تھا کہ اُسے ہر دور میں پرکھا جا سکتا ہے۔ اب اُن کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ اسناد کے بارے میں انہوں نے جو تحقیقی کام کیا ہے اس نے آیندہ نسلوں کو عرق ریزی سے بے نیاز کر دیا ہے۔ متنِ حدیث کو محدثین کے بجائے فقہاء نے اپنی توجہات کا مرکز بنایا ہے۔ علاوہ ازیں، یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ انسانی عقلیں متفاوت درجات رکھتی ہیں۔ کسی چیز کے غلط یا صحیح، موافق عقل یا مخالفِ عقل ہونے کے لیے، صرف ایک یا چند عقلوں کو، معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک حدیث ایک شخص کی عقل میں نہ اُترے اور وہ راوی کی امانت و دیانت کے باوجود اُسے رد کر دے۔ مگر دوسرے شخص کی نگاہ میں وہ حدیث عین موافقِ عقل اور مبنی بر صحت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے از روئے اسناد جن احادیث کو صحیح پایا ہے، انھیں اپنے مجموعوں میں درج کر لیا ہے۔ اور

Marfat.com

متن پر بحث و تنقید کا دروازہ قیامت تک علماء کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہے۔

موصوف کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بخاری میں بھی موضوع احادیث مذکور ہیں۔ انہوں نے مثال میں ایک حدیث بھی پیش کی ہے۔ جسے، اُن کے خیال کے مطابق حالاتِ زمانہ نے، موضوع ثابت کر دیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ موصوف نے بخاری کی شروح کی طرف رجوع کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ جس حدیث کو وہ صرف متن سے نہیں سمجھ سکے تھے شروح کی مدد سے اس کی حقیقت معلوم کر لیتے، تو اس پر موضوع کا حکم لگانے میں جلد بازی نہ کرتے: اور اپنے مستشرقین اساتذہ کی فریب کارانہ تنقید کا شکار نہ ہوتے۔

بخاری کی حدیث کا اصل مفہوم

بخاری کے شارحین حافظ ابن حجر، عینی اور قسطلانی نے اپنی کتابوں میں اس حدیث پر مفصل کلام کیا ہے۔ تینوں شارحین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ ارشاد کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ آپؐ کی مراد یہ تھی کہ آپؐ کی اس پیشینگوئی کے وقت جو لوگ موجود تھے، ٹھیک سو سال کے بعد اُن میں سے کوئی بھی روئے زمین پہ باقی نہیں ہوگا۔ اس مفہوم کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے، جو "باب السمر فی الفقہ والخیر بعد العشاء" میں حضرت ابنِ عمرؓ سے مروی ہے۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام کی بات ہے کہ آپؐ نے ایک بار عشاء کی نماز پڑھائی۔ اور سلام پھیرنے کے بعد کھڑے ہوئے اور فرمایا: "کیا تم لوگ اس رات کی اہمیت کو سمجھ رہے۔ آج رات سے ٹھیک سو سال کے سر پر آخری شخص بھی اس زمین پر باقی نہیں رہے گا۔"

ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ آپؐ کا یہ ارشاد حرف بحرف پورا ہوا۔ اس وقت جو صحابہ حاضر تھے، ان میں سے ایک ابو الطفیل عامر بن واثلہ تھے۔ چنانچہ محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ عامر بن واثلہ تمام صحابہ سے آخر میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ محدثین کی تحقیق یہ ہے۔ کہ عامر بن واثلہ ۱۱۳ھ تک زندہ رہے۔ اور جس رات اُن کا انتقال ہوا اس رات میں اور حضورؐ کی پیشین گوئی والی رات میں ٹھیک سو سال کا عرصہ تھا۔"

ہمارے اہلِ فکر حدیث کا مفہوم سمجھنے کی زحمت نہیں اُٹھاتے۔ اور اپنی کم فہمی کا الزام حدیث کے سر تھوپتے ہیں۔

موضوع احادیث کی شناخت کے قواعد

اب ہم ذیل میں چند ایسے قواعد درج کرتے ہیں، جو محدثین نے موضوع احادیث کی شناخت کے لیے مقرر کیے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے مفکرین کسی حدیث پر بلا سوچے سمجھے اپنا فیصلہ صادر کرنے سے پہلے اِن قواعد پر اُسے پرکھ لیا کریں گے۔:

(۱) وہ حدیث کسی مشہور تاریخی واقعہ سے متعارض ہو۔

(۲) عقلِ سلیم اور اسلام کے واضح احکام کی مخالفت کرتی ہو اور اس

Marfat.com

کی کوئی تاویل نہ کی جا سکتی ہو۔

(۳) وہ ایک ہی راوی سے ایسے واقعہ کے بارے میں مروی ہو کہ اگر وہ واقعہ درست ہے تو بہت سے لوگوں کو اس کا علم ہونا چاہیے۔ اور کثیر تعداد سے اُسے مروی ہونا چاہیے۔

(۴) حدیث کا موضوع رکیک ہو۔ یعنی وہ ایسا پوچ اور لچر کلام ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم المرتبت ذات سے اُس کا صدور محال ہو۔

(۵) اس حدیث میں چھوٹے چھوٹے گناہوں پر شدید عذاب کی دھمکی ہو اور معمولی اعمال پر بہت بڑے اجر کا وعدہ ہو۔

(۶) راوی خود معترف ہو کہ اس نے حدیث بیان کرنے میں کذب گوئی سے کام لیا ہے۔

ائمہ حدیث کو اللہ تعالےٰ جزائے خیر دے۔ انہوں نے بڑی کاوشوں سے احادیث کے الفاظ بلکہ احادیث کے رسم الخط تک کو ضبط کیا ہے۔ اُن کی صحت و عدمِ صحت کی غیر معمولی چھان بین کی ہے۔ خبیث اور طیب میں امتیازی علامات قائم کر دی ہیں۔ التباس اور ابہام کے پردوں کو چاک کر کے پورے ذخیرہ کو روزِ روشن کی طرح نکھار دیا ہے۔ اب اربابِ تحقیق کا فرض ہے کہ وہ اگر احادیث پر کلام کرنا چاہتے ہیں تو کم از کم اس فن پر پہلے عبور حاصل کریں۔ عقل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جس فن پر آپ رائے دینا چاہتے ہیں اُس کے بارے میں آپ کی معلومات

Marfat.com

کھوس ہوں۔ بلا جانے بوجھے اگر کوئی شخص معمولی سے کام کے اندر بھی رائے دینا شروع کر دیتا ہے تو اُسے ہر شخص بے وقوف سمجھتا ہے۔

(تلخیص۔ رسالۃ الاسلام۔ مصر)

(ایشیا ۱۸ مارچ ۱۹۵۹ء)

Marfat.com

ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی :

حمص (شام) کے ایک روشناس عالم، ادیب اور مجاہد ہیں۔ پیدائش ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ تعلیم ازہر میں حاصل کی۔ اور "قانون اسلامی میں سنّت کا مقام" پر ایک جامع اور ضخیم مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی امتیازی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا۔ شام میں "اخوان المسلمون" کی تنظیم کے مراقب عام (سربراہ کار) منتخب ہوئے۔ فلسطین کے جہاد میں خود چھاپہ مار دستوں کی قیادت کی۔ ملکی سیاست میں دخیل ہوئے۔ خاص دمشق کے حلقہ سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ (۱۹۴۹ء)۔ اور پھر ڈپٹی پریسیڈنٹ کے عہدہ کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ یورپی ممالک کا دورہ کیا۔ مصر و شام کے اتحاد سے قبل شریعت کالج (شام یونیورسٹی) کے پرنسپل بنائے گئے۔ شام یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک فقہی انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کا

Marfat.com

آغاز ہوا تو کالج کو ترک کر کے انسائیکلو پیڈیا بورڈ کے چیئرمین بنے۔ آج کل شام یونیورسٹی کے شعبہ فقہ اسلامی کے صدر اور شریعت کالج اور لا کالج میں اسلامی فقہ کے پروفیسر ہیں۔ متحدہ عرب جمہوریہ کی وزارتِ اوقاف کے تحت "تدوینِ حدیث" بورڈ کے رکن بھی تھے۔

سباعی بڑے سلجھے ہوئے پختہ عالم ہیں۔ کامیاب انشاپرداز اور ممتاز خطیب ہیں۔ شام ریڈیو سے معاشرت و تمدن کے موضوعات پر متعدد تقریریں کر چکے ہیں۔ محب الدین خطیب کے رسالہ الفتح (مصر) اور المسلمون (مصر اور شام) میں ان کی نگارشات کمال انشاء حسن بیان اور عمق مطالعہ کا سکہ منوا چکی ہیں۔ آجکل "حضارۃ الاسلام" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی ان کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

تصنیفات : السنۃ (ڈاکٹریت کا مقالہ، بڑی ضخامت کے ۵۱۰ صفحات)۔ من روائع حضارتنا (نشری تقریروں کا مجموعہ) اخلاقنا الاجتماعیۃ (نشری تقریروں کا مجموعہ)۔ اشراکیۃ الاسلام (یہ کتاب متحدہ عرب جمہوریہ کی سپریم کونسل آف اسلامک کلچر سے ... اول درجہ کا پرائز جیت چکی ہے)۔

شرح قانون الاحوال الشخصیۃ۔ دو حصے۔ الوصایا والفرائض۔ الدین والدولۃ فی الاسلام۔

Marfat.com

نظامِ السلم والحرب فی الاسلام۔ مشروعیۃ
الارث واحکامہ فی الاسلام۔ المرونۃ والتطور
فی التشریع الاسلامی۔ احکام الصیام وفلسفتہ۔

Marfat.com

Marfat.com

نسلی امتیاز

اسلامی تہذیب اپنے دامن میں جو فضائل و مکارم رکھتی ہے ان میں سے ایک انسانی مساوات ہے، جو دراصل اسلام کی آفاقیت اور اور انسان دوستی (Humanism) کا مظہر اور انسانوں کے اندر رنگ و نسل سے قطع نظر ایک حقیقی یگانگت پیدا کرنے کی دعوت ہے۔ قرآن کا یہ بیان کہ "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" اسی مساواتِ عامہ کا اعلان ہے، جس نے بنی نوع انسان کے تمام مادی و حسی امتیازات پر خطِ تنسیخ پھیر کر صرف تقویٰ اور خدا ترسی کو معیارِ فضیلت قرار دیا ہے۔ اسی اعلان کی مزید وضاحت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جمِ غفیر کے سامنے کھڑے ہو کر فرمائی:

الناس من آدم و آدم	تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم
من تراب، لا فضل لعربی علی	مٹی سے بنے تھے۔ پس کسی عربی کو
عجمی ولا لابیض علی اسود	عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر فضیلت
الا بالتقویٰ۔	نہیں۔ فضیلت صرف تقویٰ

Marfat.com

پرہیز گاری کی بنا پر ہے۔

اسلامی تہذیب میں انسانی مساوات کے نمونے

اسلامی تہذیب کا نظریۂ مساوات محض خوشنما الفاظ اور اصولوں کی حد تک نہ تھا کہ گاہے بگاہے ملکی و غیر ملکی تقریبات میں ان کے اظہار سے لذتِ تقریر حاصل کر لی جایا کرے، جیسا کہ تہذیبِ جدید کے علمبرداروں کا شیوہ ہے، بلکہ اسلامی معاشرے میں یہ مساوات اپنی پوری شان کے ساتھ عملاً جلوہ گر تھی اور اسلامی معاشرے کے لیے یہ کوئی غیر مانوس حقیقت نہ تھی جس کے نفاذ کے لیے محنت و مشقت اٹھانی پڑی ہو۔ چنانچہ اسلام نے تمام اجتماعی مواقع پر اس مساوات کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ مساجد میں اس مساوات کو نافذ کیا ہے۔ جہاں ایک ہی صف میں کالے اور گورے کھڑے ہو کر اپنے خالق کی بندگی کرتے ہیں، اور انکساری و سرافگندگی سے اپنے ہیچ ہونے کا اقرار کرتے ہیں، اور کوئی گورا کالے کے پہلو میں کھڑا ہونے سے انقباض یا اپنی توہین و تذلیل محسوس نہیں کرتا۔ حج میں اس کو نافذ کیا ہے، جہاں ہر رنگ اور ہر نسل کے انسان دوش بدوش مناسکِ حج ادا کرتے ہیں، اور بلا امتیاز ابیض و اسود ایک ہی نوع کے لباس میں ملبوس ہو کر اپنے عجز و ضعف کا اعتراف کرتے ہیں۔

تاریخ اسلامی میں مساوات کی حیرت انگیز شہادت

اسلامی تاریخ میں انسانوں کے اندر رنگ و نسل کی تفریق کو مٹانے

Marfat.com

کی اس سے بڑھ کر حیرت انگیز شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ فتح مکہ کے دن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے افریقہ کے ایک سیاہ فام باشندے۔ بلالؓ ــــ کو حکم دیا کہ وہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اسلام کے غلبہ کا اعلان کریں۔ غور کیجیے، کعبہ وہ مقام ہے جو دورِ جاہلیت میں بھی عربوں کی نگاہوں میں حرم مقدّس تھا، اور اسلام میں بھی اُسے قبلۂ مسلمین ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کی چھت پر سیاہ فام باشندہ کیونکر چڑھ سکتا ہے، اور کیوں کر اُسے اپنے قدموں میں روند سکتا ہے! بے شک تہذیبِ مغرب اس کا تصوّر کرنے سے بھی قاصر ہے۔ لیکن اسلامی تہذیب، آج سے چودہ سو برس قبل، مساواتِ انسانی کا یہ عملی مظاہرہ کر چکی ہے۔ بامِ کعبہ پر حضرت بلالؓ کا چڑھنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ انسان، خواہ کالا ہو یا گورا، ہر چیز پر شرف رکھتا ہے، اور وہ اس شرف کا مستحق نسل و نسب اور رنگ و قوم سے نہیں، بلکہ علم و عقل، اور اخلاق و ایمان کی بدولت ہو سکتا ہے۔ انسان اگر اعمال و اخلاق میں پسماندہ ہے تو جلد کی سفیدی اُسے فوقیت نہیں دے سکتی اور اگر اُسے علم و بصیرت اور اعمالِ صالحہ میں برتری حاصل ہے تو اسے جسم کی سیاہی فروتر نہیں کر سکتی۔

ایک بار ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابو الدرداءؓ نے حضرت بلالؓ کو "یا ابن السوداء" (اے کالی ماں کے بیٹے!) کہہ کر پکارا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو اس خیال کو سخت ناپسند فرمایا،

Marfat.com

بلکہ آپؐ نے حضرت ابو الدرداءؓ کو جھڑکا اور فرمایا: أعيرته بسواد أمه، انك امرءٌ فيك جاهلية (کیا تم بلالؓ کو ماں کے کالی ہونے کا طعنہ دیتے ہو؟ تمہارے اندر ابھی جاہلیت کا اثر باقی ہے)۔ جاہلی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے مابین یہی خطِ فاصل ہے۔ جاہلی تہذیب جس رنگ پرستی اور نسب و نسل کو اپنے لیے فخر و ناز کا سرمایہ اور علم و دانش کا پیمانہ قرار دیتی ہے، اسلامی تہذیب میں وہ سراسر جاہلیت اور نادانی ہے۔

جس تہذیب کی شان یہ ہو کہ اس میں کسی نسب کو دوسرے نسب پر اور کسی رنگ کو دوسرے رنگ پر تفوق کی اجازت نہ ہو بلاشبہ اس تہذیب کی گود انسانیت کے لیے موجبِ سعادت ہوگی۔ لیکن جس تہذیب کے گہوارے میں گورا تو ہر طرح کے تسلط و استیلاء کا مجاز ہو، لیکن کالے کے نصیب میں بجز ذلت و رسوائی کچھ نہ ہو، ساری سعادتیں اور منفعتیں سفید جلد نے اپنے لیے مختص کر لی ہوں، اور شقاوتوں اور صعوبتوں کا سارا طومار سیاہ جلد کے گلے میں منڈھ دیا گیا ہو، وہ تہذیب اپنی رنگا رنگ ترقیوں اور ظاہری چمک دمک کے باوجود جاہلیت کی تاریک وادی میں بھٹک رہی ہے۔ اور انسانیت کو صدیوں پیچھے اس ماحول میں پھینک رہی ہے جہاں کورچشمی، بے جا فخر و غرور اور جہالت و حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے برعکس، اسلامی تہذیب نے قدم قدم پر اس طرح کی نسلی و لونی تفریقوں کی بیخ کنی

Marfat.com

کی ہے، اور اپنی عبادت گاہوں میں، تعلیمی اداروں میں، سیاسی و معاشی میدانوں میں، عدالت و قیادت کے منصوبوں میں، حتیٰ کہ دشمن کی دشمنی اور دوست کی دوستی تک میں نسل پرستی کا غرور ختم کیا ہے۔

سیاہ فام اور منصب قیادت

حضرت عمرو بن العاص کی زیر سرکردگی جب اسلامی فوجیں مصر میں داخل ہوئیں۔ اور قلعہ بابلیون کے سامنے انہوں نے خیمے نصب کر لیے، تو مصر کے بادشاہ مقوقس نے صورت حال کو دیکھ کر اسلامی فوجوں سے گفتگو کی خواہش کی۔ اور اپنی طرف سے مسلمانوں کے پاس ایک وفد بھیجا۔ اور مسلمانوں سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ بھی اپنا ایک وفد اس کے پاس بھیجیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص نے دس افراد پر مشتمل ایک وفد شاہِ مصر کی جانب روانہ کیا۔ وفد میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی تھے، جن کا رنگ انتہائی کالا تھا، اور قد میں بھی خاصے لمبے تھے، حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ ان کا قد ۸ فٹ کے قریب تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ وفد کی طرف سے تمام بات چیت عبادہ بن صامت رضؓ کریں۔ جب یہ وفد مقوقس کے دربار میں پہنچا اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ گفتگو کے لیے آگے بڑھے تو مقوقس ان کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا اور کہنے لگا: "اس کالے شخص کو میرے سامنے سے ہٹا دو اور کسی دوسرے کو گفتگو کے لیے

Marfat.com

آگے کرو۔" مقوقس کے ان الفاظ پر تمام لوگ کھڑے ہو گئے ، اور بیک زبان ہو کر بولے : "یہ کالا شخص ہمارا سردار ہے ، علم و عقل میں ہم سب سے افضل ہے۔ ہم سب اس کے تابع اور اس کی رائے کے پابند ہیں۔ امیر نے ہم سب کو چھوڑ کر اسے ہمارا قائد بنایا ہے اور ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کریں۔" مقوقس نے جواب دیا : "اس اسود کو اپنا سردار ماننے پر تم کیسے راضی ہو گئے ہو ، حالانکہ اسے تم سب سے کم تر ہونا چاہیے ؟" ارکانِ وفد نے فوراً کہا : "یہ خیال غلط ہے۔ اگرچہ یہ شخص تیری نظروں میں سیاہ ہے ، لیکن مرتبہ و مقام میں ، سبقتِ اسلام میں ، اور عقل و تدبر میں ہم میں سے کوئی اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ رہی جسم کی سیاہی ، تو وہ ہمارے مسلک میں کوئی قابلِ اعتراض اور معیوب چیز نہیں۔" بالآخر شاہ مقوقس نے حضرت عبادہؓ سے کہا : "اے اسود! تو ہی آگے بڑھ کر گفتگو کر۔ مگر یہ گفتگو نرمی کے ساتھ ہو۔ تیری سیاہی سے میرا دل دہل رہا ہے۔ اگر تو نے تندی سے کام لیا تو میرا ہراس مزید بڑھ جائے گا۔" حضرت عبادہؓ نے مقوقس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر فرمایا : "ہماری فوج میں ایک ہزار کالے سپاہی ہیں اور ان میں سے ہر ایک مجھ سے زیادہ کالا ہے۔"

قدیم دورِ جاہلیت کا غیر مہذب انسان ——— اور بیسویں صدی کا مہذب انسان بھی ——— بشرے کی سیاہی کو ایک عیب خیال کرتا تھا۔ وہ کالے رنگ کے انسان کو یہ حق بھی دینے کے لیے تیار نہیں

Marfat.com

تھا کہ وہ سفید رنگ والوں کی صف میں کھڑا ہو بلکہ وہ ان کا قائد اور پیشوا ہو۔ اور علم و تدبّر میں اُن سے افضل گردانا جائے۔ لیکن اسلامی تہذیب کے جنم نے غیر عقلی امتیازات کے یہ تمام پیمانے چکنا چور کر دیے۔ اور انسانی تفریق کے نظریے کو جہالت و حماقت قرار دیا۔ اور اس بات کی کھُلی چھٹی دی کہ اگر کوئی سیاہ فام علم و فکر میں، شجاعت و بسالت میں، اور ایمان و اخلاق میں فوقیت رکھتا ہے تو وہ اونچے سے اونچے منصب تک پہنچ سکتا ہے۔ ہم نے حضرت عبادہ بن صامت رضؓ کو صرف مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ ورنہ اسلامی تاریخ کا ہر باب اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے اور ہمیں ایسے سیاہ فاموں کی طویل فہرست ملتی ہے جن کو اسلامی تہذیب نے ملّت کا ہیرو قرار دیا ہے۔

سیاہ فام مسندِ افتاء پر

اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان زمانۂ حج میں اعلان کروایا کرتا تھا کہ امام اہلِ مکّہ عطاء بن ابی رباح کے علاوہ کوئی شخص فتویٰ نہ دے۔ یہ عطاء بن ابی رباح، اہلِ مکّہ کے مرجع و پیشوا شکل و صورت کے لحاظ سے کیسے تھے؟ اس کی تفصیل حافظ ذہبی صاحبِ تذکرۃ الحفّاظ کی زبان سے سُنیں:

"عطاء سیاہ فام، یک چشم، چپٹی ناک والے، ایک ہاتھ سے معذور اور اپاہج تھے۔ بال گھنگریالے تھے۔ دیکھنے والے کو ان کے چہرے سے علم و فضل کی کوئی علامت

Marfat.com

نظر نہ آتی۔ جب وہ اپنے حلقۂ درس میں ہزاروں تلامذہ کے درمیان تشریف فرما ہوتے تو معلوم ہوتا کہ گویا روئی کے کھیت میں کوّا بیٹھا ہے۔"

لیکن اسی عطاؒ کو اسلامی تاریخ نے ملّت کی امامت و مرجعیّت کے مسند پہ سرفراز کیا ہے۔ اور ان کے ہاتھوں سے ہزاروں سفید رنگ والے علم و فضیلت سے بہرہ مند ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک تاریخ کا درخشندہ ستارہ شمار ہوتا ہے۔

سیاہ فام فقہاء و علماء

فقہ حنفی کی مشہور کتاب کنز الدقائق کے شارح عثمان بن علی زیلعی اور نصب الرایہ کے مؤلف حافظ جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف زیلعی (متوفی ۷۶۲ھ)۔ دونوں عالم سیاہ رنگ تھے۔ اور حبشہ کے یک شہر زیلعؔ کے باشندے تھے۔ مگر آج تک مسلمان ان کو اس حیثیت سے تو جانتے ہیں کہ ان کی تالیفات فقہ حنفی میں کتب آخذ میں شمار ہوتی ہیں، لیکن ان کا کیا نسب تھا؟ کیسا رنگ تھا؟ کس قوم سے تعلق رکھتے تھے؟ ان باتوں کی طرف کسی نے خاص دھیان نہیں دیا۔ اور نہ ہی اسلامی تہذیب کا پیدا کردہ ذوق ان چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔

شعراء و ادباء کی ایسی معتد بہ تعداد ہمیں ملتی ہے جو حبشی تھے۔ مگر خلفاء اور وزراء کے مصاحب رہے ہیں۔ کافور اخشیدی سے کون ناواقف ہے؟ یہ ایک سیاہ فام غلام تھا۔ اس نے چوتھی صدی ہجری میں مصر کی

Marfat.com

اسلامی سلطنت پر حکمرانی کی ہے۔ عربی کا مشہور شاعر متنبّی اس کے دربار سے وابستہ رہا ہے اور اس نے اپنی ہجو و مدح سے کافور کو دنیا میں شہرتِ دوام بخشی ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی تہذیب کا مزاج لونی حد بندیوں سے قطعاً نا آشنا ہے۔ اس تہذیب کی تاریخ میں کوئی ایسا سیاہ باب نہیں ملتا، جس سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہو کہ مسلم آبادیوں میں سیاہ فام نسل کی مخصوص بستیاں اور مخصوص سوسائٹیاں تھیں۔ جن میں سفید فام داخل ہونا یا سکونت پذیر ہونا اپنی ناک کٹ جانے کے مترادف سمجھتے تھے۔ نہ اس تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ ملتا ہے، جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ گورے کالوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور بر بنائے رنگ، اُن کو اپنے غیظ و غضب، اور سیاسی تشدّد کا نشانہ بنائے رکھتے تھے۔ اس کے علی الرغم تاریخ اسلامی کا ایک ایک لفظ گواہی دیتا ہے کہ جس تہذیب کی یہ تاریخ ہے وہ آفاقی اور انسانی تہذیب ہے۔ ابنائے بشر کو نسل و رنگ اور قوم و وطن کی عینک سے دیکھنے کے بجائے انہیں علم و تقویٰ کی میزان سے تولتی ہے۔ اور انہیں ایک ہی باپ کی اولاد تصوّر کرتی ہے۔ اس کی نگاہ میں انسانی جلد کی سیاہی و سپیدی نہیں بلکہ اعمال کی سیاہی اور سپیدی وزن رکھتی ہے۔ اور اس کا اٹل اصول ہے کہ: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔

Marfat.com

مغرب کا تضادِ قول و عمل

تقریباً نصف صدی سے گورے اور کالے کی تفریق کے مسئلے پر بحث کا بازار گرم ہے۔ حالانکہ یہ بدیہی امر ہے کہ سیاہ و سفید کی تفریق سخت وحشیانہ فعل ہے۔ اسے کوئی ترقی یافتہ تہذیب اختیار نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اسلامی تہذیب، جو بنی نوع انسان کے اندر اخوت و مساوات قائم کرنے میں تمام انسانی تہذیبوں سے ممتاز ہے، لونی امتیازات کو ہرگز جائز اور صحیح نہیں قرار دے سکتی۔ لیکن جب سے اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اور انسانی حقوق کے چارٹر کا اعلان ہوا ہے۔ تاریخ کی اس پیش پا افتادہ حقیقت پہ گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ کیوں کہ حقوقِ انسانی کے اعلانات کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کے مختلف حصّوں میں ان حقوق کی سخت پامالی ہو رہی ہے۔ مثلاً دنیا دیکھ رہی ہے کہ جنوبی افریقہ میں امتیازِ رنگ کے تصور نے انسانی خون کی ندیاں بہادی ہیں (اور ابھی سلسلہ جاری ہے)۔ کینیا کی آبادیوں میں استعمار دل گداز جرائم کا ارتکاب کر رہا ہے، امریکہ میں حبشی اور ریڈ انڈین لونی تفریق کی بنا پر سیاسی و اقتصادی تشدّد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوگی کہ یہ کارنامہ مشرق کے لوگوں کا نہیں کہ ان پر رجعت پسندی، وحشت اور پسماندگی کا اتہام لگایا جا سکے، جیسا کہ بالعموم اہلِ مغرب مشرقی دنیا پہ اس طرح کے اتہامات

Marfat.com

کی بو چھاڑ کرتے رہتے ہیں، بلکہ یہ ان ترقی یافتہ اور مہذب و متمدن ممالک کا کارنامہ ہے جو حقوقِ انسانی کا اعلان کرنے والی انجمن کے سب سے اہم اور با اثر رکن ہیں۔ مثلاً امریکہ ہے، جسے اقوامِ متحدہ میں غیر معمولی اثر و نفوذ حاصل ہے۔ انگلستان ہے، جسے یورپ کی سب سے بڑی سلطنت ہونے کا فخر حاصل ہے، اور اپنی ڈیموکریسی پر بڑا ناز ہے۔ جنوبی افریقہ بھی اپنے یورپین فرمانرواؤں کی بدولت اقوامِ متحدہ کا نمایندہ ہے اور وہی فرمانروا ہی اس کے اوپر تسلط جمائے ہوئے ہیں اور اس کی نمایندگی کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ جنوبی امریکہ کی ریاستوں کو بھی اقوامِ متحدہ کے حلقوں میں مؤثر حیثیت حاصل ہے۔ یہی وہ حکومتیں ہیں جو بڑی ہی بے حیائی کے ساتھ بیسویں صدی میں انسانی دنیا پر ایسے شرمناک مظالم توڑ رہی ہیں کہ انسانی تاریخ کے انسان پر انسان کے تشدد و جور کے ایسے شرمناک مظالم اپنے کسی دور میں بھی مشاہدہ نہیں کیے۔

افریقہ میں سفید فام نسل کی ستمرانیاں

باوجودیکہ اقوامِ متحدہ کا افریشیائی گروپ اقوامِ متحدہ کے گذشتہ اجلاسوں میں رنگ کی بنا پر سفید فام و سیاہ فام کے حقوق و مراعات میں تفریق کے خلاف سخت احتجاج کر چکا ہے، لیکن جنوبی افریقہ کے حکام ہنوز ان احتجاجات کو پرِ کاہ کی حیثیت نہیں دے رہے۔ اور متواتر اپنی وحشیانہ سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح انگلستان کینیا میں ماؤ ماؤ کی آزادی پسند تحریک کو کچلنے کے لیے مسلسل کشت و خون

Marfat.com

پر ڈٹا ہوا ہے۔ بلکہ ابھی تک اپنے اس اراضی ایکٹ سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں، جو ۱۹۱۵ء سے کینیا میں نافذ ہے، اور جس کی رُو سے ۲۹ ہزار یورپین آبادکاروں کو اراضی پر وہ حقوق حاصل ہیں جو افریقہ کی اصل آبادی کی ۴۰ لاکھ ۵۵ ہزار کی تعداد کو حاصل نہیں ہیں۔ اس طرح وہ اپنی ہی زمینوں پر لاوارث اور اپنے ہی وطن میں پردیسی بن کر ماری ماری پھر رہی ہے۔ سر ایلیوٹ، جو کینیا میں پہلا انگریز ہائی کمشنر تھا اور ۱۹۱۰ء میں اس کا تقرر ہوا تھا، کینیا میں اپنی حکومت کی پالیسی واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے: "کینیا کالونی کا تمام اندرونی حصہ سفید انسان کی سرزمین ہے۔ اس امر کا اعتراف نہ کرنا منافقت ہو گا کہ سفید فام باشندوں کی مصلحتوں کو ہر حال میں ترجیح اور غلبہ حاصل ہونا چاہیے۔ ہم آئندہ جو پالیسی اختیار کریں یا جو قانون سازی کریں اس کا بنیادی مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس ملک کو سفید فام کالونی میں تبدیل کر دیں"۔ یہ پالیسی آج تک کینیا کے انگریز حکام کے مدِ نظر چلی آ رہی ہے۔ اور وہ اس امر کی انتہائی کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں کہ سرزمینِ کینیا کا چپہ چپہ گوروں کے تصرف میں ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ اس کی پیداوار کو جس طرح چاہیں استعمال کر سکیں۔

اراضی ایکٹ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ گورنر کو اس امر کی مکمل اجازت دیتا ہے کہ وہ جسے چاہے زمین کا مالک ٹھہرا دے۔ اور جس قطعۂ زمین کا رقبہ ۵ ہزار ایکڑ سے زاید نہ ہو گورنر بہادر کسی بھی شخص کو معمولی

Marfat.com

کرائے پر ۹۹۹ سال تک کے لیے دے سکتا ہے۔ اسی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفاذِ قانون کے بعد دس سال کے اندر اندر، یعنی سنہ ۱۹۵۲ء تک، یہ حالت ہوگئی کہ ایک سفید فام کے پاس اراضی کی اوسط مقدار ۵۰۰ ایکڑ تھی، جبکہ وہاں کے رہنے والے افریقی کے پاس اراضی کی اوسط مقدار صرف ۸ ایکڑ تھی۔ اسی طرح سیاہ فام اہلِ وطن کو سفید فام آبادکاروں سے جُدا رکھنے کے سلسلے میں جو پالیسی اختیار کی گئی، اُس کی صورت یہ تھی کہ سیاہ فام انسانوں کو مخصوص آبادیوں میں محصور کر دیا گیا، جہاں سے انہیں متجاوز ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جب گورے آبادکاروں کو، کاشتکاری کے لیے، کالے مزدوروں کی ضرورت پیش آتی (کیونکہ کالے مزدور انہیں انتہائی کم اُجرتوں پر مہیّا ہو جاتے تھے)، تو ان مزدوروں پر لازم ہوتا تھا، کہ وہ جونہی کام سے فارغ ہوں، بلاتاخیر کھیتوں سے نکل کر اپنی جھونپڑیوں میں چلے جائیں۔ یہ جھونپڑیاں گوروں کی آبادی سے دُور نشیبی جگہوں میں بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب: "احرارِ کینیا، ماؤ ماؤ کی بغاوت"۔ مطبوعہ مصر)۔

امریکہ میں نیگرو باشندوں کی حالتِ زار

امریکہ کے حالات اس سے بھی زیادہ بدتر اور المناک ہیں۔ ایک طرف امریکہ کے دارالحکومت، نیویارک میں "مجسمہ آزادی" کے نیچے یہ عبارت کندہ ہے: "تم اپنے خستہ اور بدحال عوام کو میرے سپرد کر دو، جو آزادی کا سانس لینے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ اپنی اس پُررونق

Marfat.com

بندرگاہ میں میرے پاس ان لوگوں کو بھیج دو، جن کی کوئی جائے پناہ نہیں، اور جن کا کوئی وطن نہیں۔" لیکن عملی طور پر اس علمبردارِ حریت ملک میں سیاہ فام افراد کے ساتھ، جو بدترین سلوک کیا جا رہا ہے، اُسے ہم خود بیان کرنے کے بجائے، ان کے ایک سرکردہ فرد کی زبان سے نقل کرتے ہیں۔ امریکی سینٹ کا ممبر جیمس لکھتا ہے:

"کسی سیاہ فام کیلئے، جو اپنے دل میں سیاسی مساوات کی آرزو رکھتا ہے، امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں کاروبار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ ملک صرف سفید فام کی ملکیت ہے۔ اور اسے اس کی ملکیت میں رہنا چاہیے۔"

تقریباً ہر میدان میں نیگرو، امریکن سفید فاموں کے پنجۂ تشدد میں گرفتار ہیں۔ مثلاً تعلیمی و ثقافتی میدان میں نیگرو نسل کا حال یہ ہے، کہ امریکہ کی ۲۰ ریاستیں ایسی ہیں، جن میں کسی کالے رنگ والے کو سفید رنگ والوں کے ساتھ، ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں۔ ریاست مے سیسپی (Missi:pi) کے دستور کی دفعہ ۲۰۷ میں درج ہے: "تعلیم و ثقافت کے میدان میں اس امر کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ سفید رنگ والوں کے بچے نیگرو بچوں سے جُدا رکھے جائیں، اور دونوں طبقوں کے لیے جداگانہ تعلیم گاہیں ہوں۔" فلوریڈا اسٹیٹ کے قانون میں متعدد ایسی دفعات ملتی ہیں، جن کا منشاء یہ ہے کہ سیاہ فام طلباء کی کتبِ نصاب سفید فام طلباء کی کتابوں سے الگ ہوں گی۔

شادی بیاہ کے معاملے میں بھی تقریباً تمام ولایاتِ متحدہ میں یہ پابندی

Marfat.com

ہے، کہ کوئی سفید فام عورت کسی سیاہ فام مرد سے یا سفید فام مرد سیاہ فام عورت سے ازدواجی تعلق قائم نہیں کر سکتا۔ بعض ریاستوں میں ـــــ مثلاً ریاست میسیسپی میں ـــ ازروئے دستور اس طرح کی شادیاں سرے سے ناجائز ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر اُس کالے مرد یا عورت کے ساتھ سفید مرد یا عورت کا تعلق ازدواجی باطل ہے جس کی رگوں میں جاری ہونیوالے خون کا آٹھواں حصہ بھی زنگی خون کا ہو۔

کاروبار اور ملازمتوں کے اندر بھی یہی افسوسناک روش پائی جاتی ہے متعدد ریاستوں کا قانون کارخانوں اور فیکٹریوں میں نیگرو ملازموں اور مزدوروں کو، گورے ملازموں اور مزدوروں کے دوش بدوش، کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ یہاں تک پابندیاں ہیں کہ جن دروازوں سے گوروں کی آمدورفت ہو، اُن سے نیگرو آمدورفت کے مجاز نہیں ہیں۔

معاشرتی اور اجتماعی میدان میں اگر دیکھا جائے تو وہاں یہ بہیمیت مزید دو آتشہ ہو جاتی ہے مثلاً امریکی ریاستوں میں، ازروئے قانون، ٹرینوں میں کالے مسافروں کو سفید مسافروں سے جدا رکھا جاتا ہے، بلکہ کالے مسافروں کے لیے مخصوص کمپارٹمنٹ ہیں۔ وہ صرف انہی میں سفر کر سکتے ہیں اسی طرح ٹراموں میں، ٹیلیفون کے کمروں میں، ہسپتالوں میں، کالوں کے لیے الگ نشستیں ہیں حتیٰ کہ دماغی امراض کے شفاخانوں میں سفید فام پاگلوں اور سیاہ فام پاگلوں کے درمیان امتیاز برتا جاتا ہے۔ سب سے مضحکہ خیز یہ واقعہ ہے کہ واشنگٹن میں کتوں کے ایک قبرستان کے متولی نے ۱۹۴۷ء میں یہ نوٹس جاری کیا، کہ اس قبرستان میں ایسے کتوں کو دفن کرنے کی درخواست قبول نہیں کی جائیگی، جن کے مالک نیگرو ہوں گے۔ اس نوٹس کی وجہ اس نے یہ بیان کی کہ اگرچہ اُسے یہ معلوم ہے کہ کتے ایک ہی قبرستان میں، ایکدوسرے کے پہلو بہ پہلو

Marfat.com

دفن ہونے میں کوئی عار نہیں سمجھتے، لیکن کتوں کے سفید مالک، اس بات سے سخت برافروختہ ہیں، کہ ان کے ناز پروردہ کتوں کے ساتھ، مرنے کے بعد یہ بدسلوکی کی جائے۔ یعنی سیاہ فام باشندوں کے کتوں کے مساوی درجہ دیا جائے"۔

شمالی امریکہ کے شہروں میں سیاہ فام کا مقام

امریکی اربابِ سیاست اس شرمناک انسانی تذلیل پر اکثر یہ کہہ کر پردہ پوشی کرتے رہتے ہیں کہ مہذب امریکی ریاستوں — یعنی شمالی ریاستوں — میں یہ صورتِ حال نہیں، بلکہ منافرت کا مذہ زیادہ زور جنوبی علاقوں میں ہے۔ لیکن واقعات ان عذرات کی صاف تردید کرتے ہیں۔ شمالی امریکہ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں سیاہ فام آبادیاں غلیظ اور متعفن محلوں اور بستیوں میں محصور ہیں، جہاں ان کے لکڑی کے مکانات بوسیدگی کی وجہ سے ہر وقت بیوندِ زمین ہونے کے لیے منتظر رہتے ہیں۔ چوہوں اور کیڑے مکوڑوں کی فوجیں اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ آگ کے شعلے ہر روز کسی نہ کسی مکان کو اپنی لپیٹ میں لیتے رہتے ہیں۔ نیویارک کی ہارلم اسٹریٹ، جو نیگرو اسٹریٹ کہلاتی ہے، کا ایک ایک کمرہ ۱۷، اور ۱۸، افراد پر مشتمل ہے۔ ایک بار ایک امریکی جریدے نے اسی اسٹریٹ کے بارے میں لکھا تھا کہ "اگر ہم ہارلم اسٹریٹ کی گنجان آبادی کے انداز کو ایک اصول فرض کر لیں، اور اسے ولایاتِ متحدہ کے تمام باشندگان پر منطبق کریں، تو ہم بآسانی پورے امریکہ کی آبادی کو نیویارک کے نصف رقبے میں کھپا سکتے ہیں"۔ واشنگٹن میں وہائٹ ہاؤس کے سامنے، اور ابراہام لنکولن کے اسٹیچو کے زیرِ سایہ، ایک ایسا محلہ موجود ہے جس میں ۲½ لاکھ سیاہ فام نفوس

Marfat.com

آباد ہیں۔ یعنی تقریباً واشنگٹن کی کل آبادی کا چوتھا حصّہ۔ لیکن ان کی زیست میں اور اصطبل کے گھوڑوں کی زیست میں کوئی فرق نہیں ہے۔

معاشرتی اچھوت

واشنگٹن ہی میں اس امرِ واقعہ کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے، کہ کوئی نیگرو سفید فام امریکنوں کے مخصوص ریستورانوں اور ہوٹلوں میں، تھیٹروں میں، اسکولوں اور کالجوں میں، اور شفاخانوں، حتیٰ کہ کلیساؤں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایک بار پانامہ ری پبلک کا ایک نیگرو واشنگٹن کے کیتھولک گرجا میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنی دعا و عبادت میں منہمک تھا کہ ایک پادری تیزی کے ساتھ آیا اور اُس کے ہاتھ میں ایک چٹ دیدی، جس میں ایک ایسے کیتھولک گرجا کا پتہ درج تھا، جو نیگرو نسل کے لیے مخصوص تھا۔ پادری صاحب سے جب اس اخراج کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ جب شہر میں سیاہ فام کیتھولک کے لیے الگ کلیسا موجود ہیں، تو یہ سیاہ فام وہاں جا کر اپنے رب کی عبادت کر سکتا ہے۔ یہ ان پادریوں کی ذہنیت کا حال ہے جو دنیا بھر کے سامنے یہ ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے کہ "حضرت عیسیٰ مسیح تمام انسانیت کے نجات دہندہ ہیں"۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب: "دورِ جدید میں جمہوریت کا جنازہ" مطبوعہ مصر۔

امریکی سیاستدانوں کا اعتراف

سیاہ فام آبادیوں کا ماحول بیماری، جہالت اور پسماندگی کے کیا رنگ ڈھنگ رکھتا ہے، اس کا اندازہ امریکن ادارۂ تعلیم و ثقافت" کی ایک شائع شدہ رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ رپورٹ پروفیسر براؤن نے ولایاتِ متحدہ کے اکثر

Marfat.com

حصّوں کا دورہ کر کے نیگرو آبادیوں کا معاشرتی جائزہ لینے کے بعد پیش کی ہے۔
پروفیسر موسوف کا بیان ہے :

"سڑکوں کی پختگی، راستوں کی روشنی، گندے پانی کی پائپ لائینوں کی حدود، پولیس کے فرائض کا نقطۂ انتہا، وہ جگہ ہوتی ہے، جہاں سے شہر کی سیاہ فام آبادی کا آغاز ہوتا ہے۔ اکثر علاقوں میں کوئی ایسا ہسپتال موجود نہیں، جس کا دروازہ کالے شخص کے لیے وا ہو سکتا ہو۔ رہی طبی اور نرسنگ سروسز، تو وہ یا تو سرے سے مفقود ہیں یا اگر ہیں تو بالکل ناکافی۔ رپورٹ میں سیاہ فام آبادیوں میں پبلک ہیلتھ کا تناسب کلی اعداد و شمار کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں شکاگو اور نیویارک میں سیاہ فام شہریوں میں مرضِ سل کا تناسب سفید فام شہریوں سے ۵ گنا زیادہ تھا۔ نیویارک اور نیوجرسی میں یہ تناسب ۷ گنا زیادہ تھا۔ وضعِ حمل میں مرنیوالی سیاہ فام عورتوں کی شرحِ اموات سفید فام عورتوں کی شرحِ اموات سے ذوگنا تھی۔ جبکہ نیگرو بچوں کی شرحِ اموات امریکی بچوں کی شرحِ اموات سے ۷۰ فیصد زیادہ تھی۔ اسی طرح رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امریکن نیگرو کی اوسط عمر امریکن سفید فام کی اوسط عمر سے دس سال کم ہوتی ہے۔"

یہ ہے وہ رسوا کن اور انسانیت سوز ماحول، جس میں امریکہ کے ۱۵ ملین سیاہ فام، جو کل آبادی کا دسواں حصّہ بنتے ہیں، زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کے بعد اب امریکی علمبردارانِ تہذیب کا کیا منہ رہ جاتا ہے کہ وہ بین الاقوامی پلیٹ فارم پر آ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ کہیں کہ "وہ آزاد دنیا کے سرخیل اور امن و سلامتی کے علمبردار ہیں"۔
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ہم امریکی مصنف ہارے ہائیوڈ کی کتاب:

Marfat.com

"آزادی زنوج" کا بھی ایک اقتباس نقل کر دیں، تاکہ امریکہ کے دعوائے حریت کی حقیقت بھی گھر کے بھیدی کے ہاتھوں واشگاف ہو جائے :

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جنوبی افریقہ کے ماسوا، کسی ملک نے غلامی کو قومی تشدد کا ذریعہ اختیار نہیں کیا۔ جیسا کہ امریکہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ اگرچہ غلامی کی وہ صورت تو ختم ہو چکی ہے، جس میں غلاموں کو دوسری اشیاء کی طرح مملوکہ شے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن طبقاتی اور اچھوت نظام کی حیثیت سے ابھی یہ پورے عروج پر ہے۔ اور جس کا مقصد یہ ہے کہ جو پوزیشن سفید فام کو حاصل ہے، سیاہ فام کو اس سے فروتر رکھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ کبھی دیوانوں اور آشفتہ سر لوگوں کے بہکانے پر سیاہ فام نسل کے خاندان کے خاندان تلوار کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں، اور اس پر ذمہ دار حکام منقار زیر پر رہتے ہیں۔ کبھی ایسے ظالمانہ قوانین صادر کر دیے جاتے ہیں، جن کا مقصد سیاہ فام نسل کا قومی وجود معدوم کر دینا ہوتا ہے، اور کبھی عادات و رسوم کی آڑ میں سیاہ فام نسل کو انتقام کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے۔"

امریکی ماہر اقتصادیات فلکر برلور قمطراز ہے :

"اس امر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ امریکی خانہ جنگی کے دوران میں شمالی حصوں کے جو صنعت کار فیڈرل حکومت پر چھا گئے تھے، وہ سیاہ فام اقوام کو آزادی دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کی اصل کوشش یہ تھی کہ وہ سیاہ فام اقوام کو اپنی اغراض کی خاطر استعمال کرنے کے لیے ان کے جنوبی آقاؤں کی جگہ خود آقائی کی مسند پر متصرف ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ری پبلکن پارٹی اور جنوبی

Marfat.com

ریاستوں کی افواج جس پالیسی پر گامزن تھی، وہ دراصل ایک پیکیٹ کے تحت تھی، جو سابق اتحادیوں کے ساتھ طے کیا گیا تھا، اور جس کا منشاء سیاہ فام نسل کے گلے میں ایک نئے طوقِ غلامی کو ڈالنا تھا"۔ موصوف آگے چل کر لکھتا ہے کہ "ملک کے طول و عرض میں خونی اور نسلی عصبیت کا زہر پھیل چکا ہے۔ اور امریکی زندگی کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اب امریکی قوم سیاہ فام باشندوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ گفتگو کرنے یا ان کی طرف اشارے کنائے کرنے کے لیے ایسے نازیبا الفاظ وضع کرنے کی عادی ہو گئی ہے جو نہ صرف استخفاف و تحقیر سے لبریز ہوتے ہیں بلکہ شرافت سے بھی عاری ہوتے ہیں"۔

سیاہ فام ہونے کی سزا

۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے کہ کولمبیا میں ایک نیگرو نوجوان اپنی ماں کے ساتھ ایک ریڈیو مکینک کے پاس گیا۔ ان کے پاس ایک مرمت طلب ریڈیو سیٹ تھا، جسے وہ مذکورہ ریڈیو مکینک سے منہ مانگی اجرت کے عوض پہلے بھی مرمت کروا چکے تھے۔ لیکن وہ بدستور خراب تھا۔ نیگرو عورت نے ریڈیو مکینک سے کہا: "۱۳ ڈالر ادا کرنے کے بعد بھی ریڈیو کا گونگا پن دور نہیں ہوا"۔ ریڈیو مکینک نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ان کو نکل جانے کا حکم دے دیا۔ دکان کے ملازم نے اٹھ کر نیگرو عورت کی لاتوں سے ایسی تواضع کی کہ بچاری منہ کے بل گر پڑی۔ نیگرو نوجوان کو ماں کی اس توہین پر سخت غصہ آیا۔ اس نے ملازم کے ایک گھونسا رسید کیا۔ اور وہ لڑھکتا ہوا دکان

Marfat.com

کے باہر جا پڑا۔ اتنے میں ہمسایہ دوکاندار نے یہ دیکھ کر شور مچا دیا کہ "پکڑ لو، اس بدکار کے بچے کو"۔ چنانچہ آناً فاناً لوگ جمع ہو گئے اور چلّا چلّا کر کہنے لگے کہ "ہم ان دونوں سے انتقام لے کر چھوڑیں گے"۔ امریکنوں کے نزدیک انتقام لینے کی نوعیت یہ ہے کہ کسی عدالتی کارروائی کے بغیر سیاہ فام کا سر دھڑ سے جدا کر دیا جائے۔ بالآخر بعض لوگوں کے بیچ بچاؤ سے اس وقت نیگرو ماں بیٹے کو وہاں سے نکال کر جیل میں بھیج دیا گیا۔ لیکن عوام کا جوشِ انتقام اس سے سرد نہ ہوا۔ بلکہ وہ نیگرو باشندوں کے محلّے پر پل پڑے، اور پولیس کی حفاظت کے باوجود فائرنگ اور آتش زدگی کے متعدد حادثات رونما ہو گئے، جن میں متعدد سیاہ فام موت کے منہ میں اُتر گئے اور ایک خاصی تعداد زخمی ہو گئی"۔

سیاہ فام لونڈی اور عمر بن عبدالعزیزؒ

اب آخر میں اسلامی تہذیب کی بھی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

پہلی صدی ہجری ـــــ یعنی ۱۳ سو سال قبل ـــــ کا واقعہ ہے۔ مصر کی ایک فرتونہ نامی حبشی لونڈی کی طرف سے امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس فریاد آئی کہ اس کے گھر کی بیرونی دیواریں پست ہیں، جس کی وجہ سے اُس کی مرغیاں چوری ہوتی رہتی ہیں۔ امیر المؤمنین نے اُسے پیغام بھیجا کہ میں نے مصر کے گورنر کو حکم دے دیا ہے کہ تمہاری دیوار کو درست کر دے، اور تمہارے مکان کو مزید محفوظ کر دے۔ ادھر مصر کے گورنر ایوب بن شرحبیل کے نام یہ فرمان لکھا: "ذی اصبح کی لونڈی، فرتونہ نے مجھے لکھا ہے کہ اس کی چار دیواری چھوٹی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی مرغیاں چوری ہو جاتی

Marfat.com

ہیں۔ فرتونہ نے دیوار کو مضبوط اور اونچا کرنے کی درخواست کی ہے۔ میرے اس فرمان کو وصول کرتے ہی تم بذاتِ خود فرتونہ کے مکان پر جاؤ، اور یہ کام سرانجام دو۔" ایوب بن شرجیل کو جب امیر المؤمنین کا مکتوب ملا، وہ فوراً مقام جیزہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور فرتونہ لونڈی کا مکان تلاش کرنے لگا۔ چنانچہ بڑی کوشش کے بعد جب اُسے مکان ملا تو دیکھا کہ ایک سیاہ رُو اور بدحال عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس نے فرتونہ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی موجودگی میں اس کی دیوار کو بنوایا۔ یہ ہیں اسلامی تہذیب کے خدّوخال ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

(ترجمان القرآن اکتوبر ۵۸ء)

دار المطالعہ
تنظیم المسلمین
فتح گڑھ

Marfat.com

Marfat.com

اِسلام ایک نظر میں

مولانا صدرالدین اصلاحی

- اِسلام کو سمجھنے کے لیے ایک جامع کتاب
- اِسلام کے جملہ پہلوؤں کا جامع بیان
- علمی اور فلسفیانہ بحثوں سے بچ کر سادہ اور آسان انداز میں اسلام کے ضروری مسائل کی عملی نقطہ نظر سے تشریح ——
- علم و عمل پر ابھارنے اور یقین پیدا کرنے کے لیے ایک بیش قیمت پیشکش ——
- دل نشیں اندازِ بیان۔ پُرزور استدلال۔

نفیس کتابت خوبصورت جلد ضخامت ۳۲۰ صفحات
قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۵۰۰ سستا ایڈیشن ۲۰۰

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۱۱، ہی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

Marfat.com